TO THE READER

KINDLY use this book very carefully. If the book is disfigured or marked or written on while in your possession the book will have to be replaced by a new copy or paid for. In case the book be a volume of set of which single volumes are not available the price of the whole set will be realized

C. L. 29.



LIBRARY

Class No. 891.488

Book No. R 27 In

Acc. No. 12916

8 JAN 2006

Sovereignty

~~Soveignty~~

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. ________ Book No. ________

Acc. No. ________

This book may be kept for 14 days. An over - due charge will be levied at the rate of 10 Paise for each day the book is kept over - time.

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. ________ Book No. ________

Acc. No. ________

This book may be kept for **14 days.** An over - due charge will be levied at the rate of **10** Paise for each day the book is kept over - time.

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. _______________ Book No. _______________

Acc. No. _______________

This book may be kept for 14 days. An over - d
charge will be levied at the rate of 10 Paise for each
the book is kept over - time.

Library Sri Pratap College,
Srinagar.

انسان کا عروج

(انسان کے ارتقاء کی کہانی)

از

ایم۔ ایلین و ای۔ سگال

مترجمہ

رضیہ سجاد ظہیر

قومی دار الاشاعت لاہور بمبئی

قیمت ڈھائی روپیہ 2/12/-

891.488
R.279n
Acc: No: 12416

فہرست

پہلا حصّہ

دوسرا حصّہ

دکوآپریٹو کیپٹل پرنٹنگ لاہور میں باہتمام محمد عظیم اللہ پرنٹر پبلشر نے سندھرسٹ سٹریٹ بمبئی سے
شائع کی

1.488

آغاز

آپ نے اُس دیو کو کبھی دیکھا ہے ؟
وہی جس کے ہاتھ بغیر کچھ زور لگائے ریل کا انجن اٹھا لیتے ہیں۔
جو ایک ایک دن میں کئی کئی ہزار میل چل لیتا ہے۔
جس کے پر اتنے بڑے اور طاقتور ہیں کہ وہ اڑ کر بادلوں سے بھی زیادہ اونچا پہنچ جاتا ہے جہاں چڑیوں کا بھی گذر نہیں۔
جو پانی پر اور پانی کے نیچے مچھلیوں سے بھی زیادہ آسانی سے تیر سکتا ہے۔
جس کی آنکھیں ایسی ہیں کہ وہ ان دیکھی چیزوں کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ جس کے کان ہزاروں میل کی دوری پر بھی کانا پھوسی ہو تو اسے سُن سکتے ہیں۔
یہ دیو اتنا مضبوط ہے کہ وہ اونچے سے اونچے پہاڑوں پر بھی دندناتا ہوا چڑھتا چلا جاتا ہے اور بڑے بڑے آبشاروں کا پانی بیچ دھارے سے موڑ دیتا ہے۔
وہ ساری دُنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے، جنگل اُگاتا، سمندروں کو ایک کرتا اور بنجر ریگستان کو سرسبز بنا دیتا ہے۔
آپ سمجھے یہ دیو کون ہے ؟
یہ ہے **انسان !**
انسان جو کچھ عرصہ پہلے بالکل مجبور اور بے بس تھا اتنا طاقتور کیسے ہو گیا ؟
یہی کہانی ہم اس کتاب میں بیان کریں گے
انسان کے عروج کی کہانی ۔

Library Sri Pratap College,
Srinagar.

پہلا حصّہ

پہلا باب

ایک غیر مرئی قفس میں

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب انسان دیوانہ تھا بلکہ بونا تھا۔ وہ اپنے اطراف کی دُنیا پر حاوی اور اپنے اطراف کی دنیا کا حاکم نہ تھا۔ بلکہ اس کا فرمانبردار اور محکوم تھا۔ قدرت کے سامنے وہ ایسا ہی مجبور اور مقید تھا۔ جیسے کوئی جنگلی جانور یا پرندہ۔ آپ کہیں گے۔ "ہائیں یہ کیا کہا؟ کیا جانور اور پرندے آزاد نہیں ہیں؟ جنگلوں میں رہنے والی ایک درخت سے دوسرے درخت پر پھدکنے والی گلہری بھی آزاد نہیں ہے تو پھر بھلا کون آزاد ہے؟ وہ تو کسی پنجرے میں بند نہیں ہے۔ ذرا کٹھ پھوڑے کو تو دیکھئے جس درخت میں چاہے چونچ مارنے لگتا ہے۔ تو پھر اس درخت سے بندھا تھوڑا ہی جاتا ہے؟" ویسے اگر دیکھا جائے تو یہ بات سچ مچ بڑی مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ بالکل صحیح ہے کہ کسی نے گلہری کو پنجرے میں یا کٹھ پھوڑے کو درخت سے بندھا کبھی نہیں دیکھا۔ ٹھیک ہے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ کبھی کوئی دیکھے گا کیونکہ ان کا قفس اور زنجیر ایسے ہیں جو دکھائی نہیں دیتے۔

ایک زمانہ ایسا بھی تھا۔ جب انسان بھی ایسے ہی قفس میں بند اور اسی قسم کی

زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا جو دکھائی نہیں دیتیں۔

اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ انسان ان زنجیروں کو توڑنے میں کس طرح کامیاب ہوا تو ہمیں پہلے جنگلوں میں جاکر یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے وہ رشتہ دار جواب تک اس قید میں ہیں کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

لہٰذا اگرچہ یہ کتاب انسان کے متعلق ہے تاہم ہم اس کو جنگل کی سیر اور جنگلی جانوروں اور پرندوں کے متعلق بات چیت سے شروع کریں گے۔

پرندے کی طرح آزاد

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ مثل کہتے سنی ہوگی "وہ ایسا آزاد جیسے پرندہ" لیکن کیا آپ کے خیال میں کٹھ پھوڑا آزاد ہے؟ اگر وہ سچ مچ آزاد پرندہ ہوتا تو جہاں اس کا جی چاہتا رہتا اور جہاں جی چاہتا اڑ کر چلا جاتا لیکن ایسا بالکل نہیں۔ ذرا آزمائش کے لئے کٹھ پھوڑے کو کسی ایسے سبزہ زار میں لے جائیے جہاں درخت نہ ہوں۔ وہ زندہ نہ رہ سکے گا کیونکہ وہ صرف ایسی جگہ جی سکتا ہے جہاں درخت ہوں۔ پھر تو گویا یہی بات ہوئی کہ جیسے وہ کسی زنجیر کے ذریعہ درخت سے بندھا ہوا اور اس زنجیر کو توڑ نہ سکتا ہو۔ اب کسی اور پرندے کو لیجئے۔ مثلاً سرد کے درختوں پر رہنے والا کوئی پرندہ جیسے قمری کٹھ پھوڑے کی طرح یہ بھی درختوں کے جنگل میں رہتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ جس درخت پر چاہے رہ لے۔ اس کے لئے تو سرو ہی کا جنگل ہونا چاہئے اور اس کا وہ چچازاد بھائی دیودار پر بسیرا کرنے والا پرندہ صرف دیودار ہی کے جنگلوں میں رہ سکتا ہے اور کہیں نہیں۔

جنگل کی سیر

جب آپ جنگل کی سیر کو نکلتے ہیں تو آپ بہت سی ایسی دیواروں کو پار کر جاتے

Library Sri Pratap College,
Srinagar.

ہیں جو آپ کو دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ جب آپ درختوں پر چڑھتے ہیں تو آپ کا سر ایسی بہتیری چھتوں میں سے نکلتا چلا جاتا ہے جو نظر نہیں آتیں۔ چڑیا گھر کی طرح جنگل بھی مختلف حصوں میں منقسم ہوتا ہے اگرچہ وہ آپ کو دکھائی نہ دیں۔ جب آپ جنگل میں سے گذر رہے ہوں تو آپ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ جنگل برابر بدلتا چلا جاتا ہے۔ کبھی آپ سرو کے درختوں میں سے ہو کر نکلتے ہیں کبھی دیودار کے۔ اور پھر دیودار بھی کہیں اونچے ہیں اور کہیں نیچے۔ کہیں آپ کے قدموں تلے باریک سفید گھاس ہوگی تو کہیں لمبی لمبی، کہیں پھر باریک ہوگی مگر اب کی مرتبہ اس کا رنگ سفید نہیں بلکہ زرد ہوگا

جو لوگ گرمیوں کی چھٹیوں میں سیر سپاٹے کے لئے آتے ہیں۔ ان کو تو یہ سب صرف جنگل ہی نظر آتا ہے۔ مگر کسی ماہر جنگلات سے پوچھیئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ واقعی ایک ایک میں چار چار جنگل ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ جہاں مرطوب گھاٹیاں ہوتی ہیں وہاں سفید سرو پائے جاتے ہیں۔ جن کے پیڑ گھنے ہوتے ہیں جیسے پروں کے گدے اور آگے جاکر ریتیلی گھاٹیوں میں سبز کائی کے سے سرو کے جھنڈ ہوتے ہیں اور وہاں مختلف قسم کے پیڑوں کی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ اور آگے جاکر پھر ریتیلے میدانوں میں سفید سرو ملتے ہیں۔ اور کہیں کہیں مرطوب مقامات پر پھر ہری ہری وادیاں ہیں۔ اب آپ بغیر محسوس کئے ان تین دیواروں میں سے گذرے کہ نہیں؟ یہ تینوں دیواریں چار چھوٹی چھوٹی دنیاؤں کو الگ کرتی ہیں۔ آپ چار مختلف پنجروں میں سے گذر گئے اور ہر پنجرہ میں قیدی بھی الگ الگ بند ہیں

اگرچہ چڑیا خانے کی طرح جنگل کے درختوں پر بھی نشانات ہوتے اور ان پر بسیرا لینے والوں کا نام لکھا ہوتا تو سرو کے جنگل میں آپ کو کچھ اس قسم کے نام لکھے دکھائی دیتے: کٹھ پھوڑا، ہدہد، گلہری، ولایتی نیولا، جنگلی چوہا۔

دیودار کے جنگل میں جو نام لکھے ہوتے وہ ان سے بالکل ہی مختلف اور

کچھ اس قسم کے ہوتے۔

ابابیل، دھاری دار ہدہد، امریکی کوٹل، ترغہ

اسی طرح بید کے جنگلوں کے قیدی بھی الگ ہوتے ہیں۔ آپ اُن کو کبھی سرو یا دیودار کے جھنڈوں میں نہ پائیں گے۔ مثلاً بید کا تیتر جس کے نام ہی سے اُس کا اتا پتہ معلوم ہو جاتا ہے، اور جس کے نام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف بید کے جھنڈوں کے پتے دار جنگلوں میں رہ سکتا ہے۔

اس طرح ہر ایک جنگل بجائے خود ایک قفس ہے۔ یہ بڑے بڑے جنگل بھی چھوٹے چھوٹے غاروں اور کھوڑوں میں منقسم ہیں۔ مثلاً کسی بڑی کئی منزلہ عمارت، طرح ہر جنگل میں بھی کئی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ دو منزلہ جنگل بھی ہوتے ہیں اور سہ منزلہ بھی۔ یہاں تک کہ بعض جنگلوں میں تو چھ چھ سات سات منزلیں تک بھی پائی جاتی ہیں

دیودار کے جنگل عموماً دو منزلہ یا کبھی کبھی تین منزلہ بھی ہوتے ہیں۔ پہلی منزل پر کائی اور گھاس رہتی ہے پھر دوسری منزل پر جھاڑیاں وغیرہ ہوتی ہیں اور خود دیودار کا نمبر تیسرا آتا ہے۔ شاہ بلوط کا جنگل سات منزل اونچا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے اونچی منزل اس کی چوٹی ہے۔

اس منزل پر بل کھاتی ہوئی پھیلی ہوئی چوٹیاں جنگل کے لئے سائے کا کام دیتی ہیں جو گرمیوں میں ہری رہتی ہیں اور جب جھڑتی ہیں تو بوقلموں رنگ بدلتی ہیں اِن سے نیچے اُتر کر پہاڑی جڑی بوٹیوں اور جنگلی سیب اور آڑو کے درخت ہوتے ہیں یہ چھٹی منزل ہے اِن سے نیچے پھر جھاڑیوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیاں۔

لیکن یہ بھی کئی منزلوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سب سے اونچی جگہ، یعنی جنگل میں چوتھی منزل پر مانس مکھی کا درخت ہے اس کے بعد دوسری منزل پر بفشہ اور

اسٹابری ہیں، اور آخر میں سب سے نچلی منزل پر کائی کے پتے ہیں۔ ان سے بھی نیچے، زمین کے اندر ایک اور تہہ خانہ ہے یہاں درختوں اور جھاڑیوں کی جڑیں ہیں۔ ان تمام منزلوں کے رہنے والے جانور اور پرندے بھی الگ الگ ہیں۔ سب سے اُونچی ٹہنیوں پر عُقاب کا بسیرا ہے۔ اُس سے نیچے شاہ بلوط کے کھوکھول میں کھٹ پھوڑے کا مسکن ہے، پانچویں منزل کے رہنے والے سب سے زیادہ شور و غل مچانے والے لوگ ہیں یعنی چھوٹی چھوٹی چڑیاں جو جنگل کو اپنی سیٹیوں اور گانوں سے سر پر اٹھائے رہتی ہیں پہلی منزل کا باسی جنگلی مرغ، زمین پر گھومتا پھرتا ہے۔ نیچے کے تہ خانے میں جنگلی چوہے اپنے لئے زمین دوز سرنگیں کھودتے رہتے ہیں۔ اس پورے لمبے چوڑے گھر میں کمرے بھی مختلف قسم کے ہیں۔ سب سے اوپر والے کمرے گرم، خشک اور روشن ہیں نیچے کی منزل کے کمرے تاریک، نم اور ٹھنڈے ہیں۔ اس گھر میں ایسے کمرے بھی ہیں جو صرف گرمیوں کے موسم میں بہت اچھے رہتے ہیں اور ایسے گرم کمرے بھی ہیں جن میں سال بھر رہا جا سکتا ہے۔

زمین میں کھودا ہوا تہہ خانہ سردیوں کا ڈیرہ ہے۔ سردیوں میں کسی ایسے دن جب اُوپر برف جم رہی ہو، زمین کے نیچے چار پانچ فٹ گہرے تہہ خانے کی حرارت معلوم کرکے دیکھئے! آپ کو معلوم ہوگا کہ اگر اُوپر درجہ حرارت صفر ہے تو اس تہہ خانے کے اندر چھیالیس درجے تک ہوگا اور وہ بھی کسی بیرونی ترکیب سے گرمی پہنچائے بغیر!

شاہ بلوط کے کھوکھول میں زیادہ سردی ہوتی ہے اگر جاڑوں میں کوئی جاندار وہاں رہے تو یقیناً ٹھٹھر کر مر جائے۔ اسی وجہ سے گرمیوں میں یہ کھوکھے بہت اچھے رہتے ہیں، خاصکر اُلوؤں اور چمگادڑوں کے لئے جو دن بھر کسی سایہ دار جگہ میں اُونگھتے

رہتے ہیں اور رات کو سیر سپاٹے کے لئے نکلتے ہیں۔

لوگ اکثر اپنے رہنے کے گھر بدل لیا کرتے ہیں، ایک گھر سے دوسرے گھر میں، اور ایک منزل سے دوسری منزل میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن جنگل میں ایک منزل کے کرائے دار دوسری منزل والوں سے تبادلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جنگل میں ان کی حیثیت کرایہ داروں کی سی نہیں بلکہ قیدیوں کی سی ہے۔ ان کے رہنے کے مقامات ان کے لئے گھر نہیں بلکہ قید کی کوٹھری کے مانند ہیں۔ پہلی منزل پر رہنے والا جنگلی مرغا اپنا تاریک نمناک گھر چھوڑ کر چھت والی خشک اور روشن منزل پر نہیں جا سکتا اور عقاب کے دماغ میں اگر ایک لحظہ کو یہ جنون آمیز خیال آ بھی جائے کہ چلیں ذرا نچلی منزل میں رہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

ان تمام باتوں کی اصلیت کیا ہے؟ وہ کونسی ایسی دیواریں اور چھتیں ہیں جو جنگلوں کو مختلف پنجروں اور کوٹھریوں میں تقسیم تو کئے ہوئے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتیں؟ ان جنگلی جانوروں اور پرندوں کو قیدی کس چیز نے بنایا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ سرد کی چڑیاں سرو کے جنگلوں میں اور دیودار کی دیودار کے جھنڈوں میں رہتی ہیں؟ جنگلی مرغ نچلی منزل میں رہتا ہے اور عقاب اوپر کی منزل میں؟

سرو کے پرندے سے دو دو باتیں

آیئے ذرا ہم سرو کے پرندے کے یہاں چلیں اور دیکھیں کہ وہ کس طرح رہتا اور کیونکر اپنا وقت گذارتا ہے اس کے یہاں جانے کا سب سے اچھا وقت وہ ہے جب اس کے ناشتے یا کھانے کا وقت ہو۔ اگرچہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ ناشتہ کب ختم کرتا ہے اور کھانا کس وقت کھاتا ہے کیونکہ وہ کھاتے رہتے ہیں اتنا وقت صرف کرتا ہے جتنا ہم میں سے کوئی بھی نہ کرتا ہوگا۔

یہ پرندہ کھانے کے لئے کسی قسم کے کانٹے چھری کا استعمال نہیں کرتا۔ اس کے پاس کانٹوں اور چھروں کی جگہ صرف ایک زنبور ہے اور اسی زنبور سے وہ بڑی ہوشیاری اور صفائی سے مغزیات توڑ کر اُن کے اندر سے گریاں نکال لیتا ہے۔ اس پرندے کے پاس یہ زنبور ہر وقت موجود رہتا ہے حتیٰ کہ سوتے وقت بھی وہ اُسے علیحدہ نہیں کرتا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی چونچ ہی اس کے لئے زنبور کا کام دیتی ہے یہ چونچ کچھ اسی طرح بنی ہوئی ہوتی ہے اور ایسی خوبی سے سرو کے پھل کو توڑ کر گریاں نکال سکتی ہے جیسے سروتے سے چھالیا کاٹ جائے یا پیچ کش سے پیچ کھول لیا جائے۔ یہ پرندہ ہزاروں سال کے ارتقا کے بعد اپنی چونچ کو اس قابل بنا سکا ہے کہ وہ سرو کے پھلوں کو توڑ کر ان میں سے مغز نکال سکے اور یہ ارتقا بھی اس خوبصورتی سے ہوتا ہے کہ نہ صرف پرندے کو خوراک کے لئے مغزیات حاصل ہو جاتے ہیں بلکہ سرو کے جنگل کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور وہ اس طرح کہ جب وہ پھلوں سے اپنے کھانے کے لئے مغزیات نکالتا رہتا ہے تو بہت سے پھلوں کو اِدھر اُدھر بکھیرتا بھی جاتا ہے اور اس طرح سرو کے نئے پیڑوں کے لئے بیجوں کا اور پرندے کی آئندہ نسلوں کے لئے خوراک کا انتظام ہوتا جاتا ہے اس پرندے اور سرو کے درمیان تعلق کی سب سے مضبوط کڑی یہی ہے۔

سرو کا یہ پرندہ اپنے سب سے قریبی رشتہ دار یعنی دیودار کے پرندے سے بھی اپنا گھر ادل بدل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سرو کے ہی مغزیات نکالی جا سکتی ہیں اور دیودار کی سخت مغزیات اُس سے نہیں توڑی جا سکتیں۔ دیودار کی مغزیات کو کھٹک کر نکالنا صرف دیودار کے پرندے ہی کے لئے مخصوص ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سرو کا پرندہ سرو کے جنگل میں اور دیودار کا دیودار کے جھنڈ میں رہتا ہے۔ سرو کے جنگل میں رہنا اس پرندے کی خوشی یا مرضی پر نہیں بلکہ اس

کی ضرورت کے سبب سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سرو کے جنگل میں قید ہے۔ وہیں رہنا سہنا اور اپنی زندگی وہیں بسر کر سکتا ہے۔ اُسے کسی قسم کی آزادی نصیب نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ اُسے بھوکوں مرجانے کا خطرہ نہیں ہے۔ گرمی ہو یا سردی سرو کے مغزیات کی کبھی کمی نہیں رہتی۔ یہ پرندہ جاڑوں میں کبھی بھی سرو کے جنگل کو چھوڑ کر نہیں جاتا کیونکہ جاڑوں بھر اس کے کھانے کے لئے کافی مغزیات بہم پہنچتے رہتے ہیں۔

جنگل کے قیدی

اسی طرح اگر ہم جنگل کے دوسرے قیدیوں کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے خاص جنگل کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور اپنی اپنی منزل کے اندر پابہ زنجیر ہے اور یہ زنجیریں ایسی ہیں جن کا توڑنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً جنگلی مرغے کو لیجئے وہ سب سے نچلی منزل پر اس لئے رہتا ہے کہ اُسے زمین کی اندرونی سطح سے غذا حاصل ہوتی ہے۔ اس کی چونچ خاص طور پر لمبی اس لئے بنی ہوتی ہے کہ کرید کرید کر زمین کے کیڑے مکوڑے کھا سکے۔ اب اگر وہ درخت پر رہنا شروع کر دے تو کھائے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی کوئی جنگلی مرغا درخت کی پھنگی پر بیٹھا کبھی نہ دیکھا ہوگا اور اگر کچھ تھوڑا کہیں زمین پر اُتر آئے تو پھر اُس کے لئے کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ کیا کرے کیونکہ تمام دن وہ کسی نہ کسی سرو یا بید کے درخت کے تنے کے چاروں طرف لٹکا گھومتا رہتا ہے آخر یہ وہاں کیا کھٹ کا کرتا ہے؟ کیا ڈھونڈا کرتا ہے؟ ذرا دیکھیں تو! اگر آپ کسی سرو کے درخت پر سے چھال اُتار کر دیکھیں گے تو آپ کو چھال کے نیچے ہی کچھ ٹیڑھی میڑھی سی لکیریں اور راستے سے کھُدے ہوئے چاروں طرف ملیں گے یہ ایک گھُن کے

ے قسم کے کیڑے کی کارستانی ہے جو سرد کے درخت میں رہتا ہے اور ویول (Weevil) کہلاتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے راستوں کے آخر میں ایک چھوٹا سا گہوارہ سا ہوتا ہے۔ اس گہوارے میں ویول کے انڈے بچے رہتے ہیں اور یہیں وہ پھوٹ کر بڑے ہوتے اور مکمل ویول بن جاتے ہیں۔ یہ کیڑا سرو کے درخت کو چاٹ کر زندہ رہتا ہے اور کھٹ پھوڑا اس کیڑے کے انڈے اور کرم کھا کر زندہ رہتا ہے۔ کھٹ پھوڑے کی زبان لمبی اور لچکدار ہوتی ہے اور چاہے یہ کیڑے کتنے ہی اندر کیوں نہ دبے بیٹھے ہوں وہ انہیں اپنی اس لمبی زبان سے چاٹ جاتا ہے۔

اب ہمیں تین کڑیوں کی یہ زنجیر بخوبی نظر آنے لگی سرو کا درخت — ویول — کھٹ پھوڑا۔ سائنس داں اس قسم کے تعلقات کو "غذائی زنجیریں" کہتے ہیں۔ جنگل کے تمام قیدی اسی قسم کی زنجیروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں۔

اب مثلاً جنگلی نیولے (Wood marten) کو لیجئے! وہ جنگل میں کیوں رہتا ہے؟ کیونکہ وہ جنگل کے ایک دوسرے باسی یعنی گلہری کا شکار کرتا ہے! اور گلہری جنگل میں اس لئے رہتی ہے کہ اُسے جس غذا کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُسے جنگل ہی میں ملتی ہے۔ ایک مرتبہ کچھ شکاریوں نے اپنی ماری ہوئی گلہریوں کا پیٹ چیر کر دیکھا کہ انہوں نے اپنے جنگلی دسترخوان پر کیا کچھ کھایا ہوگا چنانچہ اُن کی غذا میں سرو کے پھل اور سانپ کی چھتریاں وغیرہ تھیں۔ اب ہم نے اس زنجیر کی ایک اور کڑی دریافت کر لی جنگلی نیولا، گلہری، سانپ کی چھتری اور سرو کے پھل۔ اب اگر ہم چاہیں تو اسی زنجیر کی اور کڑیاں بھی دریافت کرتے چلے جائیں۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ جنگلی نیولا اور گلہری جنگل میں کیوں رہتے ہیں لیکن سانپ کی چھتری جنگل میں بھلا کیوں پیدا ہوتی ہے؟ ہم سب نے کبھی نہ کبھی سانپ کی چھتریاں ضرور جمع کی ہوں گی لیکن یہ سوال کبھی ذہن میں نہ آیا ہوگا کہ سانپ کی چھتری جنگل میں کیوں پیدا ہوتی ہے؟ سمندر کے کنارے کیوں نہیں پیدا ہوتی؟

ہم ابھی جن جانوروں اور پرندوں کے متعلق ذکر کر چکے ہیں اُن ہی کی طرح سانپ کی چھتری بھی ضرورت کی وجہ سے جنگل میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ سانپ کی چھتری کی زندگی اُس پکّی تیار شدہ غذا پر موقوف ہے جو اُسے پیڑوں اور پودوں سے حاصل ہوتی ہے۔

جنگل کی زمین پر گھاس، جھڑے ہوئے پتّے اور کائی سڑتی رہتی ہے اور اسی سڑے ہوئے مادے پر سانپ کی چھتری کی زندگی کا انحصار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں سانپ کی چھتریاں اُگتی ہیں وہاں ایک خاص قسم کی سڑی ہوئی بدبو ہوتی ہے۔ اب ہمیں اپنی زنجیر کے لئے ایک اور کڑی مل گئی۔ جنگلی نیولا۔ گلہری۔ سانپ کی چھتری۔ سڑی ہوئی گھاس پھوس کے پتّے۔ یہ سچ ہے کہ جنگلی نیولا کبھی سانپ کی چھتری نہیں کھاتا لیکن بہر حال "غذائی زنجیر" کے ذریعہ اس کا سانپ کی چھتری سے تعلق ضرور ہے۔

"غذائی زنجیر" ہی وہ ذریعہ ہے جس سے سورج کی کرنوں کی طاقت پودوں تک پہنچ کر اور ان میں سمو کر پھر ایک شے سے دوسری شے تک پہنچتی ہے۔

لیکن جنگل میں قیدیوں کو قید رکھنے والی چیز صرف یہ غذائی زنجیر ہی نہیں ہے مثلاً کیلیفورنیا کے کٹھ پھوڑے کو دو زنجیریں جنگل میں قید رکھتی ہیں۔ ایک زنجیر کے ذریعہ وہ شاہ بلوط کے درخت سے بندھا ہے جہاں سے اس کو کھانے کے لئے پھل ملتے ہیں اور دوسری زنجیر وہ ہے جو اسے زرد دلپودا سے باندھے رہتی ہے۔ زرد دلپودا اس کے لئے گودام کا کام دیتا ہے اور اس درخت کے کھوکھلوں میں وہ اپنی غذا جاڑوں کے لئے جمع کرتا رہتا ہے کیونکہ جاڑوں کے زمانے میں شاہ بلوط کے درخت پھل نہیں دیتے۔

اندر آنے کی اجازت نہیں

جنگل کی دُنیا بھی ان چھوٹی چھوٹی دُنیاؤں میں سے ایک ہے جنہیں ملا کر ہماری یہ بڑی دُنیا مکمل ہوتی ہے۔ ان میں پہاڑ ہیں، صحرا ہیں، سمندر ہیں، جنگلات ہیں،

دریا اور جھیلیں ہیں، گھاس کے سرسبز میدان ہیں جنگل کی طرح گھاس کے ہر میدان کے بھی مختلف حصے ہیں، اور ایسی ہی دیواریں اُن مختلف حصوں کو بھی الگ کرتی ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اسی طرح ہر سمندر میں پانی کے اندر مختلف منزلیں ہوتی ہیں۔

بحرِ اخضر کے کناروں پر اس قسم کی آٹھ منزلیں ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ نیچے سے اوپر کے بجائے ان منزلوں کو اوپر سے نیچے کی طرف شمار کیا جاتا ہے پہلی منزل جہاں چٹانیں ساحل سمندر سے لگی ہوتی ہیں وہاں کیکڑے، ہنس اور سمندری پھول رہتے ہیں۔ اُس سے نیچے دوسری منزل پر دوسرے قسم کے کیکڑے اور سلطان مچھلی ریت میں رہتی ہے۔ پھر چوتھی منزل پر کستوری مچھلی یعنی Oyster رہتی ہے۔ سب سے نچلی منزل یعنی تہہ میں ایک خاص قسم کی زہریلی گیس ہوتی ہے جسے ہائیڈروجن سلفائیڈ Hydrogen Sulphide کہتے ہیں لیکن یہ منزل بھی رہنے والوں سے خالی نہیں ہے یہاں پر وہ جراثیم رہتے ہیں جو اس زہریلی گیس میں رہنے کے خوگر ہو چکے ہیں اور جو شے دوسروں کے لئے سم قاتل ہے، وہی ان کی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔

دنیا میں دس لاکھ کے قریب جانداروں کی قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی ایک چھوٹی سی دنیا میں رہتا ہے اور اُسی دنیا کے مطابق ڈھل گیا ہے۔ بعض پانی میں رہتے ہیں، بعض خشکی میں بعض سے روشنی برداشت نہیں ہو سکتی اور بعض اندھیرے کو بالکل ناپسند کرتے ہیں بعض اپنے آپ کو جلتی ریت میں چھپائے رکھتے ہیں اور بعض صرف دلدل ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں جس جگہ بعض کو داخلہ کی قطعی ممانعت ہے وہاں بعض بلا تکلف گھُستے چلے جاتے ہیں۔ جہاں مچھلیاں مر جاتی ہیں وہاں چڑیاں خوب پھولتی پھلتی ہیں جس مقام پر بہت سے درختوں کا جھنڈ ہوتا ہے وہاں کائی پیدا ہونے کے لئے خوب موقع اور میدان ہے کیونکہ کائی کو اندھیرا پسند

ہے اور درختوں کے لئے روشنی درکار ہے۔

دُنیا کا کوئی مقام خالی نہیں پڑا ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی صورت میں زندگی کے آثار نہ پائے جاتے ہوں اگر ایک قسم کی زندگی یہ پا نہیں ہو سکتی تو دوسرے قسم کی ہو سکتی ہے۔ چاہے وہ قطبین ہوں چاہے خطِ استوا، چاہے پہاڑوں کی چوٹی ہو یا سمندر کی تہ، ہر جگہ جاندار پائے جاتے ہیں جن کا گھر اُسی جگہ ہوتا ہے اور جو اور کہیں زندہ نہیں رہ سکتے۔

اگر آپ ایک قطب شمالی کے ریچھ کو ایک گرم جنگل میں لیجا کر چھوڑ دیجئے تو وہ اس طرح مر کر رہ جائے گا جیسے آپ نے اُسے ترکی کے کسی گرم حمام میں دھکیل دیا ہو کیونکہ یہ ریچھ ایک لمبے سموری لبادہ میں ملبوس ہے جسے وہ کسی حالت میں بھی اُتار نہیں سکتا اور بمقابلہ اس جانور کے ہاتھی کو دیکھیے جو گرم ممالک کا رہنے والا ہے اگر اسے قطب شمالی میں لیجایا جائے تو ٹھٹھر کر مر جائے گا کیونکہ وہ بالکل ننگا ہے جیسے ابھی کپڑے اتار کر نہانے جا رہا ہو۔

دُنیا میں صرف ایک ہی مقام ایسا ہوتا ہے جہاں آپ ہر مقام اور ہر قسم کے جانور پائیں گے۔ گیا ہستانوں کے جانور اور جنگلوں کے جانور ایک دوسرے سے چند فیٹ کے فاصلے پر رہتے ہوئے ملیں گے۔ یہ جگہ وہ باغات عامہ اور چڑیا خانے ہونگے جہاں ہر قسم کے جانور اور پیڑ وغیرہ نمائش کے لئے جمع کئے جاتے ہیں۔

چڑیا خانوں میں آپ کو آسٹریلیا کے پاس ہی جنوبی افریقہ دکھائی دے گا، اور آسٹریلیا سے چند قدم کے فاصلے پر شمالی امریکہ ہوگا، یہاں دنیا کے ہر حصے سے جانور جمع کئے جاتے ہیں لیکن یہ جانور کچھ اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں جمع نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کو یکجا کرنے والا انسان ہے۔ - - - - - - - - - - اور اس تمام جھگھٹ کی وجہ سے اُس بیچارے کو مصیبت بھی کتنی اُٹھانی پڑتی ہے ہر جانور کے لئے تقریباً ویسا ہی

ماحول پیدا کرنا پڑتا ہے جس کا وہ عادی ہو کسی کے لئے سمندر کی بجائے پانی کے تالاب کا انتظام کرنا ہوتا ہے تو کسی کے لئے بیس فٹ مربع ریت بچھا کر صحرا بنانا پڑتا ہے۔ پھر تمام جانوروں کی غذا کا انتظام اور یہ نگرانی کہ ایک دوسرے کو کھا نہ جائیں۔ قطب شمالی کے ریچھ کو روز ٹھنڈے پانی کا غسل چاہیئے، بندر کو نیم گرم پانی کا، شیر کو اپنے حصے کا کچا گوشت روز ہم پہنچانا چاہیئے، گیدھ کو اپنے پر پھڑپھڑانے کے واسطے کافی جگہ درکار ہے۔ ان تمام جانوروں کو اس قسم کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں انہوں نے پرورش پائی ہے ورنہ وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

اچھا اب یہ بتایئے کہ انسان کس قسم کا جانور ہے، صحراؤں کا رہنے والا، جنگل کا رہنے والا یا پہاڑوں کا باسی، کیا ہم جنگل کے رہنے والے آدمی کو "جنگل کا انسان" یا دلدلی مقامات کے رہنے والوں کو "دلدل کے انسان" کہتے ہیں؟

نہیں! ہم ایسا نہیں کرتے۔

کیونکہ جو انسان جنگل میں رہتا ہے وہ میدانوں میں بھی رہ سکتا ہے اور جو انسان دلدلی مقامات میں رہتا ہے وہ بہت خوشی سے خشک مقامات پر جانا پسند کرے گا۔

انسان ہر جگہ رہ سکتا ہے اور رہتا ہے۔

دنیا میں بمشکل کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں انسان نہ جا گھسا ہو۔ کوئی ایک جگہ بھی ایسی نہیں جہاں "انسان کے لئے داخلہ منع ہے" کا نوٹس لگا ہو۔ قطب شمالی کا سیاح پاپانین اور اس کے ساتھی نو مہینے تک برابر ایک برف کے تودے پر بہتے رہے تھے اور اگر وہ جلتے ہوئے صحرا کے بیچوں بیچ بھی سیاحت کرتے تو اسی قدر کامیابی کے ساتھ انجام دیتے

انسان ہر جگہ پہنچ چکا ہے وہ اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچا، سمندر کے پیندے تک اترا، ریگستان کو پار کر گیا، اس نے قطب شمالی کی برفانی وسعتوں کو طے کیا، وہ زمین کی انتڑیوں تک گھس گیا اور فضا کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگا۔

لیکن ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا جن دنوں انسان اتنا طاقتور اور ایسا آزاد نہ تھا

اُس زمانہ میں یہ سب باتیں بھی نہ تھیں۔

اپنے آباؤ اجداد سے ملئے

آج سے لکھو کھا برس پہلے کے جنگل ہمارے آج کے شاہ بلوط اور بید اور شیشم اور ببول کے جنگلوں کی طرح نہیں ہوتے تھے بلکہ اِن سے بالکل مختلف ہوا کرتے تھے۔ اُن میں جانور بھی مختلف ہوتے تھے اور گھاس، جھاڑیاں اور جھنکار بھی اور ہی قسم کی ہوا کرتے تھے۔ پُرانے وقتوں کے اِن جنگلوں میں بید، نیبو، اور ایش (ASH) کے درخت خا، لارل (Laurel) اور میگنولیا کے پودوں کے پہلو بہ پہلو اُگا کرتے تھے، اخروٹ کے درخت انگوروں کے درختوں کے پاس پاس ہوتے تھے۔ عشق پیچاں کی نازک بیلوں کے پڑوس میں کافور کے درخت اپنے چمکدار پھول لہلہایا کرتے تھے اور اِن زبردست درختوں کے آگے شاہ بلوط کے شاندار پیڑ بھی پستہ قد معلوم ہوتے تھے۔

اس وقت چونکہ ہم جنگل کو ایک گھر کی صورت میں بیان کر رہے ہیں لہذا یہ جنگل ایک معمولی گھر نہیں بلکہ ایک بلند اور شاندار حویلی کہلا سکتا ہے اس حویلی کی اوپری منزلوں میں خوب روشنی آتی تھی اور بڑا شور و غل مچا رہتا تھا بڑی بڑی چمکدار کلیوں پر شوخ رنگوں کی چڑیاں اُڑتی پھرتی تھیں اور فضا میں اُن کی سُریلی آواز گونجتی رہتی تھی۔ بندر ڈالیوں میں جھولا جھولا کرتے اور لپک لپک کر ایک درخت سے دوسرے درخت پر لٹک جایا کرتے تھے

لیکن بندروں کی ایک خاص قسم اِن ڈالیوں کو بلّیوں کی طرح استعمال کیا کرتی تھی۔ بندر مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے پھل اور مغزیات چبا چبا کر اُن کے منہ میں ٹھونسا کرتی تھیں۔ بڑے بچے اپنی ماؤں کی ٹانگوں میں لٹکے رہتے تھے اور قبیلہ کا بوڑھا، بالدار مرد ادھر تی سے درخت کے تنے پر چڑھا اُترا کرتا رہتا تھا۔ باقی سب لوگ

اُس کے پیچھے پیچھے چلا کرتے۔

یہ کس قسم کے بندر تھے؟

یہ اس قسم کے بندر تھے کہ اُن کی قسم اب کسی چڑیا خانہ یا باغ علاقہ میں نہیں پائی جاتی یہی وہ بندر تھے جن کی نسل سے انسان، گوریلے اور چمپانزی پیدا ہوئے۔ اب ہماری ملاقات اپنے ان آباؤ اجداد سے ہوگئی جو درختوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔

ہمارے یہ آباؤ اجداد بھی، کچھ پھوڑوں کی طرح جنگل کی اوپری منزلوں میں رہا کرتے تھے۔ یہ جانور جو آگے چل کر انسان بننے والے تھے، درختوں کی اونچی اونچی ٹہنیوں میں اس طرح گھوما کرتے تھے گویا وہ ٹہنیاں نہ تھیں بلکہ سینکڑوں فٹ اوپر فضا میں پل یا برآمدے یا گیلریاں تھیں۔ رات کے وقت وہ بل کھاتی ہوئی اوپر تلے کی ٹہنیوں میں اپنا بسیرا کرتے تھے۔

جنگل اُن کے لئے قلعے کا کام دیتا تھا۔ اونچی اونچی شاخوں میں پناہ لے کر وہ اپنے جانی دشمن یعنی نوکیلے دانتوں اور خنجر ایسی کچلیوں والے شیروں سے، اپنے آپ کو محفوظ رکھتے تھے جنگل ہی اُن کے لئے کھانے پینے کا ذخیرہ تھا۔ اونچی اونچی ڈالیاں ان کے کھانے کے لئے پھل اور میوے فراہم کیا کرتی تھیں۔

لیکن جنگل کی اس اوپری منزل پر پہنچنے کے لئے ان کو اپنے آپ کو تربیت بھی دینی پڑتی تھی تاکہ درختوں کے درمیان پھرتی سے دوڑ سکیں، ڈالیوں کو آسانی سے پکڑ سکیں، ایک درخت سے دوسرے پر کود سکیں، پھلوں کو پکڑ کر درختوں سے توڑ سکیں، مغزیات کو توڑ سکیں۔ اس مقصد کے لئے اُن کی انگلیاں پھرتیلی، اُن کی نظر تیز، اور ان کے دانت مضبوط ہونے چاہئیں تھے۔

ہمارے آباؤ اجداد ایک نہیں بلکہ کم از کم تین [illegible] تھے۔ وہ نہ صرف جنگل ہی

میں مقید تھے بلکہ جنگل کی بھی سب سے اوپری منزل ہیں!

انسان نے ان زنجیروں کو کس طرح توڑا؟

جنگل کے اس جانور کو اپنے قفس سے نکل کر جنگل کے حدود سے باہر جانے کی ہمت کیسے ہوئی؟

دوسرا باب

ہمارا ہیرو اور اس کے آباو اجداد اور رشتے کے بھائی بہن

ہمارے ہیرو کی دادی اور اس کے چچا زاد بھائی بہن

آج سے دو تین پشت پہلے کے مصنفین جب اپنے ہیرو کی زندگی اور اس کے کارناموں کا بیان کرتے تھے تو بڑی لفاظی اور تفصیل سے کام لیتے تھے۔ پہلے باب میں پڑھنے والے کو ہیرو اور اس کے رشتہ داروں کے متعلق بتایا جاتا تھا۔ پہلے چند صفحے پڑھنے کے بعد اسے ٹھیک معلوم ہو جاتا تھا کہ ہیرو کی دادی اپنی جوانی میں کیسے کپڑے پہنتی تھی اور اس کی ماں نے اپنی سہاگ رات سے پہلے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ پھر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا کہ ہیرو کا پہلا دانت کیسے نکلا، اس نے چلنا کیسے سیکھا۔ اس کی شروع شروع کی باتیں اور وہ ننھے منے معصومانہ تماشے! کوئی دس باب کے بعد ہیرو اسکول جانا شروع کرتا تھا اور دوسری جلد کے اختتام تک وہ عشق میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ تیسری جلد میں بہت سی مشکلوں سے گذرنے کے بعد شادی ہونے کی نوبت آتی تھی اور ناول اس سین پر ختم ہو جاتا تھا کہ ہیرو اور اس کی بیوی، جن کے بال اب سفید ہو چلے ہیں، اپنے اس گلابی گالوں والے پوتے کو محبت اور فخر کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں جو ابھی لڑکھڑاتا ہوا پاؤں چلنا سیکھ رہا ہے۔

اس کتاب میں ہمیں انسان کی زندگی اور اس کے کارناموں کے متعلق بیان

کرنا ہے۔

گذشتہ زمانے کے لائق و فائق مصنفوں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے ہم بھی اپنے ہیرو کے اسلاف کے متعلق بیان کریں گے پھر اس کے قریبی رشتہ داروں کا بیان کریں گے! دریں کہ وہ دُنیا میں سب سے پہلے کس طرح پیدا ہُوا، اُس نے چلنا، بات کرنا اور سوچنا کیسے سیکھا کیسے اُس نے روزی کمانا سیکھا، ہم اس کے رنج و غم، اس کی فتوحات اور شکستوں کا جائزہ لیں گے۔

ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ بالکل شروع میں ہمیں بہت سخت مشکلوں کا سامنا ہوگا۔ ہم بھلا اس دادی کا کیا ذکر کریں! وہ بندر دادی جس کی وہ اولاد ہے کیونکہ برسوں سے دُنیا میں اِس طرح کی باتیں نہیں ہُوا کرتیں۔ ہمارے پاس اُن دادی اماں کی کوئی تصویر بھی نہیں ہے اور اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ بندر تصویریں نہیں کھینچا کرتے۔ لہذا اگر ہم اپنے اُن آباء اجداد سے ملنا چاہیں جن کا ذکر گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے تو یہ ملاقات صرف عجائب خانے ہی میں ہو سکتی ہے اور عجائب خانے میں بھی کوئی پُورا کا پُورا سالم اور مکمل نمونہ ملنا ناممکن ہے کیونکہ اُن کا جو کچھ بھی باقی رہ گیا ہے وہ صرف چند ہڈیاں اور چند مٹھی دانت ہیں جو افریقہ، ایشیا اور یورپ کے مختلف مقامات میں پائے گئے ہیں۔

آپ نے بغیر دانت والی دادیوں کو تو دیکھا ہو گا مگر یہ معاملہ تو ایسا ہے جہاں دانت تو موجود ہیں اور دادی ندارد!

انسان کو پاؤں سے چلتے ہوئے اور جنگلوں سے نکلے ہوئے مدتیں گذریں اور اب بھی جبکہ وہ صحیح معنوں میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہے اس کے کافی قریبی رشتہ دار مثلاً گوریلے چمپانزی وغیرہ ابھی تک جنگلوں میں جنگلی جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

انسان کو اپنے ان بیچارے رشتہ داروں کے متعلق سوچتے ہوئے ذرا پس و پیش ہوتا ہے بلکہ بعض وقت تو اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سرے سے ان کی اور اپنی

رشتہ داری ہی سے مکر جائے۔

بعض لوگ تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ چمپانزی اور انسان کی پر دادی ایک ہی تھی!

چند سال پہلے اس بات کے متعلق ایک مقدمہ بھی ہوا تھا۔ ایک اسکول کا استاد بیچارہ کھینچ کر کچہری میں لایا گیا اور اس پر اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا کہ اُس نے اپنے طلبا کو انسان اور بندر کی رشتہ داری سمجھانے کی ہمت کی تھی! بہت سے معزز شہری سڑکوں پر نکلے، جنہوں نے بازوؤں پر پٹے باندھ رکھے تھے۔ ان پٹوں پر لکھا تھا "ہم بندر نہیں ہیں اور بندر بنائے جانے سے قطعی انکار کرتے ہیں" بچارا اسکول ٹیچر، جس کے خواب و خیال میں بھی ان گدھوں کو بندر بنانا مقصود نہ تھا، لوگوں کے اس ہجوم اور ان الزامات سے بوکھلا گیا جس وقت فاضل جج صاحب اُس پر سوالوں کی بوچھار کر رہے تھے تو وہ یقیناً یہ سوچ رہا ہو گا کہ "جج صاحب کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں۔ اس حساب سے تو پہاڑا پڑھانا بھی ایک جرم ٹھہرے گا اور لوگ پڑھانے والوں پر مقدمہ چلائیں گے"

غرضیکہ مقدمہ پوری قانونی باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہا۔ جب گواہیاں حاضر ہو چکیں تو ملزم کو آخری فیصلہ سُنایا گیا پھر جج صاحب نے اپنا حکم صادر فرمایا:۔

۱۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انسان اور بندر میں کسی قسم کا رشتہ نہیں ہے۔

۲۔ ملزم کو سو ڈالر جرمانہ کی سزا دی جاتی ہے۔

اس طرح ٹینے سی کے ایک جج نے انسان کی اصلیت کے عظیم الشان سائنس کی تھیوری کو جو ڈارون کی قائم کی ہوئی تھی، فیصلہ کر کے رد کر دیا۔

لیکن حقیقت بھلا کہیں اپنی جگہ سے ٹلتی ہے۔ قانونی فیصلوں سے واقعات کہیں جھٹلائے جا سکتے ہیں۔ انسان اور بندر کی رشتہ داری کے بہت سے ثبوت اس کتاب میں اکٹھے کئے جا سکتے تھے مگر سائنس کے انکشافات کے علاوہ بھی

جس کسی نے چمپانزی یا "اورنگ اوٹنگ" کو سرسری طور پر بھی دیکھا ہو اسے اس کے بہت سے ثبوت مل سکتے ہیں اور یہ رشتہ داری بالکل صاف صاف کھلم کھلا نظر آتی ہے۔

ہمارے چچازاد بھائی بہن روزا اور رافل

آج سے چند سال پہلے، کوٹشی کے گاؤں میں، ایوان پاولوف نامی ایک سائنسدان کی لائبریری میں، دو چمپانزی لائے گئے جن کا نام روزا اور رافل تھا۔

عام طور پر جب یہ جنگل کے رشتہ دار لوگوں سے ملنے آتے ہیں تو لوگ ان سے نرمی کا برتاؤ نہیں کرتے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان بچاروں کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیتے ہیں لیکن اس مرتبہ افریقہ کے رہنے والے ان جنگلی مہمانوں کا بہت خاطر مدارات کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ اُن کے لئے مخصوص کمرے تجویز کئے گئے جن میں خوابگاہ، کھانا کھانے کا کمرہ، غسل خانہ، آفس اور کھیلنے کا کمرہ سب الگ الگ تھے۔ خوابگاہ میں دو مکلف پلنگ بچھے ہوئے تھے اور ہر پلنگ کے پاس رات کے استعمال کے لئے ایک ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ کھانے کی میز پر سفید میز پوش بچھا تھا اور الماریوں میں کھانے پینے کی چیزیں بھری رکھی ہوئی تھیں۔

اس پورے گھر میں کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جس سے بندروں کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ انسان نہیں بلکہ بندر ہیں۔ کھانے کی میز پر، اُن کے استعمال کے لئے چھری کانٹے اور چمچے مہیا کئے گئے تھے۔ پلنگوں پر چادریں، کمبل اور تکئے سلیقے سے لگے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مہمان کبھی کبھی تہذیب کو کچھ خاص ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ کھانے کے وقت چمچے الگ رکھکر پڈنگ کو طشتری سے چاٹ لیتے۔ رات کو سوتے وقت اپنا سر تکئے پر رکھنے کی بجائے تکیہ اُٹھا کر سر پر رکھ لیتے۔

بہرحال، اگر روزا اور رافل نے بالکل انسانوں کی طرح رہنا نہیں سیکھا تو کم ازکم کافی قریب ضرور آگئے۔ مثلاً روزا الماری کی کنجیاں بخوبی استعمال کر لیتی تھی جیسے کوئی گرہستی بی بی ہو عموماً یہ کنجیاں پہرے دار کی جیب میں رہتی تھیں روزا چپکے چپکے دبے پاؤں اس کے پیچھے سے جاتی اور آہستگی سے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کنجیاں کھسکا لیتی۔ پھر بھاگی بھاگی کھانے کے کمرے میں پہنچتی اور الماری کے شیشہ دار کواڑوں کے پیچھے لذیذ انگوروں اور ناشپاتیوں کی پلیٹیں رکھی ہوتی تھیں جنہیں دیکھکر منہ میں پانی بھر آئے۔ وہ احتیاط کے ساتھ چابی کے سوراخ میں چابی کو فٹ کر دیتی اور جلدی سے گھماتی۔ کڑاک! اور انگوروں کا وہ گچھا جو اُسے ملنا چاہتا اس کے ہاتھ میں ہوتا۔

اور رافل! آپ اُسے سبق پڑھتے ہوئے دیکھتے تو کہتے۔

اس کو تربیت دینے کا ذریعہ کیا تھا! ایک ناشپاتیوں سے بھری ہوئی بالٹی اور چند مختلف سائز کے لکڑی کے مربع ٹکڑے۔ عام طور پر بچے جن لکڑی کے مربع ٹکڑوں سے کھیلا کرتے ہیں اُسی قسم کے لیکن سائز میں اُن سے کہیں زیادہ بڑے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اُن میں سب سے چھوٹا اتنا بڑا ہوتا تھا جیسے ایک معمولی تپائی۔

ناشپاتیوں کی بالٹی اوپر بہت دور لٹکا دی جاتی تھی، جہاں رافل کا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور سارا مرحلہ یہی تھا کہ بالٹی تک پہنچ کر ناشپاتیاں کیونکر حاصل کر کے ہضم کی جائیں۔

شروع شروع میں تو رافل غریب اِس مشکل مرحلے کو طے کرنے میں بالکل ناکامیاب رہا۔ اپنے جنگلی وطن میں تو وہ جس پھل کو توڑنا چاہتا درخت پر چڑھ جاتا اور توڑ لیتا لیکن، یہاں پھل کوئی ڈالی میں تو لٹک نہیں رہا تھا بلکہ فضا میں معلق تھا

جہاں اُس کا ہاتھ پہنچ ہی نہیں پاتا تھا لکڑے میں صرف وہ لکڑی کے مربع ٹکڑے ہی ایک ایسا ذریعہ تھے جن سے کسی طرح وہ ناشپاتیوں تک پہنچ سکتا تھا۔

ان ٹکڑوں کو بار بار گھما پھرا کر دیکھنے کے بعد رافل پر ایک عجیب راز کا انکشاف ہوا کہ اگر ایک ٹکڑے کو دوسرے پر رکھا جائے تو ناشپاتیوں کے ذرا قریب پہنچ جا سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس نکتے کو پہنچ گیا کہ پہلے تین ٹکڑوں کا ایک مینار سا بنا لیا جائے پھر چار ٹکڑوں کا مینار بنایا جائے اور پھر پانچ کا لیکن یہ اُس کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا۔ صرف ٹکڑوں کو کسی طرح اینڈا بینڈا رکھنے سے کام نہیں چل سکتا تھا بلکہ ان کو ایک خاص ترتیب سے رکھنے کی ضرورت تھی۔ سب سے بڑا سب سے نیچے پھر اُس سے چھوٹا پھر اس سے چھوٹا اور سب کے اوپر سب سے چھوٹا

بار بار وہ یہ غلطی کرتا تھا کہ چھوٹے کے اوپر بڑا ٹکڑا رکھ دیتا اور عمارت ڈگ مگ کر کے ہلنے لگتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا کہ اب یہ مینار مع رافل کے نیچے آ رہے گا مگر ایسا ہوا نہیں کیونکہ رافل آخر کار بندر تھا اور بندر کی پھرتی اور صفائی معلوم!

آخر کار اس نے یہ مرحلہ طے کر ہی لیا اور ساتوں ٹکڑوں کو اپنے اپنے سائز کے مطابق ایک دوسرے پر جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان ٹکڑوں پر نمبر پڑے تھے اور اُس نے ان نمبروں کو پڑھ لیا تھا۔ آخرش وہ بالٹی تک پہنچ ہی گیا اور ہنستے ہوئے اس مینار کی چوٹی پر اُس نے اس مصیبت سے حاصل کی ہوئی ناشپاتیوں کی خوب ضیافت اڑائی!

کیا اس انسان نما طریقے پر کوئی اور جانور کام کر سکتا تھا؟ کیا آپ کبھی خیال کر سکتے ہیں کہ کوئی کتا بھی لکڑی کے ٹکڑوں سے مینار بنا سکتا ہے حالانکہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کتا کافی ذہین جانور ہے!

سب سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ تھی کہ جب رافل کام میں مشغول ہوتا

تو وہ بالکل انسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھاتا، اسے کاندھے پر رکھتا اور دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے اسے مینار پر رکھنے کے لئے چل دیتا۔ اگر وہ ٹکڑا وہاں ٹھیک نہ بیٹھتا تو وہ اسے زمین پر رکھ دیتا اور بیٹھ جاتا جیسے سوچ رہا ہو چند منٹ تک آرام کرنے کے بعد وہ پھر اٹھتا اور اب کی مرتبہ اپنی غلطی کو ٹھیک کر دیتا۔

کیا چمپانزی کو انسان بنایا جا سکتا ہے؟

اچھا تو اب یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا چمپانزی انسان کی طرح چل پھر سکتا ہے، بات چیت کر سکتا ہے، سوچ سکتا ہے، کام کر سکتا ہے؟

جانوروں کا ایک بہت مشہور سدھانے والا اس امکان کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس نے بہت محنت اور ریاضت کر کے ایک چمپانزی کو سدھایا تھا۔ اس چمپانزی کا نام ہامِس تھا اور ہامِس بھی واقعی بہت ہی ذہین شاگرد ثابت ہوا۔ اس نے چمچے سے کھانا کھانا سیکھا، گلے میں چھوٹی تولیہ باندھ کر، میز کے پاس کرسی پر بیٹھ کر دسترخوان پر گرائے بغیر شوربہ پینا سیکھا۔ یہاں تک کہ اس نے سلیڈ پر بیٹھکر برف پر پھسلنا بھی سیکھ لیا۔

لیکن پھر بھی، وہ انسان نہ بن پایا۔

اور اس کی وجہ معلوم کرنا بالکل آسان ہے۔ چمپانزی کی بناوٹ اور ساخت انسان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ مختلف ہوتے ہیں، اس کے پاؤں اور ٹانگیں مختلف ہوتی ہیں، اس کا دماغ اور اس کی زبان مختلف ہوتی ہے۔

ذرا چمپانزی کے منہ کے اندر جھانک کر دیکھئے لیکن ذرا احتیاط رہیئے گا چمپانزی بڑے زوروں سے کاٹ کھاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے منہ میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ اس کی زبان کافی گھمائی پھرائی جا سکے اور جو کچھ تھوڑی بہت جگہ ہے بھی وہ بھی اس کے بڑے بڑے دانتوں سے گھری ہوئی ہے۔

اب یہ حقیقت ہے کہ اس کے منہ میں زبان کے گھومنے کے لئے کافی جگہ نہیں ہے
اس بات کو ناممکن بنا دیتی ہے کہ وہ کبھی بھی بات کرنا سیکھ سکے گا۔ جب انسان بات
کرتا ہے تو اس کی زبان عجیب عجیب کرتب کرتی ہے، کبھی مڑ کر کمان بن جاتی ہے
کبھی کانپتی ہے کبھی تالو سے جا لگتی ہے، کبھی پیچھے ہٹ کر حلق سے آواز کو باہر آنے
کا رستہ دیتی ہے، کبھی آگے بڑھ کر سامنے کے دانتوں سے آ رجاتی ہے، ان تمام
کرتبوں کے لئے کافی جگہ کی ضرورت ہے اور چمپانزی کے منہ میں اتنی جگہ کہاں؟

اس کے علاوہ چمپانزی کے لئے یہ بھی قطعی ناممکن ہے کہ وہ انسانوں کی طرح
اپنے ہاتھ سے کام لے سکے کیونکہ اس کے ہاتھوں کی ساخت آدمی کے ہاتھ سے بالکل
مختلف ہے۔ چمپانزی کا انگوٹھا اس کی سب سے چھوٹی انگلی (چھنگلیا) سے چھوٹا ہوتا
ہے اور اس طرح بالکل ایک طرف کو ہٹا ہوا نہیں ہوتا جتنا ہمارے ہاتھوں میں ہوتا ہے
اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں میں سب سے زیادہ
کارآمد انگوٹھا ہوتا ہے۔ پانچ مزدوروں کا یہ دستہ جو ہمارا ہاتھ کہلاتا اس کا سردار
انگوٹھا ہی ہے۔ باقی چار انگلیوں میں سے ہر ایک کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہے
اور چاروں کے ساتھ بھی مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے
مختلف قسم کے اوزار کام میں لا سکتے ہیں۔

چمپانزی کا ہاتھ بہت کچھ انسان کے پاؤں سے ملتا جلتا ہے جب اسے
کسی درخت سے پھل توڑنا ہوتا ہے تو اکثر ڈالیوں کو اپنے ہاتھ سے پکڑتا ہے
اور پاؤں سے پھل توڑ لیتا ہے، مختصر یہ ہے کہ وہ اکثر ہاتھوں کا کام پیروں
سے اور پیروں کا کام ہاتھوں سے لیتا ہے اب سوچئے کہ اگر انسان بھی ہاتھ
کی جگہ پاؤں اور پاؤں کی جگہ ہاتھ استعمال کرنے لگے تو کتنا کام کر سکے گا!

لیکن چمپانزی کی زبان، ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کی ساخت کے

علاوہ ایک اور بہت اہم چیز ہے جسے چمپانزیوں کو سدھانے اور انسان بنانے کی کوشش کرنے والے بھول جاتے ہیں۔

انہیں یہ خیال نہیں رہتا کہ چمپانزی کا دماغ، انسان کے دماغ کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا انسان کا دماغ ہوتا ہے۔ بندر کو انسان بنتے بنتے لاکھوں برس لگ گئے اور صرف دماغ کا یہ اختلاف ہی اس بات کو ناممکن بنا دیتا ہے کہ چمپانزی کبھی بھی انسان کی طرح سوچ سکے!

چمپانزی کی حرکتوں میں جو افراتفری اور عدم ترتیب پائی جاتی ہے وہ اس کے ذہن کی بھی غیر ترتیب وار خاصیت کو ظاہر کرتی ہے اور یہ صورتِ حال انسان کی ترتیب وار اور انہماک سے سوچ سکنے کی طاقت کے بالکل برخلاف ہے۔

اس کے باوجود چمپانزی کافی ذہین ہوتا ہے اور اپنے قدرتی ماحول یعنی جنگل میں اپنی زندگی بسر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے کیونکہ [illegible] کی ارتقا میں اس نے اپنے آپ کو اسی زندگی کے مطابق ڈھال لیا ہے۔

ایک مرتبہ ایک فلمساز ڈائرکٹر روزا اور رافل کی تصویریں کھینچنے آیا اور اس بات پر مصر ہوا کہ ان کی ایک تصویر گھر کے باہر کھلے میدان میں بھی لی جائے چنانچہ ان دونوں کو باہر نکال کر چھوڑ اگیا۔ بس آزاد ہونے کی دیر تھی کہ جو درخت ان کو سب سے پاس نظر آیا، دوڑ کر اس پر چڑھ گئے اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اچھلنے اور کود کود کر جانے لگے اور خوشی کے مارے جو چیاؤں مباؤں ہوئی اس کا تو پوچھنا ہی کیا! اس آرام دہ گھر کے مقابلہ میں ان کو درخت پر زیادہ آرام اور خوشی ہوئی۔

اپنے دیس یعنی افریقہ میں چمپانزی جنگل کی سب سے اونچی منزل میں رہتا ہے، ڈالیوں میں اپنے رہنے کے لئے گھر بناتا ہے اور اپنے دشمنوں سے بچنے

کے لئے بھی اونچی اونچی ٹہنیوں میں پناہ لینا ہے۔ اسے اپنی غذا، پھل، مغزیات اور میوے وغیرہ بھی وہیں کے وہیں درختوں میں مل جاتے ہیں۔ وہ درختوں میں رہنے کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ زمین پر دوڑنے سے بھی زیادہ تیزی سے درختوں پر چڑھ جاتا ہے اور جہاں کہیں درخت نہ ہوں وہاں آپ کو چمپانزی بھی نہیں ملیں گے۔

ایک مرتبہ ایک سائنس داں افریقہ میں ایک مقام کیمرون کو گیا کہ دیکھیں چمپانزی اپنے دیس میں کس طرح رہتے ہیں۔ اس نے ایک درجن چمپانزی پکڑے اور انہیں اپنے کھیت کے پاس ہی ایک جنگل میں رکھا تاکہ ان کو آرام اور سہولت رہے اور اس نے ان کو بھاگنے سے روکنے کے لئے ایک پنجرہ بنایا۔ ایک ایسا پنجرہ جو دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ پنجرہ صرف دو اوزاروں، کلہاڑی اور آری سے بنایا گیا تھا اس نے بس صرف اتنا کیا کہ جنگل میں چاروں طرف کافی دور دور تک پیڑ کٹوا دئے اور بیچ میں بہت سے پیڑوں کا ایک جزیرہ سا چھوڑ دیا اور ی جزیرے کے پیڑوں پر اس نے چمپانزیوں کو چھوڑ دیا

اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ چمپانزی پیڑوں پر رہنے والا جنگل کا جانور ہے اس کے معنی گویا یہ ہوئے کہ وہ اپنی خوشی سے جنگل چھوڑنا کبھی پسند نہیں کرتا چمپانزی کو کسی بغیر درختوں والے مقام پر بسانا اسی قدر مشکل ہے جیسے قطب شمالی کے ریچھ کو صحرا میں بسایا جائے۔

اچھا تو پھر اگر چمپانزی سے جنگل نہیں چھوٹ سکتا تو پھر اس کا رشتہ دار انسان جنگل چھوڑ کر کیسے باہر نکلا؟

ہمارے ہیرو نے چلنا سیکھا

ہمارے جنگل کا باسی انسان نے اپنا جنگلی قفس کچھ ایک دن یا ایک سال میں نہیں توڑا۔ اُسے جنگل سے نکلتے نکلتے اور بغیر درختوں والے مقامات پہنچتے پہنچتے لاکھوں برس کا عرصہ لگا۔

اُس نے اُس زنجیر کو جو اُسے جنگل سے باندھے ہوئے تھی توڑنے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ پیڑوں کی چوٹی سے اُتر کر زمین پر چلنا سیکھا۔

آج بھی انسان کے لئے پہلے قدم اُٹھانا، پہلے پہل پاؤں چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے جو کوئی بھی کسی نرسری اسکول میں گیا ہوگا اُس نے دیکھا ہوگا کہ ان کے یہاں ایک خاص جماعت "گھٹنیوں چلنے والوں" کی ہوتی ہے۔ گھٹنوں چلنے والے وہ بچے ہوتے ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ تو سکتے ہیں مگر صرف دونوں پاؤں کے بل نہیں چل سکتے۔ "گھٹنیوں چلنے والے" کئی ماہ بعد جا کر اس قابل ہوتے ہیں کہ پاؤں چلنے والوں کی جماعت میں شامل ہو سکیں۔ زمین پر ہاتھ ٹیکے بغیر یا کسی آس پاس کی چیز کا سہارا لئے بغیر چلنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے بلکہ حقیقتاً سواری کرنے یا بائیسکل چلانا سیکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

لیکن ہمارے آباو اجداد کو جو چلنا سیکھنے میں ہزارہا سال لگ گئے اُس کے مقابلہ میں یہ چند ماہ کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے آبا جیب پیڑوں کی چوٹی پر رہتے تھے اُس وقت بھی وہ کبھی کبھی زمین پر اُتر آیا کرتے تھے۔ ممکن ہے وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ زمین پر نہ ٹیکتے ہوں بلکہ اپنے پچھلے پاؤں پر دو چار قدم چل بھی لیتے ہوں جیسے چمپانزی کبھی کبھی کرتے ہیں۔

ا۔ بالکل چھوٹے بچوں کا اسکول جس کو طفل گاہ کہہ سکتے ہیں۔

لیکن دونوں قدم اٹھانے اور سوچ اس قدم چلنے میں تو بہت فرق ہے اس کے لئے تو طویل اور مستقل محنت کی ضرورت ہے۔ ویسے ہمارے آبا سب تو ہونگے چار پاؤں والے جانور! لیکن اُس صورت میں وہ انسان نہیں کہلا سکتے تھے کیونکہ جب وہ انسان بنے تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے چلنے کا کام لینا چھوڑ دیا اور ان کو بہت سے کاموں کے لئے استعمال کیا۔ پیروں نے سب بوجھ سنبھال کر ہاتھوں کو کام کیلئے آزاد کر دیا۔

ابھی ہمارے آبا درختوں ہی میں رہتے تھے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے وہ کام لینے شروع کئے جو پیروں سے لئے جانے والے کاموں سے مختلف تھے۔ وہ ہاتھوں سے پھل اور میوے توڑتے تھے اور اپنے رہنے کے لئے درختوں کی آڑی سیدھی ڈالیوں میں بسیرے بھی ہاتھوں ہی سے بناتے تھے۔

اب اس بات کو سوچنا چاہیئے کہ جن ہاتھوں سے پھل یا میوہ اٹھایا جا سکتا تھا اُن سے یقیناً پتھر اور لکڑی بھی اٹھائی جا سکتی ہو گی اور جب آپ نے اپنے ہاتھ میں پتھر یا لکڑی پکڑ لی تو سمجھئے کہ آپ کا ہاتھ پہلے سے زیادہ مضبوط اور لمبا ہو گیا۔ پتھر سے آپ ایسے مغزیات توڑ سکتے ہیں جنہیں دانت سے نہیں توڑ سکتے تھے، لکڑی سے آپ جڑیں وغیرہ کھود سکتے ہیں۔

اِس طرح، تھوڑا تھوڑا کر کے، ہمارے آبا نے اپنے کھانے میں نئی نئی چیزیں شامل کرنی شروع کر دیں، ایسی چیزیں جو چڑیاں چوہے اور چیونٹیاں وغیرہ کھایا کرتی تھیں۔ شروع میں وہ اِس قسم کی چیزیں صرف اُس وقت کھاتے تھے جب ان کو اپنی خاص غذا نہیں مہیا نہ ہو سکتی تھی، جب بندروں کے غولوں کے غول آ کر جنگلوں کے پھل اور میوے کھا پی کر برابر کر دیتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ اِن نئی غذاؤں کے عادی ہوتے چلے گئے اور اکثر اس غذا کی تلاش میں پیڑوں سے نیچے اُتر اُتر کر آنے لگے وہ لکڑی کی مدد سے زمین کھود کھود کر جڑیں اور گانٹھیں تلاش کرتے رہتے۔ وہ درختوں کے

تنوں اور مٹھوں کو پتھر مار مار کر توڑ ڈالتے اور ان میں سے کیڑوں کے انڈے بچے نکال کر چٹ کر جاتے۔

لیکن ان کاموں کے لئے ہاتھوں کی ضرورت تھی اور اگر ہاتھ کو مشغول رکھنا تھا تو قدرتی طور پر انہیں اس دوسرے کام یعنی چلنے میں مدد دینے سے آزاد کرنا ضروری تھا۔ اس طرح ہاتھوں نے چلنے کا تمام بوجھ پیروں پر ڈال دیا اور پیروں نے ہاتھوں کو کام کے لئے آزاد کر دیا! اور اس طرح اس زمین پر ایک نئے قسم کے جانور کی بنا پڑی۔ ایک ایسا جانور جو پچھلے پیروں پر چلتا تھا اور اگلے پیروں سے کام کرتا تھا۔

یہ ہستی اب بھی بہت کچھ جانور سے ملتی جلتی تھی لیکن اگر اس وقت بھی آپ اس کو پتھر یا لکڑی استعمال کرتے دیکھتے تو آپ فوراً کہہ اٹھتے کہ "یہ جانور تو اس وقت بھی انسان بنتا جا رہا ہے" کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ صرف انسان ہی میں اوزار استعمال کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے۔ جانور کبھی اوزار استعمال نہیں کر سکتے

جب چیونٹا یا چھچھوندر زمین کھودتے ہیں تو وہ کوئی اوزار استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے پنجوں سے کھودتے ہیں۔ جب چوہا کسی درخت کو کترتا یا کاٹتا ہے تو وہ کوئی چھری کا استعمال نہیں کرتا بلکہ اپنے دانتوں ہی سے یہ کام لیتا ہے۔ کٹھ پھوڑا درخت میں چھید کرنے کے لئے کچھ برما نہیں لے آتا، وہ اپنی چونچ ہی استعمال کرتا ہے۔

اب ہمارے آبا و اجداد کے پاس برمے ایسی چونچ، کدال ایسے پنجے اور چھری ایسے دانت تو تھے نہیں لیکن ان کے پاس ان سب دانتوں اور سونڈوں سے بڑھ کر ایک چیز تھی اور وہ تھے ان کے "ہاتھ" اور یہ ہاتھ ان کے لئے پتھر کے دانت اور لکڑی کے پنجے مہیا کر سکتے تھے۔

ہمارا ہیرو زمین پر اتر آیا

جس وقت یہ تمام تبدیلیاں ہو رہی تھیں تو کرۂ ارض کا موسم بھی رفتہ رفتہ

بدلتا جارہا تھا۔ قطب شمالی کے برفانی تودے جنوب کی طرف بڑھتے آرہے تھے۔ پہاڑوں نے اپنی برفیلی سفید ٹوپیاں اور آگے کو جھکالی تھیں۔ راتیں زیادہ سرد ہوتی جارہی تھیں اور ہمارے آبا و اجداد کے جنگلی دیسوں میں سردیوں میں بہت زیادہ جاڑا پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ اگرچہ موسم ابھی تک نیم گرم ضرور تھا مگر اس کو گرم نہیں کہا جاسکتا تھا۔

پہاڑوں کے جنوبی ڈھلواں حصوں کی طرف پام، میگنولیا اور للرل کے درختوں کے بجائے اب شاہ بلوط اور زیبو کے درخت نظر آنے لگے تھے کیونکہ ان درختوں کے پتے جاڑوں میں جھڑ جاتے ہیں اور اس طرح وہ سردی سہہ سکتے ہیں۔ جاڑوں میں یہ درخت سردی کا مقابلہ کرنے کے بجائے اتنے عرصے کے لئے ایک معنی میں مرجاتے ہیں اور گرمیوں کے شروع موسم بہار میں پھر زندہ ہوجاتے ہیں۔

اس بڑھتی ہوئی سردی کے سامنے انجیر اور انگور کے درخت پیچھے ہٹ کر جنوب کے ڈھلوان حصوں اور کھوڑوں میں پناہ لیتے گئے اور گرم جنگلوں کے حدود ان جنگلوں کے ساتھ جنوب کی طرف آتے گئے۔ ماسٹوڈن، جو ہاتھیوں کا پرکھا تھا غائب ہوگیا۔ لمبے دانتوں والا چیتا دن بدن کمیاب ہوتا گیا۔

جن مقامات پر پہلے جھاڑیاں وغیرہ اگی رہتی تھیں وہ اب صاف ہوگئے اور درختوں کے درمیان کھلی ہوئی جگہ نظر آنے لگی۔ ان جگھوں میں ہرن اور بارہ سنگھوں کے غول چرتے نظر آنے لگے۔ بندروں میں سے کچھ زندہ بچے باقی مرکھپ گئے۔

اس نئے ماحول کے مطابق اپنے کو ڈھالنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بندروں کے کھانے کے پھل دن بدن کمیاب ہوتے جارہے تھے کیلے، انجیر اور انگور کے درخت ملنے مشکل ہوگئے تھے۔ ایک درخت سے دوسرے درخت پر پہنچنا بھی اب آسان نہ تھا کیونکہ درختوں کے جھنڈوں کے درمیان کھلی جگہ میں دوڑنا ہوتا تھا۔ درختوں پر رہنے والوں کے لئے زمین پر اترنا ہی کیا کم مصیبت تھی کہ ساتھ ہی یہ مشکل بھی تھی کہ ارسو

دیکھا بھالا جائے کہ کہیں سے کوئی شکاری جانور نہ جھپٹ پڑے۔

لیکن ہمارے جد کے سامنے اور کوئی راستہ نہ تھا بھوک سے بیزار ہو کر اسے درختوں سے نکلنا ہی پڑا۔ رفتہ رفتہ اس کو درخت سے نیچے اتر کر، کھلے میدانوں میں گھوم پھر کر اپنی غذا تلاش کرنے کی زیادہ ضرورت پڑنے لگی اور وہ غذا بھی ایسی ہوتی تھی جو اس زمانے میں بندر منہ میں بھی نہ ڈالتے تھے۔

جنگلی جانوروں کے لئے یہ تمام تبدیلیاں کیا معنی رکھتی تھیں؟ کہ وہ ان پنجروں کو چھوڑیں جن کے وہ عادی تھے، جس جنگلی زندگی اور جنگلی دنیا کے لئے وہ موزوں ہو چکے تھے اُس سے علیحدہ ہو جائیں!

ذرا سوچئے تو سہی کہ اس کے کیا معنی ہوئے کہ جنگل کے تمام قواعد بدل دئے جائیں، قدرت کی وہ تمام زنجیریں جن سے یہ جنگلی جانور اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے تھے توڑ دی جائیں۔

مثال کی طور پر ایک ایسی گلہری کو لیجئے جو اپنی جنگل کی زندگی کو چھوڑ کر میدانوں کی زندگی اختیار کرے۔ میدان میں اُسے مغزیات اور سانپ کی چھتریوں کے بجائے گھاس کھانی پڑے گی۔ میدان میں اسے اپنے رہنے کے لئے بل کھودنے پڑیں گے اور اس کام کے لئے اسے دوسری طرح کے پنجوں کی ضرورت ہو گی اور اُس کی وہ خوبصورت دُم جو جنگل میں اسے ایک درخت سے دوسرے درخت پر کودنے میں اس کی مددگار ہوتی ہے کھلے میدان میں اُس کے لئے ایک مشکل بن جائیگی اور ہمیشہ اس کے دشمنوں کے لئے ایک نشان کا کام دے گی جس سے وہ اُسے پکڑ لیا کریں گے چنانچہ قبل اِس کے کہ گلہری اپنا جنگلی مکان چھوڑے اسے اپنے دانتوں اور اپنی جھبڑ جھبڑالی ہوئی دُم کو خیرباد کہنا ہوگا اور میدان کے رہنے والے چوہوں یا گھونسلوں کے سے دانت اختیار کرنا ہونگے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ گلہری

ہی نہیں رہے گی۔

پھر اپنے سرد والے پرندے کی مثال لیجئے۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ وہ شاہ بلوط کے کھوکھول میں رہ سکتا اور شاہ بلوط کے پھل کھا سکتا ہے؟ نہیں کیونکہ اس کی وہ چونچ جو سرد کے پھلوں سے بڑی صفائی اور خوبی سے مغزیات نکال سکتی ہے، شاہ بلوط کا پھل کھول کر مغز نہیں نکال سکتی۔ اس لئے اگر سرو کا پرندہ اپنا سرو کا جنگل چھوڑ کر شاہ بلوط کے جھنڈ میں بود و باش اختیار کرنا چاہے تو اُسے سرے سے ایک دوسرے ہی قسم کی چونچ لگوانی پڑے گی۔

یہ صحیح ہے کہ جانور اور پرندے بھی بدلتے ضرور ہیں (دنیا میں ہر چیز بدلتی ہے) لیکن ان تبدیلیوں میں بھی بہت سال لگتے ہیں ہر بچہ اپنے ماں باپ سے صرف بہت ہی ذرا سا (بڑنے نام) مختلف ہوتا ہے اور ہزار ہا پشتیں گذرنے کے بعد کہیں ایک مختلف قسم پیدا ہوتی ہے۔

اچھا تو پھر ہمارے آبا و اجداد کا کیا حشر ہوا؟

اگر ہمارا جد اپنی عادتیں اور طور طریقے نہ بدل ڈالتا تو اُسے بھی دوسرے بندروں کے ساتھ جنوب کی طرف ہجرت کرنی پڑتی لیکن اس وقت تک وہ اوروں کے مقابلہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا کیونکہ وہ پتھر اور لکڑی کے بنائے ہوئے مصنوعی دانتوں اور پنجوں سے اپنی غذا تلاش کر لیا کرتا تھا۔ اب وہ اُن رسدار جنوبی پھلوں کے بغیر بھی گذارہ کر سکتا تھا جو ان بدلتے جنگلوں میں کم یاب ہوتے جا رہے تھے اور اُسے اس بات سے بھی اب کچھ زیادہ پریشانی نہ تھی کہ درختوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا کیونکہ اُس نے دوڑنا سیکھ لیا تھا۔ اب اُسے کھلے میدانوں سے ڈر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اگر کسی دشمن سے سامنا ہو جاتا تھا تو اُس کے پاس لکڑیاں اور پتھر تو تھے ہی اور پھر وہ اکیلا بھی تو نہیں تھا۔ اِن نیم انسانوں کا جتھا، ایک ساتھ

مل کر اپنا بچاؤ کرتا تھا اور ان سب کے پاس پتھر اور لکڑیاں ہوتی تھیں۔

اس طرح یہ سخت موسم جو نیا نیا آیا تھا، ہمارے جد کو نہ تو ختم ہی کر سکا اور نہ اسے اور گرم جنگلات کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر سکا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس موسم کی بدولت وہ زیادہ تیزی کے ساتھ انسان بننے لگا۔

اور ہمارے اور رشتہ دار بندروں کا کیا حشر ہوا؟

وہ گرم جنگلات کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور اس طرح جنگل کے ہی باسی ہو کر رہ گئے۔ اُن کو جانا ہی پڑا اس لئے کہ انہوں نے ہمارے آباو اجداد کی سی ترقی نہیں کی تھی، کیونکہ انہوں نے اوزار استعمال کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ اُن بندروں میں جو سب سے زیادہ ہوشیار تھے اور پیڑوں کی چوٹیوں پر رہتے تھے انہوں نے ڈالیوں پر پھرتی سے کودنے اور ٹہنیوں پر مضبوطی سے لٹکنے میں اور زیادہ مہارت اور مشق حاصل کر لی۔ انسان بننے، ہاتھوں سے کام کرنے اور پیروں سے چلنے کے بجائے اور اس کے بالکل برخلاف، وہ اور زیادہ بندروں کی خصلت اختیار کرتے گئے اور اپنے آپ کو پیڑوں کی بود و باش کے لئے اور زیادہ ڈھالتے گئے۔ انہوں نے اپنا زیادہ بوجھ ہاتھوں پر ڈال کر، چاروں ہاتھ پیروں سے چلنا قائم رکھا جیسے چمپانزی آج بھی کرتے ہیں اور یہی ایک بات ان کے انسان بننے میں آڑے آ گئی کیونکہ انسان کے لئے "کام کے واسطے، ہاتھوں کا آزاد ہونا ضروری ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بندر تھے جو اتنے پھرتیلے نہ تھے اور پیڑوں کے بود و باش کے لئے اپنے کو موزوں نہ بنا سکتے تھے۔ ان میں سب سے مضبوط اور بھاری قسم کے بندر زندہ رہ سکے لیکن جتنے ہی وہ بھاری تھے اتنا ہی ان کے لئے درختوں کا باسی بن کر رہنا مشکل تھا۔ اس طرح بڑے قسم کے بندروں کو

خوشی سے یا زبردستی پیڑ چھوڑ کر زمین پر ہی اُتر کر زندگی بسر کرنی پڑی۔
مثال کی طور پر گوریلے اب تک زمین پر یعنی جنگل کی سب سے نچلی منزل میں رہتے ہیں لیکن وہ دشمنوں سے اپنا بچاؤ پتھر یا لکڑی سے نہیں کرتے بلکہ اپنے مضبوط جبڑوں میں لگے ہوئے آگے کے بڑے بڑے دانتوں سے کرتے ہیں۔

اِس طرح انسان اور اس کے رشتہ دار الگ الگ راستوں پر ہو لیئے اور ان کے طور طریقے علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ انسان ان سب سے بہت زیادہ آگے نکل گیا اُس نے چلنا اور کام کرنا سیکھ لیا تھا اور اسی میں، آگے چل کر، اس کا سب سے زیادہ فائدہ تھا۔

درمیانی کڑی ——— جو غائب ہے

انسان نے دو پاؤں پر چلنا کچھ ایک دم سے نہیں سیکھ لیا۔ شروع شروع میں اس کی چال میں بڑی لڑکھڑاہٹ اور بھدا پن تھا۔ اپنی حیات کے اس دور میں انسان یا یوں کہیئے کہ وہ "بندر انسان" کیسا لگتا ہوگا؟

دُنیا میں کہیں اس "بندر انسان" کی زندہ مثال نہیں مل سکتی کیونکہ اِس کو انسان بنے بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن ممکن ہے کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں اس کی ہڈیاں پائی جائیں۔ اگر ہم ایسی ہڈیوں کو پا سکیں تو اس بات کا پختہ اور آخری ثبوت مل جائے گا کہ انسان بندر کی نسل سے ہے کیونکہ "بندر انسان" ہی وہ کڑی جس سے بندر اور انسان کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور یہی کڑی غائب ہے۔ ابھی تک، مٹی اور ریت کی گہری تہوں میں، یا پرانے دریاؤں کے کنارے کہیں بھی اس کا نشان نہیں مل سکا۔

آثارِ قدیمہ کے ماہرین زمین کو کھود تو سکتے ہیں مگر پہلے ان کو یہ بھی تو طے

کر لینا ہوتا ہے کہ کھدائی کہاں کی جائے اور اس کڑی کا جو غائب ہے، پتہ کس جگہ لگ سکتا ہے؟ آخر زمین تو اتنی بڑی ہے، اور اس کھوئی ہوئی کڑی کے لئے زمین کی سطح پر کہیں بھی کھودنا شروع کر دینا تو ایسا ہی ہے جیسے گھاس یا ریت کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے لگنا۔

پچھلی صدی کے آخر میں، ایک مشہور سائنس داں، ہیکل نے ایک فرضی دلیل اور تجویز یہ پیش کی کہ یہ ممکن ہے کہ اس بندر انسان کی، جسے سائنس کی زبان میں پائیتھیکینتھروپس کہتے ہیں، ہڈیاں جنوبی ایشیا میں پائی جائیں۔ اس نے نقشہ پر وہ جگہ بھی بتائی جہاں، اس کے خیال میں بندر انسان کی ہڈیاں ملنے کا امکان تھا۔ یہ جگہ جزائر سنڈا تھی۔

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی یہ تجویز محض خیالی ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں، لیکن ایک آدمی ایسا تھا جسے اس تجویز کے صحیح ہونے کا پختہ یقین ہو گیا اور اس نے اپنا کام کاج چھوڑ کر جزائر سنڈا جا کر اس درمیانی جانور کی ہڈیاں تلاش کرنے کی ٹھان لی۔ اس شخص کا نام ڈاکٹر یوجین دوبوئے تھا اور وہ امسٹرڈم یونیورسٹی میں سائنس کا طالب علم تھا۔

اس کے زیادہ تر ساتھیوں، یونیورسٹی کے پروفیسروں وغیرہ نے سر ہلا ہلا کر اپنی رائے کا اظہار کیا کہ کوئی بھی عقلِ سلیم رکھنے والا شخص ایسا کام نہ کریگا۔ کالج کے یہ متین اور سنجیدہ پروفیسر! انہوں نے تو اپنی عمر میں سب سے بڑا سفر یہی کیا تھا کہ امسٹرڈم کی پر سکون گلیوں میں سے ہوتے ہوئے چھتریاں گھماتے، یونیورسٹی چلے جائیں اور پھر وہاں سے واپس گھر آ جائیں۔

لیکن دوبوئے نے اپنا یونیورسٹی کا کام چھوڑ کر ہالینڈ کی نو آبادیات جانے والی فوج میں اپنا نام لکھوا لیا کہ اس طرح اپنا کام پورا کر سکے۔ اس نے ڈاکٹری

خدمات انجام دینے کا کام لے لیا اور اس طرح سات سمندر پار کر کے آخر جزائر سنڈا پہنچ ہی گیا!

دوبوئے نے سماترا پہنچتے ہی کام شروع کر دیا۔ اُس نے کچھ لوگوں کی ایک جماعت بنائی اور اپنی نگرانی میں کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے ریت کے پہاڑ کے پہاڑ کھود ڈالے اور تمام مٹی کو چھان مارا۔ ایک مہینہ گذرا، دو مہینے گذرے، تین مہینے گذرے لیکن بندر انسان کی ہڈیوں کا کہیں پتہ نہ تھا!

اگر آپ اپنی کوئی گم شدہ چیز تلاش کر رہے ہوں تو کم از کم آپ کو اتنا تو معلوم رہتا ہے کہ وہ چیز یہیں کہیں رکھی ہوگی اور اگر ہم برابر دھیان سے تلاش کریں گے تو مل ہی جائیگی لیکن دوبوئے کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ اُس کے پاس صرف اتنا ہی اتا پتہ تھا کہ اس بندر انسان کی ہڈیاں کہیں نہ کہیں ہیں ضرور اور بس۔ باایں ہمہ اُس نے برابر استقلال کے ساتھ جم کر کھدائی جاری رکھی۔ ایک سال گذرا، دو سال گذرے، تین سال گذرے اور پھر بھی ابتک وہ "غائب کڑی" نہیں ملی تھی!

اگر دوبوئے کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ضرور اس سعئی لاحاصل کو ختم کر دیتا۔ کیا عجب کہ خود دوبوئے کو بھی کبھی شبہ گذرتا ہو۔ جب وہ دریاؤں کے دلدلی کناروں اور سماترا کے گرم جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہوگا تو اسے امسٹرڈم کی پرسکون نہروں کے کنارے بنتے ہوئے ہرا سنے گھروں، کھلتے ہوئے لالہ کے باغ، اور اپنی لیبورٹری کی سفید، صاف شفاف دیواروں کی یاد ضرور آتی ہوگی۔

لیکن دوبوئے ایسا آدمی نہ تھا کہ کسی کام کو ایک مرتبہ شروع کر کے ادھورا چھوڑ دے۔ جب سماترا میں اُسے بندر انسان نہ مل سکا تو اس نے جزائر سنڈا کے ایک اور جزیرے جاوا میں اپنی قسمت کو آزمانے کی ٹھانی

اور یہاں قسمت نے اُس کا ساتھ دیا۔

کنڈنگ پہاڑ کے دامن میں، دریائے نبگوان کے کنارے اُسے بندر انسان دو دانت، ایک ران کی ہڈی اور کھوپڑی کا اوپری حصہ مِل گیا!

جب اُس نے اپنے جد کی صورت کو دیکھا اور اپنے تخیل سے یہ سوچنے کی کوشش کی اس کا ناک نقشہ کیسا رہا ہوگا تو اُس کے ذہن میں ایک آگے کو ڈھلوان پیشانی، اور چھجے سی بھویں، جن کے نیچے آنکھیں رہی ہونگی، آگئیں۔ یہ صورت انسان سے زیادہ بندر سے ملتی تھی لیکن جب اُس نے کھوپڑی کے اندر جھانک کر دیکھا تو اُسے یقین ہوگیا کہ انسانی قسم کا بندر، ہر قسم کے بندر سے زیادہ ذہین تھا۔ دماغ کا خانہ بندر کے دماغ کے خانے سے کہیں زیادہ بڑا تھا اور اس طرح یہ جانور انسان سے بہت زیادہ قریب تھا

کھوپڑی کا ایک ٹکڑا، دو دانت اور ایک ران کی ہڈی! یہ کچھ بہت زیادہ مصالحہ نہ تھا پھر بھی ان پر کافی غور کرنے کے بعد دوبوئے نے کئی حقیقتیں ثابت کر دیں۔ ران کی ہڈی اور اس پر جو کچھ گوشت کے برائے نام نشانات تھے ان کو دیکھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بندر انسان کسی قدر چلنا ضرور سیکھ چکا تھا مگر اُس نے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل چلنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اس طرح سے وہ آسانی سے خیال کر سکتا تھا کہ اُس کا جد کیسا لگتا ہوگا، کس طرح وہ جنگل میں پھرتا رہتا ہوگا، کمر سے جُھکا ہُوا گھٹنوں پر سے جُھکا ہُوا، اس کے لمبے لمبے بازو لٹکتے ہوئے اور اس کی جُھکی ہوئی ابروؤں کے نیچے اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں جو ہمیشہ غذا کی تلاش میں زمین کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔

یہ صورت بندر کی تو یقیناً نہیں ہو سکتی ہے لیکن ابھی آدمی کی بھی نہیں ہے۔ دوبوئے نے سوچا کہ اس کا کچھ نام رکھا جائے لہٰذا اُس نے اس کا نام "پائتھیکینتھروپس آرکٹس" رکھا جس کے معنی ہوتے ہیں "کھڑا پائتھیکینتھروپس" اور یہ نام مناسب بھی تھا کیونکہ بمقابلہ بندر کے یہ سیدھا ہو کر تو یقیناً چلتا پھرتا تھا۔

آپ سمجھے ہونگے کہ اب دوبوے کا کام ختم ہو گیا ہو گا کیونکہ اُس نے بندر انسان کو دریافت کر لیا لیکن یہ تو ابھی شروعات تھی۔ سب سے مشکل مرحلہ تو ابھی باقی تھا۔ زمین کی سخت اور گہری تہوں کو کھودنا تو پھر بھی آسان تھا لیکن اپنے ہم جنس انسانوں کے توہمات اور عقائد کی دیواروں کو توڑنا اُس سے کہیں زیادہ مشکل اور کٹھن تھا۔

دوبوئے کی اِس دریافت پر بڑا ہلڑ مچا اور وہ تمام لوگ جو اِس بات پر اڑے تھے کہ انسان کو بندر کی اولاد کبھی نہ مانیں گے اُس غریب پر اعتراضات لے کر پل پڑے بڑے بڑے جبّے اور فراک کوٹ پہنے ہوئے آثارِ قدیمہ کے ماہرین، یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دوبوئے کو جو کھوپڑی ملی تھی وہ ایک معمولی بندر کی ہے جو "گبن" کہلاتا ہے اور رہی ران کی ہڈی تو وہ کسی انسان ہی کی ہے۔

دوبوئے کے مخالف، دوبوئے کے اِس بندر انسان کو حسابی طور پر بندر اور انسان ثابت کرنے تک ہی نہیں رہے بلکہ انہوں نے اِس کی اِن دریافت کی ہوئی چیزوں کی قدامت پر بھی شک کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ ہڈیاں ہزاروں سال کے بجائے صرف چند ہی سال سے وہاں پڑی ہوئی تھیں۔

قصہ مختصر انہوں نے بندر انسان کو پھر سے دفنانا اور اُسے غائب غلّا کرنے کی انتہائی کوشش کی۔

دوبوئے نے نہایت مردانہ وار جواب دیئے اور اس لڑائی میں ایسے سب لوگوں نے، جو اس کی اِس دریافت کی سائنٹیفک اہمیت کو سمجھتے تھے، اس کا خوب ساتھ دیا۔

اپنے مخالفوں کا جواب دیتے ہوئے دوبوئے نے یہ ثابت کیا کہ یہ کھوپڑی گبن کی نہیں ہو سکتی کیونکہ گبن کی کھوپڑی میں آگے کو نکلی ہوئی بھوئیں نہیں ہوتیں اور بندر انسان میں ہوتی ہیں۔

لیکن اِن اعتراضات کا مکمل اور مُنہ توڑ جواب دینے کے لئے ایک مکمل کھوپڑی

حاصل ہونی چاہیئے تھی۔ اس لئے دریائے بینگوان کے کنارے کنارے تلاش برابر جاری رکھی گئی اور پانچ سال کے عرصہ میں تین سو بکس بھر کر مختلف قسم کے ایسے جانوروں کی ہڈیاں یورپ بھیجی گئیں۔ یہ ہڈیاں ایسے جانوروں کی تھیں جو تاریخ سے پہلے بھی پائے جاتے تھے اور اس دریا کے کنارے رہتے تھے۔ سائنس دانوں نے انہیں الگ الگ کر کے پہچاننا اور اُن پر غور کرنا شروع کیا لیکن ان ہزاروں ہڈیوں میں انہیں صرف تین ہڈیاں ایسی ملیں جو بندر انسان کی ہو سکتی تھیں۔ یہ ران کی ہڈی کے تین ٹکڑے تھے۔

کئی سال گذر گئے اور لوگوں کو بندر انسان کے وجود کے متعلق شبہ ہی رہا۔ یکایک ایک سائنس دان نے اس زنجیر کی ایک اور کڑی دریافت کر لی یعنی وہ جو بندر انسان اور آدمی کے درمیان تھی۔

آج سے چالیس سال قبل یہ سائنس دان چین میں پیکنگ شہر کے ایک چینی دواخانہ میں کوئی خاص دوا تلاش کرتا ہوا پہنچا۔ دکان میں بہت سی طرح طرح کی عجیب غریب قسم کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک پیڑ کی جڑ جو انسانی کھوپڑی سے بہت ملتی جلتی تھی اور جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ بیماریوں کے لئے فائدہ مند ہے بہت سی مختلف جانوروں کی ہڈیاں اور دانت طرح طرح کے جادو ٹونے ٹوٹکے وغیرہ

ان ہڈیوں میں اُس سائنسدان کو ایک دانت دکھائی پڑا جو ظاہری طور پر کسی جانور کا نہیں تھا لیکن موجودہ انسان کے دانت سے بھی بالکل مختلف تھا۔ اُس نے یہ دانت خرید لیا اور اُسے یورپ کے ایک عجائب خانے میں بھیج دیا جہاں اُسے بڑی احتیاط سے "چینی دانت" سمجھ کر رکھ لیا گیا۔

اس واقعہ کے کوئی بیس سال بعد اسی طرح کے دو اور دانت اتفاقیہ طور پر پیکنگ ہی کے قریب ایک کھوہ میں جس کا نام چاؤ کاتن تھا، پائے گئے اور اس طرح جس شخص کا یہ دانت ہو گا اس کا نام سینا تھروپس رکھا گیا۔

واقعہ تو یوں ہے کہ اگرچہ سائنس دان اُسے مکمل طور پر نہیں دیکھ سکے لیکن انہوں نے مختلف ہڈیوں کے ذریعہ اس کا اندازہ لگالیا۔ اب ان کے پاس پچاس دانت، تین کھوپڑیاں، گیارہ جبڑے کی ہڈیاں، ایک ران کی ہڈی، ایک ریڑھ کی ہڈی کا ٹکڑا، ایک کلائی کی ہڈی اور ایک ٹکڑا پاؤں کی ہڈی موجود تھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کھوؤں اور غاروں کے اس باسی کے تین سر اور ایک ٹانگ تھی! بلکہ اس کی ایک آسان تشریح ہے اور وہ یہ کہ ان غاروں میں رہنے والا صرف ایک نہیں بلکہ کئی کئی آدمی ہوا کرتے تھے۔ ان لاکھوں سالوں میں زیادہ تر ہڈیاں کھوئی گئیں ممکن ہے جنگلی جانور اُٹھا لے گئے ہوں لیکن جو کچھ بھی ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں ان کے ذریعہ یہ خیال کرنا آسان ہے کہ غاروں کے یہ رہنے والے دیکھنے میں کیسے ہوا کرتے تھے

اچھا تو اپنی زندگی کے اس قدیم، بہت ہی قدیم دور میں ہمارا ہیرو کیسا لگتا تھا؟

یہ ماننا پڑے گا کہ وہ کچھ بہت خوبصورت نہیں تھا۔

اگر کہیں آپ کی اس سے مڈبھیڑ ہو جائے تو آپ ضرور ڈر کے مارے بھاگ نکلیں گے چہرہ آگے کو نکلا ہوا، لمبے لمبے بال لہراتے لٹکتے ہوئے، اس ہیئت کذائی میں وہ بہت کچھ بندر کے مانند معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ نے اُسے بندر سمجھا ہے تو آپ جلد ہی اپنا خیال بدل دیں گے کیونکہ کوئی بندر اس طرح سیدھا ہو کر آدمی کی طرح نہیں چلتا اور اگر کہیں آپ سائنسداں کی طرح کے پیچھے پیچھے اس کے غار تک چلے جائیں تو پھر شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

وہ اپنے ٹیڑھے میڑھے پیروں پر کھڑا، بھدی چال چلتا ہوا چلا جا رہا ہے یکایک وہ ریت میں بیٹھ جاتا ہے۔ ایک بڑے سے پتھر پر اس کی نظر پڑ گئی ہے۔ وہ پتھر کو اٹھاتا ہے، اُسے غور سے دیکھتا ہے اور دوسرے پتھر پر مارتا ہے۔ پھر وہ اُٹھتا ہے اور اپنی اس نئی دریافت کو ساتھ لے کر آگے چل کھڑا ہوتا ہے۔

اس کے پیچھے پیچھے چل کر آپ ایک اونچے سے مقام پر پہنچتے ہیں، وہاں اس اونچی سی جگہ پر، غار کے منہ کے آگے، اس کے سامنے کچھ اور لوگ جمع ہیں۔ یہ غار کے دوسرے رہنے والے ہیں۔ ایک ریشہ دار بوڑھا جس کے تمام جسم پر بال ہیں، ہاتھ میں پتھر کا ایک اوزار لئے، ہرن کا پیٹ چیر رہا ہے۔ عورتیں ادھر ادھر کھڑی ہاتھوں سے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہیں، بچے ضد کر کر کے گوشت کے ٹکڑے مانگ رہے ہیں اور اس تمام منظر پر اس آگ کی روشنی پڑ رہی ہے جو اندر غار میں جل رہی ہے۔

اب آپ کا تمام شک و شبہ دور ہو جائیگا کیونکہ کیا کبھی ایسے بندر بھی ہوئے ہیں جنہوں نے آگ جلائی ہو یا پتھر سے اوزار بنائے ہوں۔

لیکن آپ سوال کر سکتے ہیں اور یہ سوال صحیح بھی ہوگا کہ "بھلا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سائنانتھروپس اوزار بنا سکتا تھا یا آگ کا استعمال جانتا تھا"

لیکن وہ غار جس کا نام چاؤ کاؤ ٹائن ہے، وہ بجائے خود اس سوال کا جواب ہے۔ تحقیق کے دوران میں، ہڈیوں کے علاوہ اس میں اور بہت سی چیزیں بھی ملی تھیں۔ راکھ کی ایک موٹی تہہ جس میں کسی قدر ریت مل گئی تھی اور بہت سے پتھر کے کھردرے اوزار۔ دو ہزار سے زائد اس قسم کے اوزار پائے گئے اور راکھ کی تہہ تقریباً تئیس انچ موٹی تھی۔

اب اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سائنانتھروپس قبیلے کے لوگ عرصہ دراز تک اس غار میں رہے ہوں گے اور انہوں نے آگ بھی برسوں تک برابر جلائی ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ ان کو اس وقت آگ جلانے کا فن نہ آیا ہو بلکہ کہیں سے لے آتے ہوں جیسے وہ کھانے کے لئے جڑیں اور اوزار بنانے کے لئے پتھر ڈھونڈ لایا کرتے تھے۔ جنگل میں جہاں کہیں بھی آگ جلتی پاتے ہوں وہاں سے کچھ سلگتی ہوئی لکڑیاں گھر لے آتے ہوں اور پھر اسے اپنی غار میں ہوا اور پانی سے بچا کر اور اپنا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھ کر رکھتے ہوں۔

تیسرا باب

ہاتھوں کے نشانات

انسان قانون توڑنے لگا

جس لحظہ ہمارے ہیرو نے پتھر یا لکڑی ہاتھ میں اٹھائی اُسی وقت سے وہ زیادہ طاقتور اور آزاد ہو گیا۔ اب اُسے اس کی فکر نہ تھی کہ آیا جن پھلوں اور سبزیات کی اُسے ضرورت تھی اُن تک اس کا ہاتھ پہنچ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اب وہ غذا کی تلاش میں اپنے پاس پڑوس سے بھی آگے جا سکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی دُنیا پار کر کے دوسری میں پہنچ سکتا تھا اور کھلے میدانوں میں کچھ دیر قیام کر سکتا تھا۔ جنگل کے قوانین توڑ کر وہ دوسرے جانوروں سے ایسی غذا چھین لیتا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔

اِس طرح سفرِ زندگی کے اوائل ہی سے انسان اُن قانونوں کو توڑتا آیا ہے جو اُس کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ انسان ہمیشہ سے قانون شکن رہا ہے۔ سب سے پہلے یہ پیڑوں کا باسی پیڑوں سے اُتر کر زمین پر چلنا سیکھتا ہے پھر وہ اپنے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایسے چلنے لگتا ہے جس کے لئے قدرت نے اس کو بنایا ہی نہیں تھا لیکن وہ اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ ایسی چیزیں کھانے لگتا ہے جو اس کے لئے نہیں تھیں اور اپنی غذا بھی انوکھے طریقوں سے حاصل کرنے لگتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ جرأت کی بات یہ ہے کہ وہ "غذائی زنجیر" سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے اور نہ صرف یہ کہ خود دوسری غذائیں کھانے لگتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی تیز دانتوں والے شیر کی غذا بننے دینے سے محفوظ کر لیتا ہے حالانکہ شیر ہمیشہ سے اس کے آباؤ اجداد کو کھاتا آیا ہے۔

اُسے ایسا کرنے کی جرأت اور ہمت کیسے ہوئی ؟

اُس نے پیڑ سے زمین پر اُتر آنے کی کس طرح ٹھانی، جبکہ نیچے جنگلی درندے اس کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ تو ویسا ہی ہُوا کہ ایک غضبناک خونخوار کتا نیچے بیٹھا ہو اور بلی درخت سے اُتر آئے!

انسان میں یہ بہادری اُس کے اپنے ہاتھوں کے بل پر پیدا ہوئی اُس نے غذا حاصل کرنے کے لئے جو پتھر اُٹھایا اور جو لکڑی سنبھالی، وہی اس کی حفاظت اور مدافعت کا ذریعہ بنی۔ یہی چیزیں انسان کے پہلے اوزار اس کے پہلے اسلحے بھی بن گئے۔

علاوہ اس کے یہ بات بھی تھی کہ وہ جنگل میں کبھی اکیلا نہ نکلتا تھا ایک غول کا غول ساتھ نکلتا تھا اور وہ سب پتھروں اور لاٹھیوں سے مسلح ہوتے تھے اور اس طرح مل کر جنگلی جانور کو دور رکھتے تھے۔

فرض کیجئے درخت پر بہت سی بلیاں بیٹھی ہوں، نیچے کتا ان کی گھات لگائے ہو لیکن اگر بلیوں کے پاس بھی پتھر اور لاٹھیاں ہوں تو ممکن ہے بلیاں درخت سے نیچے اُتر کر خونخوار ترین کتے کا بھی مقابلہ کر بیٹھیں!

اور پھر آگ بھی تو تھی! آگ کو نظر انداز نہ کیجئے گا۔ آگ کے ذریعہ انسان خطرناک سے خطرناک درندے کو بھی ڈرا کر بھگا سکتا تھا!!

ہاتھوں کے نشانات

جب انسان نے ایک مرتبہ اُن زنجیروں کو توڑ دیا جن کے ذریعہ وہ درختوں سے بندھا تھا تو پھر اس کے لئے راستہ صاف تھا۔ وہ پیڑوں کی چوٹی سے زمین پر اُتر آیا اور جنگلوں سے ہوتا ہُوا دریاؤں کی وادیوں تک پہنچ گیا۔

آپ پوچھیں گے کہ بھلا ہمیں یہ کیسے معلوم ہُوا کہ وہ وادیوں میں پہنچا تو یہ پتہ

ہم کو نشانات کے ذریعہ چلا۔

لیکن ان ہزار ہا سال تک یہ نشانات قائم کیسے رہے؟ نشانات سے ہمارا مطلب یہاں نقشِ قدم نہیں ہے بلکہ ہاتھوں کے نشانات ہیں۔

آج سے سو سال پہلے فرانس میں، دریائے سوم کی وادی میں کچھ مزدور کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ وہ اس ریت چونے اور پتھروں کو کھود رہے تھے جو قدیم زمانہ میں دریا کے بہاؤ کی وجہ سے جم گئے تھے۔

موجودہ زمانے سے بہت پہلے، بہت ہی پہلے کی بات ہے کہ دریا سوم بہت کم عمر تھی اور اس نے پہلے پہل دنیا میں اپنے لئے راستہ کاٹا تھا۔ اس وقت اس دریا کا بہاؤ بہت ہی تند و تیز تھا اور بڑے بڑے پتھروں اور وہ چٹانوں کو اپنے ساتھ بہا لیجایا کرتا تھا جب یہ پتھر اس کے دھاروں میں بہتے تھے تو آپس میں ٹکرا کر چکنے ہوتے جاتے تھے یہ دریا ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بھی توڑ دیتا تھا اور پھر یہ ٹکڑے گول گول چکنے چکنے روڑے سے بن جاتے تھے۔ بہت عرصہ بعد جب دریا کی یہ تیزی اور تندی کم ہوئی اور وہ ذرا پرسکون ہو گیا تو ان روڑوں اور پتھروں پر ریت اور مٹی جمنے لگی

اور اسی ریت اور مٹی کے درمیان یہ مزدور کھدائی کر کے چٹان نکال رہے تھے کہ یکایک انہوں نے ایک بڑی عجیب سی بات دیکھی کچھ پتھر ایسے بھی تھے جو چکنے نہ تھے بلکہ دونوں طرف سے کھردرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے ان کو دونوں طرف سے رگڑا ہو، ایسی صورت ان پتھروں نے کہاں سے اور کیسے اختیار کی؟ یہ کام دریا کا تو ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ دریا ہمیشہ پتھروں کو چکنا کر دیتا ہے۔

ان عجیب و غریب شکل کے پتھروں پر وہیں کے رہنے والے ایک شخص کی نگاہ پڑی۔ اس شخص کا نام باؤچر دی پرتھیس تھا اور وہ سائنس داں بھی تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایسی بہت سی قدیم چیزیں اکٹھی کی تھیں جو وقتاً فوقتاً دریائے سوم کے

کنارے ملتی رہی تھیں۔ ان میں گینڈوں کے سینگ، بڑے ہاتھیوں کے دانت، غار میں رہنے والے ریچھوں کی کھوپڑیاں وغیرہ تھیں۔ اس کے نزدیک ان چیزوں کی بہت قیمت تھی اور وہ ان کے ذریعہ اُن مہیب جانوروں کے متعلق تحقیقات کر رہا تھا جو اُس قدیم زمانے میں دریائے سوم کے کنارے پانی پینے آیا کرتے تھے، جیسے آج دریاؤں کے کنارے بھیڑیں یا بطخیں آیا کرتی ہیں۔

لیکن قدیم انسان کہاں تھا؟

پرتھیس کو اس کی ہڈیوں کا ابھی تک کہیں سے پتہ نہ چل سکا تھا۔

اور پھر یہ عجیب و غریب پتھر ان کھدائی کرنے والوں کے ذریعہ اس کے ہاتھ لگے۔ ان پتھروں کو اس طرح، دونوں طرف کس نے رندا ہوگا؟ پرتھیس نے فوراً اندازہ لگا کر لیا کہ اس کا امکان صرف یہ ہے کہ یہ انسانی ہاتھوں کی کارروائی ہوگی۔

یہ سچ ہے کہ خود قدیم انسان کے کوئی آثار وہاں نہیں تھے لیکن اُس کے نشانات ضرور تھے اور نشانات بھی اُن کاموں کے جو وہ کرتا تھا۔ پرتھیس اپنی اس نئی دریافت پر اچھل پڑا اور پھولا نہ سماتا تھا۔ یقیناً یہ کام دریا کا نہیں بلکہ آدمی کے ہاتھوں کا تھا چنانچہ پرتھیس نے اپنی ان دریافتوں کے متعلق ایک کتاب لکھی اور بڑی جرأت کے ساتھ اُس کا یہ نام رکھا،

"تخلیق کے متعلق جانداروں کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں ایک رسالہ"

اور پھر شروع ہوئی لڑائی! دولبے کی طرح پرتھیس پر بھی چاروں طرف سے حملے ہونے لگے۔ آثارِ قدیمہ کے مشہور ماہرین نے یہ ثابت کرنا اپنا فرض سمجھ لیا کہ یہ ناتجربہ کار صوبائی ماہر سائنس سائنس کی معلومات ہرگز نہیں رکھتا ہے! اُس کی یہ پتھر کی کلہاڑیاں وغیرہ سب ڈھونگ ہیں اور اس کی کتاب کو قانونی طور پر ممنوع کیا جائے کیونکہ اُس میں لکھی ہوئی باتیں ان تمام نظریوں کے خلاف تھیں جو انسان کی

تخلیق کے متعلق مقدس گرجاؤں اور کلیساؤں (یعنی عیسائی مذہب نے) قائم کیے تھے۔

پندرہ سال تک پرتھیس اور اس کے مخالف برابر لڑتے رہے پرتھیس بوڑھا ہوگیا، اس کے بالوں پر سفیدی چھاگئی مگر وہ برابر لڑتا رہا اور اُس نے دُنیا میں نسلِ انسانی کی تخلیق کی جنگ برابر جاری رکھی۔ اپنی پہلی کتاب کے تھوڑے ہی عرصے بعد اُس نے ایک اور کتاب لکھی اور پھر ایک تیسری اور لکھ ڈالی!

یہ سچ ہے کہ اسے بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر میں جیت اُسی کی ہوئی۔ دو ماہرین ارضیات جن کا نام لائل اور پریسٹوچ تھا، اس کی مدد کو آپہنچے۔ وہ بذات خود دریائے سوم کی وادی میں پہنچے بچشم خود اُن اوزاروں کو دیکھا، پرتھیس نے جو چیزیں جمع کی تھیں اُن کا جائزہ لیا، دیکھا بھالا اور بہت غور سے اُن کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ پرتھیس کے جو چیزیں تھیں وہ یقیناً خالصتاً اُس قدیم انسان کا پتہ دیتی تھیں جو گینڈوں اور بڑے وحشی ہاتھیوں کے زمانہ میں رہتا تھا۔

اس کے بعد لائل نے ایک کتاب لکھی "تخلیق انسانی کے ریاضیاتی آثار" اس کتاب نے پرتھیس کے تمام مخالفوں کا مُنہ بند کر دیا اور وہ سب کے سب کہنے لگے کہ بھئی آخر پرتھیس نے بھی کوئی خاص نئی بات تو نہیں دریافت کی۔ انسان کے ایسے اوزار اور آثار تو پہلے بھی پائے جاتے تھے۔

اس کے جواب میں لائل نے اُن کا خوب مذاق اُڑایا اور فوراً جواب دیا کہ ہاں یہ تو ہے ہی۔ جب کبھی کوئی نئی سائنٹیفک دریافت ہوتی ہے تو پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مذہب کے خلاف ہے اور پھر یہ بیان ہوتا ہے کہ "یہ بات تو سب کو پہلے ہی سے معلوم تھی"

پرتھیس کی اس دریافت کے بعد اس طرح کے پتھر کے اوزار اور بھی ملتے رہے زیادہ تر یہ اوزار دریاؤں کے کنارے پائے جاتے ہیں جہاں سے کنکر اور مٹی لینے کے لئے کھدائی وغیرہ کی جاتی ہے۔

اور اس طرح موجودہ انسان کو کدال زمین کی تہہ تک پہنچ کر ان اوزاروں سے ٹکر کھاتی ہے جن سے انسان نے پہلے پہل کام کرنا سیکھا تھا۔

ان پتھریلے اوزاروں میں سب سے قدیم وہ ہیں جو دونوں طرف سے کسی اور پتھر کے ذریعہ رہیتے گئے ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ پتھر کے چھوٹے ٹکڑے اور پرزے بھی ملتے ہیں جو ان اوزاروں کو رہیتنے اور چھیلنے کے وقت ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔

جب ہم نے ہاتھوں کے نشان کا ذکر کیا تھا تو ہماری مراد ان پتھر کے اوزاروں ہی سے تھی کیونکہ ان ہی کی تلاش میں ہم دریائی وادیوں اور غاروں میں بھی پہنچتے ہیں اور ان ہی دریاؤں کی وادیوں اور کھوؤں میں انسان ان چیزوں کی تلاش میں پہنچا تھا۔ جو اس کے لئے دانتوں اور پنجوں کا کام دیتی تھیں۔

ان چیزوں کو تلاش کرنا ہی بجائے خود ایک فعل انسانی تھا۔ جانور اپنے کھانے کی غذا اور اپنے گھونسلے اور بسیرے کے لئے سامان ضرور ڈھونڈتے ہیں لیکن آپ کبھی کسی جانور کو ایسی چیزوں کی تلاش کرتے نہ پائیں گے جن سے وہ اپنے لئے مصنوعی دانت یا مصنوعی پنجے بھی فراہم کر سکے

زندہ کدال اور زندہ گھڑا

ہم سبھوں نے ایسے جانوروں کے متعلق سنا ہے جو بڑے کاریگر ہوتے ہیں۔ ایسے جانور جو معمار بھی ہوتے ہیں، بڑھئی بھی ہوتے ہیں، جلاہے بھی ہوتے ہیں اور یہاں تک کہ درزی بھی ہوتے ہیں۔

مثال کی طور پر ہم کو یہ معلوم ہے کہ اُود بلاؤ اپنے تیز چھری ایسے دانتوں سے کتر کتر کر درخت تک گرا دیتا ہے جیسے یہ کام کسی لکڑہارے نے کیا ہو اور کس طرح دریا میں ان درختوں اور ڈالیوں کو گرا کر وہ اپنے لئے پل کی طرح بنا لیتے ہیں اور پھر

This book is very interesting for them who will study of it.
23.10.57.

یہ دریا ان کے لئے تالاب کا کام دیتا ہے۔

اور وہ لال چیونٹی جو اس قدر معمولی ہے! ذرا چیونٹیوں کے بل کو لکڑی سے کھودئیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ زمین کے نیچے تو انہوں نے اپنے لئے ایک پورا شہر کا شہر بنا رکھا ہے

اور اب آپ پوچھ سکتے ہیں کہ "کیا یہ ممکن ہے کہ کبھی اُور بلاؤ اور چیونٹیاں بھی ترقی کی اس دوڑ میں انسان کو پکڑ پائیں گی یعنی اگر انسان نے ان کے تعمیرات کو برباد نہ کر دیا؟ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دس لاکھ سال بعد چیونٹیاں بھی اخبار پڑھتی، فیکٹریوں میں کام کرتی، ہوائی جہاز چلاتی اور ان چیونٹیوں کی تقریریں سنتی نظر آئیں گی جو ریڈیو پر بڑے دھڑلے سے تقریر کرتی ہوں گی"؟

نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر دس لاکھ کیا، ایک کروڑ برس بھی گزر جائیں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپ غور کیجئے تو انسان اور چیونٹی میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔

وہ فرق کیا ہے؟

شاید وہ یہ فرق ہے کہ انسان جسامت میں چیونٹی سے بڑا ہے؟

نہیں!

تو پھر شاید یہ فرق ہوگا کہ چیونٹی کی چھ ٹانگیں ہیں اور انسان کی صرف دو!

نہیں۔ ہمارا مطلب اس قسم کے فرق سے تو ہے ہی نہیں۔

انسان کام کیسے کرتا ہے؟ وہ صرف اپنے ننگے ہاتھوں یا دانتوں سے کام نہیں کرتا۔ وہ کام کے لئے کلہاڑی، کدال، ہتھوڑا استعمال کرتا ہے۔ جب چیونٹی کسی چیز کے دو ٹکڑے کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنے سر پر لگی ہوئی قینچی کو استعمال کرتی ہے جب اُسے نہر کھودنی ہوتی ہے تو وہ زندہ کدالوں سے کام لیتی ہے یعنی اپنے چھ پیروں میں سے چار استعمال کرتی ہے۔ وہ اپنے دونوں اگلے پیروں سے مٹی کھودتی جاتی ہے اور دونوں پچھلے پیروں سے مٹی الگ کرتی جاتی ہے اور اس کام کے دوران

بیں بیچ کی دونوں ٹانگوں پر خود سنبھلی کھڑی رہتی ہے۔

یہاں تک کہ چیونٹیوں کے پاس جو برتن ہوتے ہیں وہ بھی جاندار ہوتے ہیں ایک خاص قسم کی چیونٹی پائی جاتی ہے جس کے گھر میں زندہ گھڑوں سے بھرے ہوئے گودام کے گودام ہوتے ہیں۔ اِن کے اِن اندھیرے گوداموں میں گھڑوں کی قطاریں ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی لٹکی ہوتی ہیں اور بالکل بے حس و حرکت رہتی ہیں۔ دیکھنے میں یہ بھی اوروں کے مانند ہوتی ہیں لیکن جب کوئی اور چیونٹی اس گودام میں داخل ہو تو ذرا دھیان سے دیکھئے! وہ ایک گھڑے کے پاس جاتی ہے، اپنی مونچھوں سے اس کو ٹھیس لگاتی ہے اور پھر وہ گھڑا حرکت کرنے لگتا ہے۔ یہ راز کھلتا ہے کہ گھڑے کے تو سر بھی ہے، سینہ بھی ہے، پاؤں بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گھڑا تو ایک چیونٹی کا پیٹ ہے جو چھت میں لٹکی ہوئی ہے وہ اپنا دہانہ کھولتی ہے اور اس کے مُنہ میں سے ایک بوند شہد ٹپک جاتا ہے۔ وہ مزدور چیونٹی، جو کھا پی کر اپنی تھکن دور کرنے آئی تھی، جلدی سے شہد چاٹ کر اپنے کام پر واپس چلی جاتی ہے، اور یہ گھڑا چیونٹی پھر سے دوسرے گھڑوں کے درمیان بے حس و حرکت لٹک جاتی ہے۔

چیونٹیوں کے یہاں اس قسم کے "زندہ" سامان پائے جاتے ہیں۔ ان کے اوزار اور ان کے برتن، انسان کے سامان کی طرح، بنائے ہوئے نہیں ہوتے وہ قدرتی طور پر بنے ہوئے ہوتے ہیں اور اُن سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔

اُود بلاؤ کے اوزار بھی اسی طرح زندہ اور جاندار ہوتے ہیں۔ وہ درخت کو کلہاڑی سے نہیں بلکہ اپنے دانتوں ہی سے کاٹتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُود بلاؤ ہو یا چیونٹی اپنا سامان بناتے نہیں ہیں بلکہ ان کے اوزاروں کا سِٹ ان کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے

سرسری طور پر دیکھا جائے تو یہ بات فائدے مند معلوم ہوتی ہے کہ بھی اس طرح کے جاندار سامان اور اوزار کے گم ہونے کا اندیشہ نہیں ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اوزار اتنا اچھا نہیں ہے۔ نہ تو آپ اس کو کچھ بہتر بنا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی مرمت کی جاسکتی ہے۔

اُود بلاؤ کے لئے یہ بھلا کب ممکن ہے کہ اگر اس کے دانت گوٹھل ہو جائیں تو وہ انہیں کسی مشینری کی دکان میں لے جاکر پھر سے تیز کروالائے۔ اسی طرح چیونٹی کسی گودام کو یہ حکم نہیں دے سکتی کہ ہمارے لئے ایک عدد نئی کدال بھیجدو تاکہ مٹی زیادہ تیزی سے اور اچھی طرح کھودی جاسکے۔

انسان نے کدال سے ہاتھوں کا کام لیا

فرض کیجئے دوسرے جانوروں کی طرح، انسان بھی لکڑی، لوہے اور فولاد کے اوزاروں کے بجائے جاندار اوزار استعمال کرتا۔ ایسی صورت میں نہ تو اسے نئے اوزار مل سکتے اور نہ ہی وہ اپنے پرانے اوزار کسی کو دے سکتا۔ اگر اسے کھودنے کی ضرورت ہوتی تو پھر وہ کدال کا سا ہاتھ لے کر پیدا ہوتا۔

یہ خیال کیسا مجنونانہ ہے لیکن بفرضِ محال اگر ہم یہ خیال کر بھی لیں کہ اس طرح کا عجیب الخلقت انسان پیدا ہو سکتا ہے تو یقیناً وہ کھدائی تو بہت اچھی کر سکے گا لیکن اپنا یہ ہنر کسی اور کو نہیں سکھا سکے گا۔ چاہے اس کی نظر کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو وہ اس ہنر کو کسی اور تک نہیں پہنچا سکتا۔ تمام وقت اُسے اپنا کدال نما ہاتھ اپنے ساتھ ہی لے کر گھومنا پڑے گا اور یہ ہاتھ کھدائی کے سوا اور کسی کام کا نہ ہوگا اور جب وہ مرے گا تو کدال بھی اس کے ساتھ ہی مر جائے گا۔ یہ قدرتی مزدور صرف ایک ہی طریقے سے اپنا یہ ہنر آئندہ نسلوں تک پہنچا سکتا اور وہ ہے پیدائشی وراثت۔ یعنی اس کے پوتے

اور پر پوتے بھی اُس ہی کی طرح کدال نما ہاتھ لے کر پیدا ہوں۔ جیسے لوگوں کی ناکیں یا بال اپنے ماں باپ کی سی ہوتی ہے۔

اور اس کی صرف یہی ایک خرابی نہیں ہے۔ جاندار اوزار پیدائشی وراثت میں بھی صرف اُسی صورت میں ملتے ہیں جبکہ وہ اُس جانور کے لئے مُضر نہ ہوں بلکہ مفید ہوں اور اس کے کام آسکیں۔ اگر انسان زمین کے نیچے کا رہنے والا ہوتو کدال کے قسم کے ہاتھ کام بھی آتے لیکن ایک ایسے جاندار کے لئے جو سطح زمین کے اوپر زندگی بسر کرتا ہے ایسے ہاتھ اور پنجے ایک بے کار کا تکلف بن جاتے۔

اب آپ نے دیکھا کہ اگر کوئی اوزار بنانے کے بجائے نیا جاندار اوزار حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کتنی شرائط ہیں۔

یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ انسان نے ایک بالکل دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ اُس نے اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ اس کے ایک کدال نما ہاتھ پیدا ہو بلکہ اُس نے اپنے لیے ایک کدال بنالی اور صرف کدال ہی نہیں بنائی بلکہ چھُری بھی اور کلہاڑی بھی اور بھی بہت سے اوزار بنا لئے۔

اپنی دس انگلیوں اور بتیس دانتوں پر، جو اس نے اپنے آباواجداد سے وراثت سے حاصل کئے تھے، اُس نے ہزاروں اور لمبے اور چھوٹے، موٹے اور پتلے، تیز اور کُند، کاٹنے پیٹنے اٹھانے کے اوزار اضافہ کر لئے۔ اور اس طرح بہت سی انگلیاں، بہت سے دانت، پنجے اور مٹھیاں حاصل کر لیں۔

اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس تیزی سے آگے بڑھ گیا کہ اور جانوروں کے لئے اس کو جا لینا ناممکن ہوگیا۔

انسان اور دریا دونوں نے اوزار بنائے

جب شروع میں انسان نے انسان بننا شروع کیا تھا تو وہ اپنے اوزار بنانا نہیں تھا بلکہ اپنے ان پتھریلے دانتوں اور پنجوں کو وہ اس طرح ڈھونڈا کرتا تھا جیسے ہم لوگ آج کل سانپ کی چھتریاں یا بیر بہوٹیاں ڈھونڈا کرتے ہیں۔ عرصہ دراز تک انسان پہلے چشموں کے حصوں کے کنارے ایسے پتھر ڈھونڈا کرتا تھا جن کو قدرت نے چکنا چپٹا کر کے کام کے لائق بنا دیا ہو۔

یہ تیز نکیلے پتھر عموماً ایسی جگہ ملا کرتے تھے جہاں سے کوئی چشمہ بڑی تیزی اور تندی سے پتھروں کو آپس میں بڑی زور زور سے ٹکرا دیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ دریا کو بھلا اس کی کیا پڑی تھی کہ وہ جو چیزیں بنا رہا ہے وہ کسی کے کام آئیں گی؟ لہٰذا قدرت کے ڈھائے ہوئے سینکڑوں پتھروں میں سے صرف چند ہی انسان کے کام کے لائق نکلتے تھے۔

چنانچہ انسان نے خود اپنی مرضی کے موافق اپنے مطلب کے پتھریلے اوزار بنانے شروع کئے۔ انسانیت کی تاریخ کے ارتقا میں ایسا بہت ہوا ہے کہ انسان نے قدرت کی بنی بنائی چیزوں کے مطابق اپنے لئے خود چیزیں بنانی شروع کر دیں اور قدرت کے زبردست کارخانے کے بغل ہی میں اس نے بھی اپنی چھوٹی سی دکان کھڑی کر لی اور نئی چیزیں تیار کرنے لگا۔

پتھر کے اوزاروں کا بھی کچھ ایسا ہی حساب رہا اور پھر بعد میں ہزارہا سال بعد میں لوہے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پکا فولاد استعمال کرنے کے بجائے آدمی نے کچے لوہے سے فولاد نکالنا شروع کیا کیونکہ فولاد یوں ہی ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اور جب جب انسان نے قدرت کے خزانہ سے کوئی چیز حاصل کر کے اس سے خود ساختہ چیزیں بنائیں تو ہر ہر قدم پر وہ قدرت کے سخت قوانین اور ضوابط سے اپنے آپ کو آزاد کرتا گیا۔

سب سے پہلے اسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ کس مسالے سے اپنے اوزار بنائے اور

ایسی صورت میں قدرت کے جو کچھ بن بنائے پتھر مل جاتی تھیں اُن ہی کو کچھ نہ کچھ نئی شکل میں توڑ مروڑ کر اپنا کام چلاتا تھا۔

وہ ایک پتھر اُٹھاتا اور دوسرے پتھر سے مار مار کر اسے سجل اور برابر کرتا۔ اُس کا پہلا اوزار بڑا بھدا سا تھا بس یوں سمجھ لیجئے جیسے کوئی کلہاڑا یا بھدا سا چھرا۔ یہ اوزار لکڑی کاٹنے کے لئے اچھا تھا۔ پتھر کے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی کاٹنے چھیلنے اور سوراخ کرنے کے کام میں آسکتے تھے۔

ان میں سے قدیم ترین اوزار، جو گہری زمین میں دفن ملتے ہیں، وہ قدرت کے سجل کئے ہوئے پتھروں سے اس قدر مشابہت رکھتے ہیں کہ پہچاننا بھی مشکل ہے کہ یہ کام انسان کا ہے یا قدرت کا!

لیکن اور اوزار ایسے پائے جاتے ہیں جن کے متعلق قطعی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ پرانے دریاؤں اور چشموں کے پایاب مقامات پر جہاں تحقیقات کی گئی تو مٹی اور ریت کی دبیز تہوں کے اندر کھودنے پر قدیم انسان کے پورے کے پورے کارخانے دریافت ہوئے ہیں جن میں بہت سی کلہاڑیوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے اوزار کا کام لیا جاتا تھا اگر آپ ان ٹکڑوں میں سے کسی کو بغور دیکھیں تو آپ کو بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اُسے تیز کرنے کے لئے ٹھیک کس جگہ چوٹ ماری گئی تھی اور اُسے کار آمد اوزار بنانے کے لئے کس جگہ سے گھسا گیا تھا۔

ایسے اوزار آپ کو قدرت کے کارخانے میں کہیں نہ ملیں گے۔ یہ صرف انسان ہی بنا سکتا ہے۔

اور یہ معلوم کرنا بھی آسان ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ قدرت کے تمام کام خود بخود ہوتے رہتے ہیں۔ نہ اُن کاموں میں کوئی نظم ہوتا ہے نہ مقصد۔ دریاؤں کی لہریں اور بھنوریں یوں ہی بغیر سوچے سمجھے پتھروں کو رگڑتے رہتے ہیں۔

انسان نے بھی وہی کام کئے لیکن اُس نے جانتے اور سمجھتے ہوئے کئے اور اپنے سامنے ایک مقصد رکھکر کئے اور اِس طرح سے مقصد کو سامنے رکھکر منظم طریقے پر کام کرنے کی بنیاد پڑی۔

اِنسان نے رفتہ رفتہ قدرت میں ترقی اور اضافہ کر کر کے اسے پیچھے چھوڑنا شروع کیا چنانچہ اُس نے قدرت کے عطا کئے ہوئے پنجوں کی بھی صورت بہتر کر دی۔

اور اِس صلاحیت نے اِنسان کو دوسرے جانداروں سے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا اور اُسے زیادہ آزادی عطا کی۔ اب وہ قدرت کے کارخانے کے بنے بنائے پنجوں کا محتاج نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنے اوزار خود بنا سکتا تھا۔

سوانح حیات کی شروعات

جب کسی کی سوانح حیات لکھی جاتی ہے تو عموماً اسے اُس شخص کے سنہ پیدائش اور اُس مقام کے نام سے شروع کرتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ مثلاً "جارج واشنگٹن فریڈرک برگ میں برج کریک کے پاس ۲۲ فروری ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے"

ہم اس وقت تک اتنا کچھ بیان کر چکے ہیں لیکن ہم نے یہ تک نہیں بیان کیا کہ ہمارا ہیرو کہاں پیدا ہوا تھا اور ہمیں یہ بھی تو بولنا پڑے گا کہ اب تک ہم اُس کا نام بھی نہیں رکھ پائے۔

ایک جگہ ہم نے اس کو "بندر انسان" کہا، ایک جگہ "نیم انسان" کہا اور بہت دفعہ ہم اُسے "ہمارا جنگلی جد" جیسے گول مول نام سے پکارتے رہے۔

اچھا اب ہم کو اپنی صفائی میں بھی تو چند الفاظ کہنے کی اجازت دیجئے

سب سے پہلے تو ہمارے ہیرو کے نام کا سوال ہے۔ ہماری نیت اس معاملہ میں بالکل صاف ہے لیکن ہمارے لئے اس کا کوئی نام رکھنا ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اس

کے تو اتنے بہت سے نام ہیں کہ بس کیا کہیں!

آپ کوئی بھی سوانح اٹھا لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اول صفحہ سے آخر تک ہیرو کا نام ایک ہی رہتا ہے وہ بچے سے جوان اور بالے سے بوڑھا ہو جاتا ہے مگر اس کا نام نہیں بدلتا۔ اگر پیدائش کے دن اس کا نام جارج رکھ دیا گیا ہے تو اب وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک جارج ہی کہلائے گا۔

لیکن ہمارے ہیرو کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ وہ کتاب کے ایک ایک باب کے ساتھ اس قدر بدلتا جاتا ہے کہ ہم کو اُس کا نام بھی بدلنا ہی پڑتا ہے۔

سب سے آسان بات تو یہ ہوتی کہ ہم اُسے شروع سے صرف "آدمی" ہی کہتے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم موجودہ انسان اور قدیم پائیتھیکنتھروپس کو، جو بندر سے اس قدر ملتا جلتا تھا، ایک ہی نام سے موسوم کریں۔

سانا نتھروپس بندر سے کسی قدر کم مشابہ ضرور تھا مگر اس کو بھی آدمی تو نہیں کہا جا سکتا۔

"ہائیڈلبرگ کا انسان" ہم سے ذرا قریب ہے۔ یہ تو بتانا مشکل ہے کہ اس کی صورت کیسی تھی کیونکہ اس کی باقیات تو صرف ایک جبڑا ہے جو ہائیڈلبرگ کے پاس پایا گیا۔ لیکن اس جبڑے کو دیکھنے کے بعد "اندازاً" اس کا نام آدمی رکھا جا سکتا ہے۔ اُس کے دانت جانوروں نہیں بلکہ انسانوں کے سے ہیں اور اب اس میں وہ سامنے کے دو بڑے بڑے دانت بھی نہیں پائے جاتے جو بندروں کے مُنہ میں ہوتے ہیں۔ اگرچہ "ہائیڈلبرگی انسان" پھر بھی پورا پورا انسان نہیں ہے۔ یہ اس کی پیشانی سے ثابت ہوتا ہے جو ابھی تک بندروں کی طرح پیچھے کو ڈھلوان ہے۔

لیجئے! پائیتھکنتھروپس، سانا نتھروپس، ہائیڈلبرگی اب تین نام تو ابھی سے ہو گئے۔

اب ہم ناموں کی اس فہرست کو اور بھی بڑھا سکتے ہیں۔ ہائیڈلبرگی انسان کے بعد

ارگنزڈورنی انسان، ارگنزڈورفی کے بعد نیانڈرتھل انسان اور پھر کرومیگنین انسان۔

ایک ہیرو کے لئے اتنے بہت سے نام!

لیکن ہم کو اپنی کہانی سے اتنا آگے نہ بڑھ جانا چاہئے۔ اِس باب میں ہمارے ہیرو کا نام ہائیڈلبرگی انسان ہی رہے گا! اور یہی وہ شخص ہے جو دریاؤں کے کنارے، اپنے لئے اوزار بنانے کا سامان ڈھونڈتا پھرتا ہے اور یہی ایک پتھر کو دوسرے پتھر سے رگڑ کر وہ بھدی کلہاڑیاں بناتا ہے جو آج قدیم دریاؤں میں دبی دبائی ملتی ہیں۔

اب پڑھنے والے کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارے ہیرو کا نام رکھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اور اس کا سنہ پیدائش معلوم کرنا اس سے بھی بڑھ کر مشکل ہے۔

ہم اس طرح نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا ہیرو فلاں فلاں سال میں پیدا ہوا تھا۔ انسان کچھ ایک سال میں انسان نہیں بن گیا۔ موجودہ آدمی اور سائنانتھروپس اور سائنانتھروپس اور پائیتھیکینتھروپس میں لکھوکھا سال کا فاصلہ ہے۔

اب اگر آپ کو یہ بات یاد ہو کہ پائیتھیکینتھروپس آج سے دس لاکھ برس پہلے تھا تو آپ کہہ لیجئے کہ نسلِ انسانی کی عمر بھی دس لاکھ سال ہے۔

لیکن سب سے زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ ہمارا ہیرو ٹھیک کس مقام پر پیدا ہوا تھا۔ یہ بات بتانے کے لئے ہم نے یہ بیان کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی پردادی کہاں رہتی تھی۔ وہی بڈھی کھوس دادی اماں جن کی نسل سے چمپانزی اور گوریلے بھی ہیں۔ سائنس دانوں نے بندر کی اس قسم کا نام ڈرائیوپتھیکس رکھا ہے اور جب ہم نے اس کا پتہ دریافت کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اس نام سے تو کئی قبیلے ہیں بعض کا نشان وسطی یورپ بعض کا شمالی افریقہ اور بعض کا جنوبی ایشیا کی طرف ملتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ پائیتھیکینتھروپس اور سائنانتھروپس کی ہڈیاں ایشیا میں ملی تھیں اور ہائیڈلبرگی انسان یورپ میں پایا گیا تھا۔

اچھا اب اس کے بعد ذرا یہ پوچھئے کہ انسان کہاں پیدا ہوا تھا۔ یہاں تو صرف اُس کا پیدائشی ملک ہی دریافت کرنے کا سوال ہی نہیں بلکہ وہ خطہ بھی معلوم کرنا ہے۔

اب ہم نے سوچنا شروع کیا۔ اچھا تو پھر اُس طرف کیوں نہ چلیں جہاں پر اوزار پائے گئے تھے کیونکہ جب انسان نے اوزار بنانے شروع کئے تھے تب تو وہ یقیناً آدمی بن چکا تھا۔ شاید یہ اوزار ہمیں یہ معلوم کرنے میں مدد دیں کہ انسان سب سے پہلے کہاں رُونما ہوا تھا۔

اب ہم نے دُنیا کا نقشہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اِس نقشہ میں تمام اُن مقامات پر نشان لگا دیا جہاں اِس قسم کے اوزار اور یہ بھدی پتھریلی کلہاڑیاں وغیرہ پائی گئی ہیں۔ جب ہم ختم کر چکے تو نقشہ پر کافی نشانات پڑ چکے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نشانات یورپ میں تھے مگر افریقہ اور ایشیا میں بھی تھے۔

اس پوری کارروائی سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ انسان سب سے پہلے پرانی[1] دُنیا میں ظاہر ہوا تھا اور کسی ایک جگہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر ظاہر ہوا

انسان وقت بچانا سیکھتا ہے

ہر شخص جانتا ہے کہ ہم لوہا کیسے حاصل کرتے ہیں، کوئلہ کیسے حاصل کرتے ہیں اور آگ کیسے حاصل کرتے ہیں اچھا تو آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ ہم وقت کیسے حاصل کرتے ہیں؟ یہ بات عام طور پر لوگ نہیں جانتے لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ انسان نے قدیم زمانے ہی میں یہ سیکھ لیا تھا کہ وقت کیسے حاصل کرے۔

جب اُس نے اوزار بنانے شروع کئے تو اُس نے اپنی زندگی میں ایک بالکل نیا عنصر

---

[1] مراد یہ ہے کہ امریکہ اور نیوزی لینڈ وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے۔

شامل کیا اور رود تھا۔ کام۔ اچھا اب کام کرنے میں تو وقت صرف ہوتا ہے۔ پتھر کے اوزار بنانے کے لئے سب سے پہلے تو انسان کو ایک موزوں پتھر ڈھونڈنا پڑتا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ ہر ایک گرے پڑے پتھر سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اوزار بنانے کے لئے سخت اور ٹھوس پتھر سب سے اچھے رہتے تھے اور چاروں طرف جو پتھر پڑے رہتے تھے وہ سب کے سب ٹھوس اور سخت تو نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح موزوں قسم کا پتھر حاصل کرنے کے لئے تلاش کرنی پڑتی تھی اور اس تلاش میں انسان کو کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات پھر بھی جس چیز کی اسے تلاش رہتی تھی وہ اسے نہ ملتی تھی۔ ایسی صورت میں اُسے ذرا ہلکے یا چونے وغیرہ کے پتھر ہی سے کام چلانا پڑتا تھا۔

اور جب کبھی اسے موزوں پتھر مل بھی جاتا تھا تو پھر دوسرے پتھر کی ضرورت پڑتی تھی جس سے اس کو پیٹ پاٹ کر ٹھیک صورت میں لایا جا سکے اور اس کام میں اور بھی زیادہ وقت لگتا تھا۔ انسان کی انگلیوں میں اس وقت یہ کاریگری نہ تھی جو اب ہے۔ اُس نے نیا نیا کام کرنا سیکھا۔ وہ یقیناً اپنی پتھر کی بھدی سی کلہاڑی بنانے میں آج کل کی لوہے کی کلہاڑی بنانے سے بھی زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔

لیکن اُسے وقت کہاں سے ملتا ہ؟

قدیم زمانے کے انسان کو فرصت بہت کم ملتی تھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ آج کل ہمارے شہروں کے مصروف ترین آدمیوں سے بھی زیادہ مصروف رہتا تھا۔

صبح سے شام تک وہ جنگلوں میں اور کھلے میدانوں میں غذا جمع کرتا پھرتا تھا۔ جو کچھ بھی اُسے ملتا اُسے اپنے یا اپنے بچوں کے حلق میں ٹھونستا رہتا تھا۔ غذا جمع کر

اور اُسے کھانا۔ اِسی شغل میں انسان کی بیداری کا سارا وقت گذرتا تھا کیونکہ آپ جانتے جس قسم کی غذا وہ کھاتا تھا اس کی کافی مقدار کے بغیر اُس کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ اگر آپ کے دسترخوان پر صرف بیر، مغزیات، کھمبیاں، پتے، کیڑوں کے انڈے اور ایسی ہی چھوٹی موٹی چیزیں ہوں تو آپ کو یہ چیزیں کافی مقدار میں کھانی پڑیں گی۔

انسانوں کا یہ گلہ اُسی طرح میدانوں میں پھرتا رہتا تھا جیسے آج کل کے ہرن جو تمام وقت چھوٹی چھوٹی گھاس اور پودوں پر مُنہ مارا کرتے ہیں اور انہیں چبایا کرتے ہیں، اور اس طرح یہ انسان بمشکل اپنا پیٹ بھرا کرتے تھے اور اگر انسان تمام دن غذا تلاش کرتا اور کھاتا ہے تو آپ ہی بتائیے کام کرنے کو وقت کہاں سے لائے۔

اور پھر ایک عجیب وغریب بات ہوئی کام نے بالکل کایا ہی پلٹ دی کیونکہ کام میں صرف وقت صرف ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ سے وقت بچتا بھی تھا۔

آپ یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص کوئی کام آٹھ گھنٹے میں کرتا ہے لیکن آپ اسی کام کو چار گھنٹے میں کرنے میں کامیاب ہو گئے تو گویا آپ نے چار گھنٹے بچا لئے۔ اگر آپ کوئی ایسا اوزار ایجاد کرتے ہیں جو کسی کام میں صرف ہونے والے وقت کو آدھا کر دیتا ہے تو اس کے یہی معنی ہوئے کہ آپ نے وہ آدھا وقت جو پہلے اسی کام میں لگ جاتا تھا، بچا لیا۔

انسان ابھی اپنے قدیم ہی دور میں تھا کہ اُس نے وقت حاصل کرنے کا یہ ذریعہ دریافت کر لیا۔ بے شک اُسے اپنے اوزاروں کو تیز کرنے میں کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا لیکن ایک مرتبہ اوزار تیار ہو جانے کے بعد، پھر اسی تیز اوزار کے ذریعہ درختوں کے کھوکھوں سے کیڑوں کے انڈے وغیرہ نہایت آسانی اور تیزی سے نکالے جا سکتے تھے۔ کسی لکڑی کو تیز پتھر سے رگڑنا طولِ عمل ضرور تھا مگر تیاری کے بعد پھر اس لکڑی سے کھانے کے لائق جڑوں کو کریدنا یا گھاس میں اچھلتے پھدکتے کسی

چھوٹے سے جانور کو مار گرانا بہت زیادہ آسان تھا۔ اِس طرح غذا کے جمع کرنے میں تیزی آ گئی اور اس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان کو کام کے لئے زیادہ وقت مل گیا۔ جو گھڑیاں اُسے غذا کی تلاش میں صرف کرنے سے بچتی تھیں وہی اب وہ اوزار بنانے میں صرف کرنے لگا وہ اُنہیں اور بہتر اور تیز تر بناتا رہا اور ہر اوزار اپنی جگہ اس کے لئے زیادہ غذا مہیا کرنے کا ذریعہ اور اس طرح زیادہ وقت بچانے کا ذریعہ بنتا رہا۔

شکار خاص طور پر انسان کا وقت بچاتا تھا کیونکہ آدھے گھنٹے میں اُسے اتنا گوشت مِل جاتا تھا جو دن بھر کے لئے کافی ہوتا تھا لیکن شروع شروع میں اُسے غذا کے لئے زیادہ گوشت میسر نہ آتا تھا ظاہر ہے کہ بڑے جانوروں کو تو وہ لکڑی سے مار نہیں سکتا تھا اور رہ گیا میدانوں میں رہنے والا چوہا تو اُس میں گوشت ہی کتنا ہوتا ہے اِبھی تک اِنسان صحیح معنوں میں شکاری نہ بنا تھا تو پھر وہ کیا تھا؟ وہ ذخیرہ جمع کیا کرتا تھا۔

ذخیرہ جمع کرنے والا اِنسان

ہمارے لئے چیزیں جمع کرنا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دن دِن بھر لگ کر اسٹابری اور سانپ کی چھتریاں جمع کی ہونگی اور اس وقت کیسی خوشی ہوتی ہے جب کوئی چھتری بادامی ٹوپی اوڑھے کھادیا کائی میں چھپی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ گھاس میں ہاتھ ڈال کر جب کوئی جھالر کی موٹی سی سانپ کی چھتری نکالے تو کیسا مزا آتا ہے۔

لیکن سوچیے کہ اگر آپ کا کام صرف گکرمتے سانپ کی چھتریاں یا بیر جمع کرنا ہوتا؟ ایسی صورت میں کیا آپ کے پاس کھانے کو کافی غذا ہوتی؟ جب آپ سانپ کی چھتریاں توڑنے جاتے ہیں تو کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی ٹوکری بھی بھر جاتی ہے

اور ڈپی بھی بالب ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگل میں دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد جب آپ واپس لوٹتے ہیں تو ٹوکری کے پیندے سے بس صرف ایک چھتری لڑھکتی نظر آتی ہے۔

ہمارے جان پہچان کے لوگوں میں ایک نو سال کی لڑکی ہے وہ جب کبھی جنگل کی سیر کو نکلتی ہے تو بڑی شیخی سے کہتی ہے "دیکھنا میں آج سانپ کی چھتریاں لاؤنگی" اور لاتی خاک بھی نہیں۔ اکثر خالی ہاتھ گھر واپس آجاتی ہے پھر اگر گھر میں اس کے لئے کھانا نہ رکھا ہو تو وہ تو بھوکوں مر جائے۔

اُس قدیم زمانے میں ذخیرہ جمع کرنے والے انسان کی حالت اس سے بھی بدتر تھی اور اس کے بھوکوں نہ مرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جو کچھ بھی کھا سکتا تھا کھا لیتا تھا اور دن دن بھر غذا کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔

اگرچہ وہ اپنے درختوں پر رہنے والے آبا و اجداد سے زیادہ مضبوط اور آزاد تر تھا لیکن پھر بھی وہ ایک غریب ہستی تھا جس کو آدھے پیٹ کھانا نصیب ہوتا تھا۔

اور اس پر سے طرّہ یہ کہ ایک اور مصیبت سر پر نازل ہوا ہی چاہتی تھی۔

چوتھا باب

ایک دُنیا کا اختتام اور دوسری کا آغاز

مصیبت کی آمد

کسی خاص سبب سے، جواب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے، شمال کے برفانی

میدان پھر جنوب کی طرف بڑھنے لگے بڑے بڑے برفانی دریا اور چشمے پہاڑوں پر سے بہتے ہوئے، وادیوں میں سے گذرتے ہوئے، پہاڑوں کے دامنوں سے اُبلتے ہوئے، پہاڑوں کی چوٹیوں کو توڑتے، بڑی بڑی چٹانوں کا گھیرا کرتے، اپنے ساتھ بہت کچھ ملبار و لتے ہوئے بہنے لگے۔ آگے بڑھکر ان برفانی چشموں کی برف نے گھل گھل کر پانی کے دریاؤں کی شکل اختیار کر لی جو پہاڑوں پر سے اچھلتے کودتے، زمین میں اپنے لئے نہر سی کاٹ کر بہنے لگے۔

شمال سے ان برفانی چشموں کی آمد ایسی تھی جیسے کسی بڑھتی ہوئی فوج کے دستے چلے آرہے ہوں اور راستے کی پہاڑی وادیوں کی برف اور آبدرے شمال کے ان بہتے ہوئے برفانی میدانوں سے اس طرح آآ کر مِل رہے تھے جیسے راستے سے انھیں کمک اور مدد پہنچتی جارہی ہو۔

آج بھی ہم اُن چٹانوں سے اِن برفانی دریاؤں کی راہ پہچان سکتے ہیں جو فرانس اور اس کے آس پاس کے ملکوں میں پڑی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ جرمنی میں بعض وقت عین کسی جنگل کے بیچوں بیچ ایک دم سے آپ کی مڈبھیڑ کسی بڑی سی چٹان سے ہو جاتی ہے جو کائی سے بھری ہوئی دیودار کے جنگل میں پڑی ہے۔ یہ یہاں کیسے پہنچی۔ ان ہی برفانی چشموں کے بہاؤ کے ساتھ۔

اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ شمال کے یہ برفانی میدان جنوب کی جانب کھِسک چکے تھے لیکن اب کی مرتبہ وہ ہمیشہ سے زیادہ آگے بڑھ گئے۔ مغربی یورپ میں تو وہ تقریباً جرمنی کے وسط میں پہاڑوں تک پہنچ گئے اور پورے جزائر برطانیہ پر چھاگئے شمالی امریکہ میں وہ بڑی جھیلوں سے بھی زیادہ جنوب کی طرف بڑھ گئے۔

اُن کی رفتار تیز نہ تھی اور اُن کی برف میں جھلی ہوئی ہوا اُن مقامات پر فوراً نہیں محسوس ہوئی جہاں انسان رہتا تھا۔ زمین کے رہنے والوں سے پہلے سمندر کے جانوروں نے اس برفیلی ہوا کا مزا چکھا۔

سمندروں کے کنارے ہنوز گرمی سی تھی جنگلوں میں لارل اور مگنولیا ابھی تک پھول رہے تھے۔ بڑے بڑے ہاتھی اور گینڈے ابھی وادیوں میں لمبی لمبی گھاس کو روندتے پھرتے تھے لیکن سمندر رفتہ رفتہ سرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ سمندر کی لہریں، وہ دریا جو سمندر کے درمیان بہتے تھے، شمال کے برفانی تودوں کی سردی اپنے ساتھ لا رہے تھے بلکہ بسا اوقات تو وہ ان تودوں تک کو بہا لاتے تھے۔

سمندر کے کنارے جو تلچھٹ اور گاد جمع ہے وہ آج تک بھی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ کس طرح یہ گرم سمندر ٹھنڈے سمندر بن گئے۔ ہنوز زمین پر وہی جانور رہتے تھے جن کو گرم آب وہوا راس آتی ہے لیکن سمندر کی آبادی کی بالکل کایا پلٹ چکی تھی۔ اُس زمانہ کی جو تلچھٹ وغیرہ ہے اس میں ہم کو بہت سی ایسے کیڑوں کی سیپیاں ملتی ہیں جو صرف ٹھنڈے پانی میں زندہ رہ سکتے ہیں۔

جنگلوں کی آپس میں جنگ

لیکن رفتہ رفتہ زمین پر بھی ان سمندری میدانوں کی آمد کا اثر محسوس ہو رہا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر قطب شمالی کے برفانی میدان جنوب کی طرف بڑھ رہے ہوں تو یہ کوئی ہنسی کھیل تو نہیں ہے۔ سرو کے جنگل بھی دھیرے دھیرے جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ جوں جوں وہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے، گھنے پتے دار جنگلوں کو ایک ساتھ پیچھے ڈھکیلتے جاتے تھے اور اس طرح جنگلوں کی آپس میں جنگ شروع ہوئی جو ہزار سال تک جاری رہی۔

جنگلات آج بھی ایک دوسرے سے جنگ کرتے رہتے ہیں۔ سرو کا درخت

اور سفیدے کا درخت ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ سرو کو سایہ پسند ہے اور سفیدے کو روشنی۔ سرو کے جنگلوں میں سفیدا ان کے نیچے دب کر بالکل درخت کے اکھوؤں کی طرح رہ جاتا ہے اور سرو ان پر ایسا چھا جاتا ہے کہ انہیں نشو ونما پانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا لیکن جب لوگ آتے ہیں اور سرو کو کاٹ کاٹ کر گراتے ہیں تو سفیدے کو بڑھنے کا خوب موقع ملتا ہے اور وہ جی بھر کر ہاتھ پیر نکالتا ہے۔ چاروں طرف بھی ہر چیز میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ کائی جو سرو کے پیندے کے پاس اُگتی ہے اور جسے سایہ بہت ہی پسند ہے، مرنے لگتی ہے۔ سرو کے وہ چھوٹے موٹے درخت جو لکڑہاروں کی کلہاڑی سے بچ گئے ہوں، گرم دھوپ میں مُرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک اُن کی مائیں یعنی سرو کے بڑے بڑے درخت موجود تھے تو وہ اُن کے گھیر دار ٹہنیوں کے سائے میں بخوبی پل رہے تھے اور اب جبکہ انہیں دھوپ سے بچانے والا کوئی نہ رہا تو اُن کا کُمھلا کر خاتمہ ہو گیا

دوسری طرف سفیدے اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سماتے۔ پہلے تو انہیں دھوپ کی ان چند کرنوں ہی پر اکتفا کرنا پڑتی تھی جو اُن کے دشمن سرو کی گھنی چھاؤں میں سے کہیں کہیں سے، جھانک لیا کرتی تھیں لیکن سرو کے کٹنے کے بعد اب میدان سفیدے کے ہاتھ رہتا ہے اور جلد ہی سرو کے جنگل کے بجائے سفیدے کا ایک روشن چمکتا ہوا جھنڈ اُس کی جگہ کھڑا نظر آتا ہے۔

لیکن وقت برابر گذرتا جاتا ہے اور اس کے کام عجیب وغریب طریقے سے انجام پاتے ہیں۔ سفیدہ بڑھتا جاتا ہے، لمبا ہوتا جاتا ہے اُس کی گھنی، پتے دار چوٹیاں آپس میں زیادہ ملنے لگتی ہیں۔ اُن کے جڑوں کے پاس جہاں پہلے روشنی تھی اب رفتہ رفتہ سایہ آتا جاتا ہے اور زیادہ سایہ گہرا اور گھنا ہوتا جاتا ہے۔ بیشک سفیدہ کامیاب ہو گیا تھا مگر اس کی یہ جیت ہی اس کی تباہی ثابت ہوئی۔

کیا آپ نے کبھی یہ بھی سُنا ہے کہ کسی کا سایہ کسی کی موت کا باعث ہوا ہو نہیں ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا لیکن درختوں کی زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

جو چھوٹے موٹے سرو کسی نہ کسی طرح زندہ بچ رہے تھے، وہ سفیدہ کا یہ سایہ پا کر جی اٹھتے ہیں اور جلد ہی زمین سرو کے نوکیلے اکھوؤں سے بھر جاتی ہے چند سال اور گذرنے پر سرو کی پھنگیاں سفیدے کی پھنگیوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ جنگل ان دونوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔ سفیدے کا ہلکا سبز رنگ اور سرو کی گہرے سبز رنگ کی چوٹیاں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ سرو برابر اونچا بڑھتا چلا جاتا ہے اور آخر کار اس کی موٹی گہرے رنگ کی ڈالیوں کی وجہ سے دھوپ کا راستہ رک جاتا ہے اور وہ سفیدے تک نہیں پہنچ پاتی

بس سمجھئے اب سفیدے کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ سرو کی چھاؤں میں دم توڑنے لگتے ہیں اور سرو پھر اپنی گدی پر آجمتا ہے اور حق بحقدار رسید۔

اس طرح جنگلات برابر آپس میں جنگ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ لکڑ ہاروں کی کلہاڑی اُن کی زندگی میں خلل انداز ہو جاتی ہے

لیکن جب درختوں کی زندگی میں برفانی تودوں اور چشموں نے دخل دیا تو اس وقت انہوں نے جو لڑائی لڑی وہ اس سے کہیں زیادہ گھمسان لڑائی تھی۔ سردی کی وجہ سے وہ تمام درخت جنہیں گرمی راس آتی تھی، مر گئے اور شمال کے جنگلات کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ دیودار، سرو اور بید نے شاہ بلوط اور لیموں کے درختوں پر فتح پائی اور شاہ بلوط اور لیموں نے پیچھے کھسکتے ہوئے بیچارے سدا بہار، میگنولیا اور لارل کو کچل کر رکھ دیا۔

جو مقامات براہ راست سردی اور برفیلی ہوا اُن کی زد میں تھے وہاں نازک گرمی پسند درختوں کے لئے اُن کا مقابلہ کرنا بہت دشوار تھا اور وہ یا

تو مر گئے اور اس طرح اپنے فتح مندوں کے لئے جگہ خالی کر گئے یا پھر جنوب کی طرف دور ہی دور ہٹتے گئے۔ پہاڑی علاقوں میں رہ کر اس مصیبت کا مقابلہ کرنا ان کے لئے زیادہ آسان تھا۔ وہ ادھر اُدھر دروں میں چھپ جاتے جیسے کسی محفوظ قلعہ کے اندر بند ہوں۔ لیکن پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی برفانی چشمے ان پر آ رہتے اور ان کے ساتھ پہاڑی سرو اور پہاڑی بید بھی آگے آگے قدم جمائے چلے آیا کرتے تھے۔

آج جب کوئی جنگل کٹ کٹا کر یا آگ لگ کر نیست و نابود ہو جاتا ہے تو وہاں کے رہنے والے یا تو اس کے ہی ساتھ مر رہتے ہیں یا پھر بھاگ نکلتے ہیں۔ جب سرو کا جنگل کاٹا جاتا ہے تو اس کے باسی یا یوں کہئے کہ اُس کے قیدی بھی اس کے ساتھ غائب ہو جاتے ہیں جیسے گلہری یا سرو کا پرندہ وغیرہ۔ پہلے جہاں سایہ دار سرو کے درخت کا گھر تھا اب وہاں سفیدے کا ڈیرہ جم جاتا ہے اور اس نئے سفیدے کے جنگل کے مسکن میں نئی نئی چڑیاں اور دوسرے دوسرے جانور خوشیاں مناتے پھرتے ہیں

اور پھر جب سالہا سال کے بعد سرو کو پھر سفیدے پر فتح نصیب ہو گی تو نیا اور تر و تازہ سرو کا جنگل بھی سُونا نہ رہے گا۔ گلہری، کراس بِل اور ان کے تمام دوست احباب پھر یہاں آ جمیں گے۔

جنگل اسی طرح مکمل طور پر پیدا ہوتا ہے اور اُس کی دنیا تقسیم نہیں ہو سکتی جیسے ادھر اُدھر کی سبزیوں یا جانوروں کی ہو سکتی ہے۔

برفانی دَور کے زمانے میں بھی یہی ہُوا۔ گرم آب و ہَوا میں پھلنے پھولنے والے جنگلات کے رہنے والے جانور غائب ہو گئے۔ بڑے بڑے ہاتھی ندارد ہو گئے، جنگلی بیل اور گینڈے جنوب کی طرف چلے گئے اور انسان کے دشمنِ جانی، نوکیلے دانتوں والے چیتے کی نسل منقطع ہو گئی۔

اِن دیو پیکر جانوروں کے ساتھ بہت سے اور جانور اور پرندے جو اِن جنگلات

میں رہتے تھے یا تو مر گئے یا جنوب کی طرف ہٹ گئے اور اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا کیونکہ ہر جانور اپنے جنگل اور اس کی دنیا سے ایسا بندھا ہے جیسے وہ زنجیروں سے جکڑا ہوا اور جب یہ دنیا ختم ہونے لگی یا کسی اور طرف کو کھسکنے لگی تو ان جانوروں کی بھی اس کے ساتھ موت آگئی یا پھر انہیں کے ساتھ ہٹ جانا پڑا۔

جب درخت، جھاڑیاں اور گھاس نیست و نابود ہوئے تو جو جانور ان کو کھا کر اور ان کی چھاؤں میں بسیرا کر کے زندگی بسر کرتے تھے، ان کے لئے نہ غذا رہ گئی نہ حفاظت کا سامان اور جب یہ جانور مرے تو اپنے ساتھ درندوں کو بھی لے مرے کیونکہ جو درندے ان جانوروں کو پھاڑ کھا کر بسر کرتے تھے ان کی غذا کہاں سے آتی؟ چنانچہ وہ بھی بھوکوں مر گئے

اس طرح اس "غذائی زنجیر" میں جکڑے ہونے کی بدولت، جب جنگلات کی موت آئی تو ان کے ساتھ ان میں رہنے والے جانوروں اور پودوں وغیرہ کا بھی خاتمہ ہو گیا جیسے پرانے زمانے میں، اگر کوئی جہاز غرق ہوتا تھا تو بیچارے غلام بھی جو زنجیروں سے اپنی اپنی جگہ بندھے رہتے تھے، جہاز کے ساتھ ڈوب جاتے تھے۔

اب ایسی صورت میں بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ اس زنجیر کو توڑ دیا جائے، کسی دوسرے قسم کی غذا کھانی شروع کر دی جائے، اپنے پنجوں اور دانتوں کی شکل تبدیل کر دی جائے اور سردی سے بچنے کے لئے جسم پر بھیڑ کی سی لمبی لمبی اون اگائی جا سکے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ جانور کے لئے اپنے آپ کو بدل ڈالنا کس قدر دشوار ہے اس کام کے لئے دو کاریگروں کی ضرورت ہے: وراثت اور انحراف۔ اور یہ دونوں کاریگر اپنا کام بہت ہی زیادہ آہستہ کرتے ہیں۔

جنوب کے رہنے والے جانوروں کے لئے شمال کے جنگلوں میں رہنا یوں بھی بہت مشکل تھا اور پھر طرہ یہ کہ شمال کے ان جنگلوں کے ساتھ ان کے رہنے والے

ملک یعنی وہ تبدیلی جو جانداروں میں بہت ہی دھیرے دھیرے نسلاً بعد نسلاً ہوتی رہتی ہے

جانور، بالدار گینڈے، مسٹوڈن ہاتھی، غاروں میں رہنے والے شیر اور ریچھ بھی آئے۔
ان جانوروں کا گذر شمال کے جنگلوں میں بخوبی ہو سکتا تھا کیونکہ اُن کے جسموں پر تو نفیس سمور کے کوٹ تھے موٹے اور گرم۔ معمولی گینڈے، ہاتھی اور جنگلی بیلوں کے لئے جو سردی ناقابلِ برداشت اور جان لیوا تھی وہ اِن بالدار گینڈوں یا ہاتھیوں کے لئے کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اِس کے علاوہ ان میں سے بہت سے جانوروں کو غاروں میں چھپ کر سردی سے بچنے کا گر بھی معلوم تھا اور پھر ان کو غذا حاصل کرنے میں بھی کوئی دشواری نہ تھی کیونکہ یہ جنگل تو اُن کے اپنے تھے، اُن کی پاؤں لگی زمین تھی۔ یہ ان کی ہی دُنیا تھی۔

لہٰذا مرتے والے جنگلوں کے سابق رہنے والے جانوروں کو بھی مجبوراً ان نئے آنے والے جانوروں کا محکوم بن کر رہنا پڑا اور اِس طرح اگر اُن میں سے معدودے چند مشکل سے سلامت رہ سکے تو تعجب ہی کیا ہے؟

اور انسان؟ انسان کا کیا حشر ہُوا؟

انسان زندہ گیا اگر انسان ختم ہو گیا ہوتا تو آج آپ یہ کتاب نہ پڑھتے ہوتے۔ جو انسان گرم ملکوں میں رہتے تھے وہ تو مزے میں رہے حالانکہ ان مقامات پر بھی موسم سرد تر ہوتا جا رہا تھا لیکن جو لوگ ایسے مقامات پر تھے جہاں برفانی میدانوں کا پورا زور و شور سے حملہ ہو رہا تھا اُن پر بہت بُری گذری۔

جب پہلی مرتبہ برفباری ہوئی تو وہ کونے کونے چھپتے پھرتے تھے۔ اُن کے دانت بجتے، جسم کپکپانے لگتا اور اپنے بچوں کو سردی سے بچانے کے لئے اپنے کلیجوں سے لگائے وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے سکڑے بیٹھے رہتے اس طرح انہوں نے جاڑوں کے شروع ایام کا مقابلہ کیا۔

بھوک، سردی اور جنگلی جانوروں کے ڈر سے ان کی جان لبوں پر آ رہی تھی۔ اگر وہ یہ سوچنے کے قابل ہوتے کہ یہ چاروں طرف ہو کیا رہا ہے تو غالباً وہ یہی خیال کرتے کہ دُنیا

ختم ہو رہی ہے اور آخرت کا وقت آن پہنچا۔

ایک دُنیا کا خاتمہ

دنیا کے خاتمہ اور آخرت کی آمد کے متعلق اکثر پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ میں ایک مرتبہ ایک دُمدار ستارہ نمودار ہُوا اب کیا تھا' لوگوں نے سینے پر صلیب کے نشان بنا بنا کر کہنا شروع کر دیا کہ آخرت نزدیک ہے۔

اسی طرح جب سیاہ پلیگ پھیلا' شہر خالی ہو گئے اور قبرستان آباد ہو گئے تو لوگوں نے ڈر ڈر کر کانا پھوسی شروع کر دی کہ آخرت نزدیک ہے۔ دُنیا فنا ہو جانے والی ہے۔

لیکن دُنیا بھلا کیوں ختم ہوتی۔ وہ کوئی دنیا کا خاتمہ تھوڑا ہی تھا۔

اب تو خیر ہم جانتے ہیں کہ وہ دُمدار ستارہ کسی آنے والی بات کا اعلان کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو سورج کے چاروں طرف اپنے رستے چلا جا رہا تھا اور اُسے کیا پڑی تھی کہ دُنیا کے توہم پرست لوگ اُس کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں

ہم جانتے ہیں کہ قحط یا بیماری حتیٰ کہ جنگ کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا کا خاتمہ ہُوا چاہتا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جو بھی مشکل یا مصیبت ہو اُس کا سبب معلوم ہونا چاہیئے۔ اگر سبب معلوم ہے تو اس مصیبت کا مقابلہ بہتر طریقہ پر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن صرف جاہل اور نادان لوگ ہی دنیا کی آخرت کی پیشین گوئی نہیں کرتے بلکہ ایسے سائنسدان بھی ہیں جو دُنیا اور نسلِ انسانی کے خاتمہ کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ مثلاً اُن میں سے کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انسان گرمی کی کمی کی وجہ سے مر جائیگا اور اپنی اس پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وہ اعداد و شمار بھی بتاتے ہیں۔ دُنیا میں ایندھن کوئلہ وغیرہ کی فراہمی میں برابر کمی واقعہ ہوتی جا رہی ہے' جنگل برابر کاٹے جا رہے ہیں اور تیل کا خزانہ بمشکل کئی سو سال کے لئے کافی ہو سکتا ہے اور جب دُنیا

میں ایندھن باقی نہ رہ جائیگا تو فیکٹریوں کی مشینیں رک جائیں گی، ریلیں تھم جائیں گی گھروں میں آگ اور سڑکوں پر روشنی بجھ جائے گی۔ بھوک اور سردی سے لوگوں کی زیادہ تعداد کا خاتمہ ہو جائیگا جو باقی بچیں گے وہ پھر قدیم جانوروں کی سی وحشیانہ زندگی بسر کریں گے! ایسا کہنے والے ہمارے مستقبل کی کس قدر بھیانک تصویر کھینچتے ہیں! ہے نا؟

اور مشکل تو یہ ہے کہ واقعی دنیا میں ایندھن کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ انسان نے جب ایندھن دریافت کیا تھا اس کے مقابلہ میں آج حالت بہت زیادہ نازک ہے اور کبھی نہ کبھی ایسا وقت بھی آجائیگا کہ یہ سارا ایندھن کھپ چکے گا۔

تو پھر کیا دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا؟

نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔

کیونکہ دنیا میں حرارت اور قوت کا ذریعہ صرف ایندھن ہی نہیں ہے۔ حرارت کا سب سے بڑا ذریعہ سورج ہے اور اس میں کوئی شک نہیں جب تک وہ وقت آئے کہ ایندھن کا خزانہ ختم ہو، لوگوں کو سورج کے ذریعہ ریلیں چلانا، گھروں میں روشنی اور آگ جلانا، مشینوں کے پہیے گھمانا اور حتیٰ کہ کھانا پکانا بھی آجائیگا۔ اس وقت بھی چند بجلی گھروں میں اس بات کا تجربہ کیا جارہا ہے کہ سورج سے کس طرح طاقت حاصل کی جائے اور کچھ آفتابی باورچیخانے بھی ایجاد ہوئے ہیں جن میں سورج کی حرارت سے کھانا پکتا ہے۔

لیکن یہ لوگ جو دنیا کو فنا نے پر اس قدر مُصر ہیں پھر یہ کہنے لگتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی سورج کی گرمی بھی سرد پڑ جائے گی۔ اس وقت بھی سورج اُن نئے اور کم عمر ستاروں سے کم گرم ہے جو ابھی پیدا ہوئے ہیں۔ آج سے لاکھوں برس بعد سورج کی حرارت اس قدر کم ہو جائے گی کہ دنیا بالکل ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ جہاں آج کھجور کے درخت اُگتے ہیں وہاں قطب شمالی کے ریچھ گھومتے پھریں گے۔ اور یہ بات انسان کے حق میں کچھ

بہت اچھی نہ ہوگی ۔

سچ مچ اگر کوئی دوسرا برفانی دور آیا تو یہ ہوگا تو بہت بُرا لیکن جب قدیم انسان برفانی دور کو جھیل لے گیا تو آپ کے خیال میں آئندہ کا انسان جس کے ہاتھ میں موجودہ سائنس سے زیادہ ترقی یافتہ سائنس کا ہتھیار بھی ہوگا، اس کو برداشت کرکے زندہ نہ نکل آئے گا ؟

بلکہ ہم تو اس کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں کہ وہ سردی پر فتح پانے کے لئے کیا کریگا وہ سورج کی کرنوں میں تیزی لانے کے لئے ایٹم کی حرارت کا استعمال کریگا جو اس وقت مادہ کی عمیق ترین گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے اور ایٹم کی طاقت اور حرارت کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ صرف اس کو دریافت کرنے اور کام میں لانے کی ترکیب معلوم کرنے کی دیر ہے ۔

اچھا بہت ہو چکا اب اس دور دراز مستقبل کے متعلق بات ختم کی جائے اور اور ایسے ہی دور دراز ماضی یعنی قدیم دَور کے انسان کا ذکر کیا جائے ۔

ایک دُنیا کا آغاز

اگر انسان اُن زنجیروں کو نہ توڑ ڈالتا جن کے ذریعہ وہ اپنے خاص جنگلات میں مقید تھا تو اِن جنگلات کے خاتمے کے یہ معنی ہوتے کہ انسان بھی اِن کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ۔

لیکن یہ دنیا کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ وہ صرف بدل رہی تھی ۔ پہلی دنیا ختم ہو رہی تھی اور اُس کے بجائے ایک نئی دُنیا جنم لے رہی تھی اور اس نئی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے انسان کو بھی بدلنا پڑا ۔ پہلے جو غذا وہ کھایا کرتا تھا وہ معدوم ہو چکی تھی اس لئے اب اُسے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ کسی نئے قسم کی غذا حاصل کی جائے ۔ اس کے دانت، جو جنوبی جنگلوں کے رس دار پھلوں کے عادی تھے، سرو کے اور دیودار کے سخت چھلکے والے پھلوں کے لئے موزوں نہ تھے ۔

موسم دن بدن سرد تر ہوتا جا رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ آفتاب نے دُنیا کو خیرباد کہہ دیا ہے اور اِنسان کو سورج کی کرنوں کی حرارت کے بغیر ہی زندہ رہنے کا عادی ہونا پڑیگا

اُسے جلد از جلد از سرِ نو بدلنے کی ضرورت تھی اور انسان ہی وہ تنہا جاندار جس میں اس طرح اپنے آپ کو تبدیل کر لینے کی اہلیت تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اِس سے قبل بھی انسان اپنے میں تبدیلی کرنا سیکھ چکا تھا اور دُنیا کے تمام جانداروں میں وہی ایک تھا جو ایسا کبر کر سکا تھا۔

اِنسان کا دشمن اور رقیب، نوکیلے دانتوں والا چیتا اپنے لئے بالوں والی پوستین فراہم نہیں کر سکتا تھا لیکن انسان کر سکتا تھا۔ بات صرف اتنی ہی تھی کہ کسی ریچھ کو مار ڈالے اور اس کی کھال کھینچکر اپنے جسم پر لپیٹ لے۔

نوکدار دانتوں والا چیتا آگ نہیں جلا سکتا تھا۔ انسان جلا سکتا تھا اور اُسے آگ کا استعمال بھی معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں وہ اپنے آپ میں تبدیلی کر کے قدرت کی اصلاح کر سکتا تھا اور اگرچہ آج اُس زمانے کو ہزار ہا سال گذر چکے ہیں لیکن ہم بخوبی معلوم کر سکتے ہیں کہ اُس نے اپنے آپ میں تبدیلی کیسے کی اور قدرت میں کیا اصلاح کی۔

پتھر کے صفحوں کی کتاب

ہمارے پاؤں تلے کی زمین ایسی ہے جیسے کوئی بڑی سی کتاب ہو۔ اس زمین کی ہر ایک تہہ اس کتاب کے ایک ورق کا حکم رکھتی ہے۔ ہم جس سطح پر رہتے ہیں یہ اُس کتاب کا آخری صفحہ ہے۔ پچھلے تمام صفحے سمندر کی تہوں اور مختلف ممالک کے نیچے دفن ہیں اور ان شروع کے اوراق کے پہلے کیا تھا اس کا ہم صرف ایک اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کے جو صفحے ہم سے جیسے قریب تر ہیں اُتنا ہی اُن کا مطالعہ ہمارے لئے آسان ہے۔

ان میں سے بعض صفحات آگ سے جل اور جھلس گئے ہیں اور زبانِ حال سے ہمیں بتا رہے ہیں کہ کس طرح گرم گرم لاوا زمین کے اندر سے اُبلا اور پھر زمین میں سے پھوٹ کر پہاڑوں کی دراڑوں میں ہو کر بہا۔ دوسرے صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی سطح کس طرح اُبھری اور پھر بیٹھ گئی اور ایسا ہونے سے جگہ جگہ زمین پھٹ کر سمندر اندر چلا آیا اور پھر واپس چلا گیا۔

یہ صفحے سفید ہیں کیونکہ ان پر سمندر کی سفید سفید سیپیاں بکھری پڑی ہیں اور ان کے فوراً ہی بعد جو صفحے آتے ہیں ان کا رنگ کوئلے کی طرح کالا ہے اور یہ ہے بھی کوئلہ ان صفحات کی اس منجمد اور سیاہ تاریکی میں ان جنگلوں کی داستان پوشیدہ ہے جو کسی زمانہ میں کرۂ ارض پر موجود تھے۔ جیسے کتابوں میں نقشے بنے ہوئے ہوتے ہیں اس طرح کہیں کہیں پتّوں اور ان جانوروں کی ہڈیوں کے نشانات بھی ملتے ہیں جو ان جنگلوں میں رہتے تھے اور جو بعد کو کوئلہ بن گئے۔

اس طرح، ایک ایک صفحہ پڑھتے پڑھتے ہم کرۂ ارض کی پوری تاریخ کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ہمارا ہیرو، یعنی انسان سب سے آخر والے صفحے پر نمودار ہوتا ہے۔
شاید پہلے پہل کسی کو یہ گمان ہو کہ انسان اس اتنی بڑی کتاب کا خاص ہیرو کیسے ہو سکتا ہے۔ اُن بڑے بڑے دیو پیکر گینڈے اور ہاتھیوں کے مقابلے میں انسان ایک معمولی سا کردار ہے جو ساتھ چلتا ہے لیکن جیسے جیسے ہم آگے پڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے انسان مقامِ اوّلی پر پہنچتا جاتا ہے اور وہ وقت آجاتا ہے جب انسان اس عظیم الشان کتاب کا نہ صرف ہیرو بن جاتا ہے بلکہ اس کا ایک اہم مصنف بھی ہو جاتا ہے۔
دریا کے کنارے یہ جو دراڑ سی پڑی ہے اُسے دیکھئے! برفانی دور کے جو باقیات ہیں اُن میں ایک سیاہ نشان نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ کوئلے کا نشان ہے۔ ریت اور مٹی کے بیچوں بیچ یہ کوئلہ کا نشان کہاں سے آگیا؟ کیا یہاں کوئی جنگل جلا تھا؟

اگر یہ نشان جنگل جلنے کی آگ سے ہوا ہوتا تو یہ جلا ہوا مادہ دور دور تک پھیلا ہوا ہوتا اور یہاں تو کوئلے کی صرف ایک چھوٹی سی پرت ہے۔ صرف الاؤ ہی سے یہ مختصر سی جلی ہوئی پرت بن سکتی تھی اور الاؤ سوائے انسان کے اور کون جلا سکتا تھا۔

اور آگ کے نزدیک ہمیں انسان کے ہاتھوں کا اور نشان بھی ملتا ہے جس سے یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ پتھر کے اوزار اور شکار کئے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں!

آگ اور شکار۔ یہی وہ دو چیزیں تھیں جن سے انسان نے اس برفانی دور کا مقابلہ کیا۔

انسان نے جنگل چھوڑ دیا

باوجود تلاش کے، ان شمالی جنگلوں میں انسان کو ذخیرہ جمع کرنے کے لئے کچھ نہ مل سکا۔ لہٰذا اُس نے جنگلوں میں ایسا مالِ غنیمت ڈھونڈھنا شروع کیا جو صرف ایک ہی جگہ ٹھہر کر جمع کئے جانے کا منتظر نہ رہے بلکہ اپنے پیچھا کرنے والے سے بھاگے، اور چھپ جائے۔

اس زمانہ میں دُنیا کے گرم حصوں میں بھی انسان نے اپنی غذا میں اکثر گوشت شامل کرنا شروع کر دیا تھا۔ گوشت زیادہ حاصل ہوتا تھا، اُس سے طاقت بھی زیادہ حاصل ہوتی تھی اور کام کے لئے وقت بھی بچتا تھا۔ انسان کے نشوونما پاتے ہوئے دماغ کے لئے گوشت ایسی مقوی غذا کی ضرورت تھی۔

جیسے جیسے انسان اپنے اوزاروں کو بہتر بناتا گیا، ویسے ویسے شکار اس کی زندگی میں زیادہ اہم جگہ حاصل کرتا گیا۔

اب اگر جنوب کے گرم ملکوں میں شکار کی ضرورت پڑتی جا رہی تھی تو پھر شمال میں تو شکار کے بغیر کام چلنا ناممکن تھا۔ انسان کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لائق

چھوٹے جانور بھی نہیں ملتے تھے اُسے بڑے شکار کی ضرورت تھی۔ برف گرنے کی وجہ سے شکار کرنے میں بھی وقت ہوتی تھی لیکن برف گرنے کے یہ معنی بھی تھے کہ گوشت کا کافی ذخیرہ جمع رہے تاکہ برفباری اور طوفان کے ایام میں کھایا جاسکے۔

تو پھر انسان نے کس قسم کے جانوروں کا شکار کرنا شروع کیا ہوگا؟

جنگل میں مختلف قسم کے بڑے بڑے جانور تھے۔ جہاں جہاں کھلی گھاس تھی وہاں بارہ سنگھے چرتے پھرتے تھے۔ جنگلی سوّر جگہ جگہ زمین کھودتے رہتے تھے لیکن سب سے بڑے جانور جنگل میں نہیں بلکہ اُن بڑے بڑے کھلے میدانوں میں پائے جاتے تھے جہاں جھاڑیاں کثرت سے اُگتی تھیں۔

بھینسوں کے غول کے غول زمین کو اپنے پیروں کے دھماکوں سے ہلاتے، اِدھر اُدھر گھومتے اور بھاگتے رہتے تھے پہاڑوں کی طرح، بالدار دیو پیکر مسٹوڈن، اِدھر اُدھر اپنے عظیم جسموں کو گھسیٹتے پھرتے تھے۔

قدیم انسان کے لئے یہ گویا چلتا پھرتا گوشت تھا جو اُس کے آگے آگے بھاگتا اور اُسے اپنا پیچھا کرنے کے لئے ہشکارتا تھا!

چنانچہ اِس طرح اپنے شکار کا پیچھا کرتا ہوا، انسان جنگل سے باہر نکل آیا۔ وہ جنگل جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور پروان چڑھا تھا۔ اب اِس کا ٹھکانہ دور دور آگے بڑھکر میدانوں اور وادیوں میں پھیل گیا۔ اب اس کے الاؤ اور آگ اور شکاری خیموں اور ڈیروں کے نشانات جنگلوں سے بہت دُور ایسے مقامات پر پائے جانے لگے جہاں کوئی جنگل کا باسی انسان یا ذخیرہ جمع کرنے والا کبھی نہیں رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔

اس دُنیا کے متعلق پہلا اندازہ

قدیم انسان کے شکاری ڈیروں میں ہمیں ایسے جانوروں کی ہڈیاں ملتی

ہیں جو اس طرح شکار کر کے مارے گئے تھے۔ اِن میں گھوڑوں کی ہڈیاں ہیں، چوپایوں کی سینگ دار کھوپڑیاں ہیں اور جنگلی سوروں کے خم کھائے ہوئے دانت ہیں۔ کبھی کبھی اِس قسم کی ہڈیوں کے بڑے بڑے ڈھیر ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اکثر کسی مقام پر کافی عرصہ تک ٹھہرا کرتا تھا۔

اور سب سے زیادہ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ گھوڑوں، بیلوں اور سوروں کی ان ہڈیوں کے درمیان ہمیں ہمیتھوں (یعنی ایک بہت ہی بڑے قسم کا ہاتھی جس کی نسل اب معدوم ہو گئی ہے) کی ہڈیاں بھی ملتی ہیں۔ ان کی بڑی بڑی کھوپڑیاں، اُن کے لمبے کمان نما اگلے دانت، اُن کے آری کے سے دانت، اُن کے وہ بڑے بڑے پیر اور ان کے دھڑ کے ٹکڑے!

ذرا سوچیے کہ وہ ہستی جو اتنے بڑے دیوپیکر جانور کا شکار کر سکتی تھی، کتنی بہادر مضبوط اور باہمت ہو گی اور پھر اُس کے جسم کو کاٹنے اور ڈیروں تک لے جانے کے لئے تو اور بھی طاقت درکار تھی کیونکہ ایک ایک پاؤں کا وزن تقریباً ایک ایک ٹن ہوا کرتا تھا، صرف کھوپڑی ہی اتنی بڑی ہوتی تھی جیسے ایک بڑا بھرپور انسان۔

آج، ہاتھیوں کا شکار کرنے کے لئے، شکاریوں کے پاس خاص اسلحات ہوتے ہیں۔ قدیم انسان کے پاس آگ اور بارود کے اوزار نہ تھے اس کے پورے ہتھیار صرف ایک پتھر کی چھری اور ایک نیزہ تھے جس کے آخر میں ایک گھسا ہوا نوکدار پتھر لگا ہوتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ ذخیرہ جمع کرنے والے انسان اور شکاری انسان کے درمیان جو ہزار ہا سال کا وقفہ تھا اُس میں ان اوزاروں میں کچھ ترقی ضرور ہوئی تھی وہ پہلے سے بہتر اور زیادہ تیز ہو گئے تھے۔

پتھر کی چھری یا پتھر کی نیزہ کی نوکیں بنانے کے لئے انسان کو پہلے اُس پتھر پر

سے پہلی تہہ ریت کر نکال دینی ہوتی تھی پھر تمام کھُردرے پن یا بھنڈے بینڈے حصوں کو ریتنا پڑتا تھا اور پھر اس پتھر کی تہیں الگ الگ کرکے ہر تہہ کو ریت کر چھُری کی طرح تیز کیا جاتا تھا۔

پتھر ایسی ناموزوں چیز سے چھُری بنانے کے لئے بڑی ہوشیاری اور بہت زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے جب اِس قسم کا اوزار تیار ہو جاتا تھا تو انسان اِس کو استعمال کرنے کے بعد ضائع نہیں ہونے دیتا تھا بلکہ اس کی بہت حفاظت کرتا تھا اور جب اس کی دھار کند ہو جاتی تھی تو تیز کر لیتا تھا۔ اُس کا اوزار اس کے لئے بہت قیمتی تھا کیونکہ انسان اپنے کام اور اپنے وقت کی قیمت جان گیا تھا۔

لیکن چاہے کچھ بھی کیجیے پتھر پھر آخر پتھر ہی ٹھہرا میمتھ ایسے دیو ہیکل جانور کا مقابلہ کرنے کے لئے نوکدار نیزہ کی بھلا حقیقت ہی کیا تھی کیونکہ میمتھ کی جلد ایسی موٹی ہوتی تھی جیسے فولادی ڈھال!

پھر بھی انسان میمتھ کا شکار تو کرتا تھا ان کے خیموں میں اس کی جو ہڈیاں اور دانت پائے جاتے ہیں اُن سے ہمیں اِس کا پتہ چلتا ہے۔

تو پھر قدیم انسان ایسے عظیم الجثہ جانور سے کیسے نبٹتا ہوگا؟

ہم اُسی وقت اِس بات کو سمجھ سکتے ہیں جب لفظ "انسان" کے صحیح معنی ہم "لوگ" سمجھیں کسی بڑے جانور پر قابو پانا تنہا انسان کے بس کی بات نہ تھی اور اگر انسان اکیلا ہوتا تو کیا آج جو کچھ وہ بنا بیٹھا ہے وہ بن سکتا؟

انسان نے نہیں بلکہ لوگوں نے اپنی متحدہ قوت سے اوزار بنانے سیکھے، شکار کرنا سیکھا، آگ جلانا سیکھا، گھر بنانے سیکھے، اور دنیا کی کایا پلٹ دی۔

ایسی بھی کتابیں ہیں جن میں ایسے قدیم شکاری کی تصویر کھینچی گئی ہے جو رابنسن کروسو کی طرح تنہا اور اکیلا تھا اور پھر اس نے صرف اپنی ذاتی جدوجہد سے اپنے لئے سب

کچھ چیزیں مہیا کریں اور اپنے کام سب تنہا خود ہی انجام دے لے لیکن اگر انسان واقعی رابنسن کروسو کی طرح تنہا ہوتا اور لوگ اسی طرح الگ الگ رہتے اور ایک جتھا اور سوسائٹی نہ بناتے تو نہ تو کوئی تہذیب ہی پیدا ہوتی اور نہ ہی عوام کا وجود ہوتا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ رابنسن کروسو کی زندگی بھی وہ نہیں تھی جو ڈفو نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب کے لئے ایک ملاح کی زندگی کا واقعہ لے لیا ہے جو سچ مچ ہوا تھا۔ اس ملاح نے اپنے جہاز پر ایک بغاوت منظم کی تھی اور اسی جرم میں اس کو بیچوں بیچ سمندر میں ایک غیر آباد جزیرے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بہت سال بعد کچھ سیاح اور مسافر وہاں پہنچے اور انہوں نے دیکھا کہ اس جزیرے میں صرف وہی ایک شخص بالکل اکیلا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں یہ بوڑھا ملاح اپنی زبان تک بھول چکا تھا اور بمقابلہ انسان کے جنگلی جانوروں سے زیادہ مشابہ ہو گیا تھا۔ اب اگر اس موجودہ زمانہ میں بھی، مکمل تنہائی کی صورت میں، انسان کا انسان رہ جانا مشکل ہے تو پھر قدیم انسان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے؟

آدمی انسان اسی وجہ سے بنے کہ وہ ساتھ رہتے تھے، ساتھ شکار کرتے تھے، ساتھ مل کر اپنے اوزار تیار کرتے تھے۔ پورے کے پورے قبیلے ایک ساتھ مل کر بڑے بڑے جانوروں کا شکار کھیلتے تھے۔ جانوروں کے بالدار جسموں میں ایک دو نہیں سینکڑوں نیزے ایک ساتھ پیوست ہو جایا کرتے تھے۔ انسانوں کا گلہ، بیابان میمتھوں کا پیچھا کرتا تھا گویا وہ کئی ہاتھوں اور کئی پیروں والا جانور ہو اور نہ صرف سینکڑوں ہاتھ کام کرتے بلکہ سینکڑوں دماغ بھی ایک ساتھ مل کر سوچتے تھے۔ یوں تو میمتھ انسان سے کئی گنا زیادہ بڑا اور مضبوط تھا مگر لوگ چالاک اور عقلمند زیادہ تھے۔

میمتھ اتنا وزنی ہوتا تھا کہ اُس کے نزدیک انسان کو پیروں تلے پیس کر رکھ دینا کوئی بات نہ تھی لیکن اسی وزن کو لوگوں نے میمتھ کے خلاف استعمال کیا

جس کا وزن اتنا تھا کہ خود زمین بھی دھنسنے لگتی تھی۔

لوگ اُس کو چاروں طرف سے گھیر لیا کرتے تھے، اور اُن دلدلی مقامات پر جہاں یہ جانور رہتا تھا، آگ جلانی شروع کرتے تھے۔ میمتھ کی آنکھیں آگ سے چُندھیا جائیں، اس کے روئیں آگ سے جھلس کر دھواں دینے لگتے اور اس طرح وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ لوگ آگ لئے اُس کا پیچھا کرتے اور اس طرح انسان کا یہ چالاکی سے بچھایا ہوا جال کامیاب ہو جاتا اور میمتھ آگ سے بچنے کے لیے دیوانہ وار دوڑتا ہوا سیدھا دلدل میں جا دھنستا۔ اس کی گرج اور چیخوں سے فضا گونج اٹھتی اور وہ دلدل میں سے بار بار کبھی ایک پاؤں نکالنے کی کوشش کرتا کبھی دوسرا اور جتنی ہی زیادہ کوشش کرتا اتنا ہی گہرا دھنستا چلا جاتا۔ اب لوگوں کے لئے صرف اتنا کام باقی رہ جاتا کہ اُسے مار ڈالیں۔

اتنے بڑے ہاتھی کا پیچھا کرنا اور مارنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن اسے اپنے ڈیروں تک گھسیٹ کر لے جانا اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ تھا۔ ڈیرے عموماً دریا کے کنارے کسی اونچے مقام پر ہوا کرتے تھے تاکہ پینے کے لئے پانی بھی مہیا ہو سکے اور دریا کی کھوؤں اور دراڑوں سے اوزار بنانے کے لائق پتھر بھی مل سکیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب اس پوری لاش کو نیچی دلدل سے اوپر چڑھائی پر گھسیٹ کر لے جانا ہوتا تھا اور یہاں پھر ایک دو ہاتھ نہیں سینکڑوں ایک ساتھ جُٹ جاتے۔ ریتے ہوئے پتھروں سے بڑے استقلال اور محنت سے میمتھ کی موٹی کھال کو گھس گھس کر اور ریت کر کھینچا جاتا اور اس کے موٹے سخت پٹھوں اور گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو الگ کیا جاتا۔ بوڑھے تجربہ کار لوگ برابر ہدایت کرتے رہتے تھے کہ جوڑ کس کس مقام پر پائے جائیں گے تاکہ سر اور ٹانگوں وغیرہ کو جلدی جلدی الگ کیا جا سکے۔ آخر کار جب یہ پوری لاش ٹکڑوں میں کٹ چکتی تو پھر اُسے اُٹھا کر ڈیروں میں گھسیٹ کر لے جایا جاتا تھا۔

درجنوں آدمی ایک ساتھ چیختے چلاتے کھینچنے کے لئے ایک دوسرے کا دل بڑھاتے ایک بڑی سی بالدار ٹانگ کو گھسیٹ کر لاتے یا کوئی سر ہوتا جس میں اگلی ٹانگ لگی ہوئی پیچھے گھسٹتی آتی۔ یہ لوگ جب اپنے ڈیروں میں پہنچتے تو پسینے پسینے اور تھک کر چور ہو جاتے لیکن پھر کیا خوشیاں منائی جاتیں! کیونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ میمتھ کے معنی یہ ہیں کہ اتنی بڑی دعوت ہوگی جیسی شاذ ہی کبھی ہوتی ہو اور کئی دن کے لئے گوشت کا انتظام ہو گیا۔

مقابلہ کا خاتمہ

انسان کا دوسرے جانوروں سے مقابلہ ختم ہو چکا تھا اور انسان فتحمند ہو کر نکل آیا تھا۔ اس نے دنیا کے سب سے بڑے جانور کو مار گرایا تھا۔

لیکن یہ لڑائی قومی لڑائی نہیں بلکہ نمرائی لڑائی تھی کہ دیکھیں کون کس کو کھاتا ہے انسان وہ فتحمند تھا جو سب کو کھاتا تھا اور جسے کوئی نہ کھا سکتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کی تعداد دنیا میں تیزی سے بڑھنے لگی۔ ہر صدی بعد ہر ہزار سال بعد لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی تھی یہاں تک کہ تمام دنیا میں لوگ بس گئے اور یہ ایسا واقعہ تھا جو کسی اور جاندار کے ساتھ پیش نہ آسکتا تھا۔

مثال کی طور پر کیا یہ ممکن ہے کہ خرگوشوں کی تعداد بھی کبھی اتنی زیادہ بڑھ جائے جتنی انسانوں کی؟

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ لکھو کھا خرگوشوں کے لئے کافی غذا دستیاب نہ ہو سکے گی اور اس کے علاوہ جب خرگوش بڑھتے ہوں گے تو بھیڑئے بھی بڑھیں گے اور بھیڑئے اس بات کا فیصلہ کر دیں گے کہ خرگوشوں کی تعداد نہ بڑھے۔

مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں جانوروں کی تعداد لا متناہی کبھی نہیں ہو سکتی ان کے لئے ایک خاص حد سے آگے گزرنا بہت مشکل ہے اور ان کا بڑھنا اس امر پر منحصر ہوتا ہے کہ

وہ کیا کھاتے ہیں اور ان کو خود کو کون کھاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض وقت خرگوشوں کی تعداد اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ آدمیوں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ایک مرتبہ ایسا ہی ہُوا جب وہاں شروع شروع میں یورپ سے خرگوش لاکر چھوڑے گئے تھے۔ پھر خرگوشوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ اُن سے باغوں کو محفوظ رکھنا مشکل ہو گیا اور آسٹریلیا کے لوگوں کو یورپ سے ایک خاص قسم کی لومڑی منگوانی پڑی کہ خرگوشوں کی تعداد کو کم کر کے توازن کو قائم رکھا جا سکے۔

یہ ایک ایسی مثال ہے جس میں انسان قدرت کے انتظام میں دخل دے کر اور اُسے اُلٹ پلٹ کر کے پھر سے قائم کرتا ہے۔

اپنے لئے انسان نے قدرت کے تمام عائد شدہ قوانین اور قیود کو پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ وہ اوزار بنانے لگا تھا، اور دوسرے قسم کی غذائیں کھانے لگا تھا اور اُس نے قدرت کو مجبور کیا کہ اُس پر مہربان ہو۔ پہلے جہاں انسانوں کے ایک گلّے کو کافی کھانے پینے کے لئے مِل جاتا وہاں اب کئی کئی گلّے اور جتھے رہنے لگے۔

اور جب اُس نے بڑے جانوروں کا شکار کرنا شروع کیا تو اُس نے قدرت کے کارخانے میں اپنی جگہ اور بھی وسیع کر لی۔

اب اُسے اپنے کھانے کے لئے جڑی بوٹیاں جمع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بھینسے، گھوڑے، اور ہاتھی اس کے لئے یہ کام کر دیا کرتے تھے۔ ان جانوروں کے گلّے کے گلّے میدانوں میں ڈھیریوں گھاس چرتے پھرتے تھے۔ دن بدن، سال بسال وہ اِس طرح کھا کھا کر خوب موٹے ہوتے اور گھاس کے ڈھیروں کو اپنے سیروں گوشت کی صورت میں تبدیل کرتے رہتے تھے اور جب کبھی انسان کسی بھینسے یا ہاتھی کو مار ڈالتا تو اُسے وہ طاقت ایک دم حاصل ہو جاتی جو ان جانوروں نے سالہا سال میں حاصل کر کے جمع کی تھی۔

اور پھر انسانوں کو خوراک کے ذخیرے کی بھی تو ضرورت تھی۔ برفباری یا برفانی

طوفانوں کے دن میں کھانے کے لئے شکار کرنے جانا ممکن نہ تھا اور وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا جب تمام سال گرمی ہی رہا کرتی تھی

لیکن ایک تبدیلی میں سے دوسری تبدیلی نکلتی تھی جب انسان بہت سا ذخیرہ اکٹھا کر کے رکھنے لگا تو لامحالہ اُسے کئی کئی دن ایک ہی جگہ ٹھہرنا بھی پڑا۔ اب اُس کے لئے اِدھر اُدھر گھومنا پھرنا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ اپنے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے جانوروں کی لاشیں کوئی کیسے گھسیٹتا پھرے۔ اس کے علاوہ اور بھی اسباب تھے کہ انسان نے بے گھر اور بے در ہو کر مارا مارا پھرنا کیوں بند کر دیا پہلے تو اُسے جنگلی جانوروں سے بچانے کے لئے کوئی پیڑ بھی حفاظت کا ذریعہ بن سکتا تھا لیکن اب وہ جنگلی درندوں سے اتنا نہیں ڈرتا تھا۔ اب اُس کا ایک نیا دشمن تھا۔ جاڑا اور اس نئے دشمن سے بچنے کے لئے اُسے اپنے سر پر ایک محفوظ اور مضبوط سائے کی ضرورت تھی۔

انسان نے ایک نئی قدرت ایجاد کر لی

آخر کار وہ وقت بھی آیا کہ انسان نے اس بڑی عظیم الشان ٹھنڈی دنیا میں اپنے لئے ایک خاص اپنی چھوٹی سی گرم دنیا بنانی شروع کر دی۔ کسی غار کے منہ پر یا کسی آگے کو نکلی ہوئی چٹان پر چمڑے اور ڈالیاں چھا کر اُس نے اپنا خود کا ایک آسمان بنایا جہاں نہ ہوا تھی نہ بارش نہ برفباری۔ اپنی اس چھوٹی سی دنیا کے بیچوں بیچ میں انسان نے ایک اپنا سورج روشن کیا جس سے اُسے جاڑوں میں گرمی اور رات کے وقت روشنی حاصل ہوتی تھی۔

قدیم شکاری ڈیروں کے مقامات پر اب بھی ایسے سوراخ پائے جاتے ہیں جن میں وہ ستون (بانس وغیرہ) لگائے گئے تھے جن پر یہ انسان کا بنایا ہوا آسمان یعنی جھونپڑی کی چھت ٹکی ہوتی تھی اور ان ڈنڈوں کے درمیان میں اب بھی وہ جلے ہوئے

پتھر موجود ہیں جن کے درمیان وہ نقلی سورج یعنی آگ روشن رہا کرتی تھی۔ اس گھر کی دیواریں تو کبھی کی گر چکی ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گل سڑ چکی ہیں لیکن باوجود اس کے کہ وہ موجود نہیں ہیں یہ اندازہ لگانا ممکن ہے کہ وہ ٹھیک کس جگہ پر تھیں۔ مگر اس چھوٹی سی دنیا کو اندر سے دیکھا جائے تو زبان حال سے اپنے خالق انساں — کی گواہی دیتی ہے۔

پتھر کی چھریاں اور ریتیاں، پتھر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور چھلکے، جانوروں کی ٹوٹی اور الگ الگ کی ہوئی ہڈیاں، آتشدانوں میں کوئلہ اور راکھ یہ تمام چیزیں ریت اور مٹی میں اس طرح ملی ہوئی پائی جاتی ہیں جیسی قدرت میں کہیں جہاں انسان کا ہاتھ نہ پہنچا ہو نہیں پائی جاتیں۔

اس گھر کی یہ دیواریں اب سے بہت پہلے منہدم ہو چکی ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں لیکن اس جگہ سے دو چار قدم ہی ہٹ کر دیکھئے تو آپ کو انسان کے ہاتھوں کے کارناموں کا کہیں نشان نہ ملے گا۔ نہ زمین پر کہیں اوزار پائے جاتے ہیں، نہ کوئلہ اور راکھ ہے نہ ہڈیاں ہیں اور اس طرح انسان کی بنائی ہوئی اس دوسری دنیا اور باقی تمام چیزوں کے درمیان ایک خط کھنچا ہوا ہے۔ ایک ایسا خط جو دکھائی نہیں دیتا۔

جب ہم اس زمین کو کریدتے ہیں جس میں دست انسانی کے کاموں کے نشانات ہیں، ان پتھر کی چھریوں اور ریتیوں کو دیکھتے ہیں، آتشدان کی اس راکھ کو کریدتے ہیں جس میں آگ کبھی کی بجھ چکی ہے تو ہمیں بخوبی یقین ہو جاتا ہے کہ اس پہلی دنیا کے خاتمہ کے ساتھ انسان کا خاتمہ نہیں ہوا کیونکہ انسان اس وقت تک اپنی ایک الگ چھوٹی سی دنیا بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

پانچواں باب

ایک ہزار سال کا دَور

ماضی کا سفر

میمتھ اور بھینسے کے اِن شکاریوں کے خیموں میں دو قسم کے پتھر کے اوزار پائے جاتے ہیں، ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔

اِن میں سے بڑے کی شکل تکونی ہے اور وہ دونوں طرف سے تیز ہے۔ چھوٹا اوزار ایک لمبا سا پتلا سا نیزے کی طرح اوزار ہے جو کسی بڑے پتھر سے کاٹا جاتا ہے اور جس کی ایک طرف کی نوک تیز ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک اوزار ایک خاص کام کے لئے بنایا گیا تھا ورنہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نہ ہوتے۔

اب ہم یہ کیس طرح معلوم کریں کہ یہ دونوں اوزار کس کام میں آتے تھے۔ ویسے تو ہم ان کو دیکھکر ہی کچھ بتا سکتے ہیں کہ یہ کس کام میں آتے ہوں گے۔ یہ دونوں کے دونوں ہی تیز تو ہیں لیکن ان میں سے ایک زیادہ بڑا اور زیادہ بھاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ زیادہ سخت کام کے لئے استعمال ہوتا ہوگا اس کو دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے استعمال کرنے کے لئے کافی طاقت کی ضرورت پڑتی ہوگی۔

لیکن یہ ٹھیک، کس کام میں آتے ہوں گے؟

یہ معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پتھر کے زمانہ کی طرف واپس جایا جائے اور

یہ دیکھا جائے کہ لوگ اپنے اِن پتھر کے اوزاروں سے کیسے کام کرتے تھے۔

ناولوں میں اکثر مصنف کہتے ہیں، "آئیے ہم دس سال قبل کی سیر کریں" ناول لکھنے والوں کے لئے تو یہ ٹھیک ہے۔ اُن کا جہاں جی چاہے جائیں اور جس طرح دل چاہے جائیں اور اپنے ہیرو کے متعلق جو مزاج چاہے لکھیں لیکن ہم جو ایک سچی کہانی لکھنے بیٹھے ہیں، ہم کیا کریں؟ اور ہمیں صرف دس سال یا اتنے ہی پیچھے تو نہیں جانا ہے، ہمیں تو لاکھوں برس پیچھے جانا ہے۔

پھر بھی ہم پتھر کے زمانے کی طرف چل سکتے ہیں اور ضرور چلیں گے۔

اگر آپ کو یہ سفر اختیار کرنا ہے تو پہلے اتنے لمبے سفر کے لئے آپ کو سب سامان تیار کر لینا چاہیئے۔ سب سے پہلے تو آپ کو ایک عمدہ خیمہ لینا ہوگا اور ساتھ ہی اس میں بچھانے کے لئے کچھ چمڑے بھی درکار ہوں گے پھر خیمے کی طنابیں باندھنے کے لئے کچھ کھونٹے اور بانس، جو موڑ کر رکھے جا سکیں، اور کھونٹے گاڑنے کے لئے ایک ہتھوڑا بھی ہونا چاہیئے۔ خیمے کے علاوہ آپ کو بہت سی اور چیزوں کی ایک گٹھری بھی لینی ہوگی ایک بید کی ٹوپی جو آپ کے سر کو دھوپ سے محفوظ رکھ سکے، ایک کلہاڑی، ایک کیتلی، ایک گیس کا چولھا، ایک پیالہ، ایک چمچہ، ایک قطب نما اور کچھ نقشے۔ اب یہ سامان اپنے سفری تھیلے میں رکھ لیجیئے اور ہاں ایک بندوق بھی لیتے چلئے گا۔ بھلا پتھر کے زمانہ میں شکار کئے بغیر آپ کا کام کیسے چلیگا؟ اور اب چلئے جو بندرگاہ سب سے زیادہ نزدیک ہو وہاں چل کر ایک اسٹیمر کا ٹکٹ خرید لیں۔

ٹکٹ دینے والے سے کہیں یہ نہ کہہ دیجئے گا کہ آپ پتھر کی دنیا کا سفر کرنے جا رہے ہیں۔ اگر ایسا کیجئے گا تو وہ سمجھے گا کہ اسٹیمر کے ٹکٹ کے بجائے آپ کو پاگل خانے کا ٹکٹ ملنا چاہیئے!!

آپ اپنے ٹکٹ پر اس قسم کی تحریر "پتھر کی دنیا اور واپسی کا ٹکٹ" لکھا ہوا نہیں

پائیں گے بلکہ وہ تو ایک معمولی اسٹیمر کا ٹکٹ ہوگا اور اُس پر لکھا ہوگا "سیاحی ٹکٹ ملبورن تک کے لئے"

چند ہفتوں میں اسٹیمر آپ کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا کیونکہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس دُنیا میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جو پتھر کے اوزار استعمال کرتے ہیں اور یہ لوگ آسٹریلیا میں رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ مکانی سفر کر کے زمانی دوری کو طے کرلیں گے۔

آسٹریلیا میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو پتھر کے اوزار استعمال کرتے ہیں اور اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پتھر کے اوزار کس طرح استعمال ہوتے ہیں تو ہمیں اُن تک جانا ہوگا۔

سوکھے ہوئے کھُلے میدانوں میں کہیں کہیں نوکدار جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں اور ہم ان میں سے ہوتے ہوئے اس ملک کے اندر تک دھنستے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم اُس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں یہ آسٹریلیا کے شکاری رہتے ہیں۔ ایک دریا کے کنارے، درختوں کے سائے میں، ہمیں ان کے جھونپڑے دکھائی دیتے ہیں، جو درختوں کی ڈالیوں اور چمڑے وغیرہ سے بنائے گئے ہیں۔

ان جھونپڑوں میں بچے کھیل رہے ہیں، زمین پر عورتیں اور مرد بیٹھے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ایک بڑھا آدمی، جس کے لمبی سی داڑھی اور سفید بکھرے ہوئے بال ہیں، کنگارو کا چمڑا کھینچ رہا ہے۔ یہ کنگارو شکار کر کے لایا گیا ہے۔

بوڑھے کے ہاتھ میں پتھر کی ایک تکونی چھری ہے اور وہ اس سے کام کر رہا ہے۔ یہ وہی پتھر کا تراوالا اوزار ہے جس کے دیکھنے کے لئے ہم اتنی دُور سے آئے ہیں۔ بڈھے کے پاس ہی ایک عورت بیٹھی ہوئی پتھر کے ایک لمبے، پتلے سے

اوزار سے ایک لباس سا کاٹ رہی ہے۔ اچھا! یہاں ہم نے پھر وہ اوزار پہچان لیا جو ہمارا دیکھا ہُوا ہے۔ ٹھیک ہے۔ تو یورپ کے قدیم انسانوں کے شکاری ڈیہرے میں جو لمبے پتلے اوزار پائے جاتے ہیں وہ اِسی قسم کے ہوتے تھے!

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آسٹریلیا کے رہنے والے ابھی تک قدیم انسان کی طرح ہیں۔ اُن میں اور قدیم انسان میں تو ہزاروں پشتوں کا فصل ہے۔ پتھر کی یہ چھُریاں جو یہ لوگ استعمال کر رہے ہیں یہ تو قدیم زمانے کی کچھ یادگاریں ہیں جو محفوظ رہ گئی ہیں۔ لیکن ان یادگاروں کی وجہ سے کئی باتیں ہمارے ذہن میں صاف ہو جاتی ہیں۔

مثلاً جب ہم آسٹریلیا کے ان لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی اور نکونی چھُری مردوں کے استعمال کے لئے ہے۔ وہ شکاریوں کا اسلحہ ہے اور چھوٹی چھُری عورتوں کے استعمال کرنے اور گھر کے کام کاج کے لئے ہے۔ اس سے عورتیں چمڑے کے لباس قطع کرتی ہیں، پیٹیاں کاٹتی ہیں اور چمڑے کو اِسی سے گھِس گھِس کر چکنا کرتی ہیں

اب ان دونوں اوزاروں کے مختلف کاموں اور ان میں کام کی تقسیم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہنوز قدیم انسان شکار کھیل کر ہی زندگی بسر کر رہا تھا، کہ لوگوں میں تقسیم کار شروع ہو گئی تھی۔

چونکہ کام دن بدن زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا لہٰذا اسے زیادہ قابلیت کے ساتھ انجام دینا ہوتا تھا اور اس مقصد کے لئے ایک کام ایک آدمی کے سپرد ہوتا تھا تو دوسرا دوسرے کے۔ جب مرد شکار کا پیچھا کرتے اور مارتے رہتے تھے تو عورتیں بھی خالی نہ بیٹھتی تھیں بلکہ جھونپڑیاں بناتی، جڑیں وغیرہ جمع کرتی اور ذخیرہ پہ پہرہ دیتی رہتی تھیں۔

اور اس کے علاوہ محنت کی ایک اور بھی تقسیم تھی ——— اور وہ بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان تھا۔

ہزار سالہ مدرسہ

کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے پہلے یہ سیکھنا ضروری ہے کہ وہ کام کیسے کیا جائے اور یہ علم کچھ آسمان سے وحی بن کر نہیں اترتا بلکہ کسی اور سے سیکھنا پڑتا ہے۔

اگر ہر بڑھئی کو اپنی کلہاڑی، آری اور رندہ خود ایجاد کرنا ہوتا اور ساتھ ہی اُسے ان اوزاروں کا استعمال بھی اپنی ہی عقل سے سیکھنا ہوتا، تو آج کو دُنیا میں ایک بھی بڑھئی نہ دکھائی دیتا۔

اگر جغرافیہ سیکھنے کے لئے ہم میں سے ہر ایک کو دُنیا کا خود چکر کاٹنا پڑتا، امریکہ پھر سے دریافت کرنا ہوتا، افریقہ کی سیاحت کرنی پڑتی، ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنا ہوتا اور دُنیا کے تمام دریاؤں اور خاکناؤں کو خود گننا پڑتا تو چاہے ہم موجودہ زندگی سے ہزار گنا بڑی زندگی لے کر پیدا ہوتے پھر بھی کوئی ایک زندگی پوری نہ پڑتی۔ ہم جتنی ہی ترقی کرتے جاتے ہیں اُتنا ہی لوگوں کے لئے علم بڑھتا جاتا ہے۔ ہر نئی پُشت، گذری ہوئی نسل سے، معلومات، دریافتوں اور علم کا عظیم تر خزانہ ورثہ میں حاصل کرتی جاتی ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے لوگ سولہ برس کی عمر میں پروفیسر بن جایا کرتے تھے لیکن اب ذرا سولہ برس کی عمر میں پروفیسر بننے کی کوشش کرکے دیکھیئے! ایک درجن سال تو صرف ہائی اسکول ہی تک پہنچتے پہنچتے لگ جاتے ہیں اور آئندہ زمانے میں لوگوں کو پڑھنے میں اس سے بھی زیادہ وقت لگا کرے گا کیونکہ ہر سال کے ساتھ ہر علم میں نئی نئی دریافتیں ہو رہی ہیں اور پھر علموں کی تعداد بھی اپنی جگہ برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ بہت عرصہ نہیں گذرا کہ صرف ایک

ہی علم طبیعات یعنی فزکس تھا لیکن اب جیو فزکس اور الیکٹرو فزکس بھی نکل آئے۔ پہلے صرف ایک ہی علم کیمیا تھا لیکن اب جیو کیمسٹری، بایو کیمسٹری اور اگرو کیمسٹری بھی دریافت ہو گئے علم کی نئی تلاش کی وجہ سے سائنس اور دیگر علوم ایسے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جیسے حشرات الارض۔

ظاہر ہے کہ پتھر کے زمانے میں کسی قسم کی سائنس نہیں تھی۔ انسان نے اس وقت تجربات حاصل کر کے اکٹھے کرنے شروع ہی کئے تھے اور انسان کے کام اتنے پیچیدہ نہ تھے جتنے وہ آج ہیں۔ اس وقت انسان کو سیکھنے میں وقت بھی بہت زیادہ لگتا تھا لیکن پھر بھی، اس وقت بھی ان کو کچھ سیکھنا ضرور پڑتا تھا جنگلی جانوروں کا پتہ لگانا، ان کی کھال کھینچنا، جھونپڑے بنانا، پتھر کی چھریاں بنانا۔ ان تمام کاموں کے لئے قابلیت کی ضرورت تھی اور یہ تمام کام وہ کیسے سیکھتے۔

انسان سیکھا سکھایا کاریگر بن کر تو ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتا۔ اُسے تو کاریگری اور ہنر سیکھنا پڑتا ہے۔

اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم کو ایک بہت کھلی مثال اس بات کی ملتی ہے کہ انسان اور جانوروں میں کتنا زیادہ اختلاف اور فصل ہے۔ جانور کو پیدائش کے وقت ہی سے، اپنے تمام اوزار، اپنے ماں باپ سے وراثت میں ملتے ہیں اور یہ علم بھی کہ اُن اوزاروں کو کس طرح استعمال کیا جائے جیسے اس کے جسم کی ساخت اور بالوں اور سمور کا رنگ بھی پیدائشی ہوتا ہے۔ سوٗروں کو یہ سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ جڑوں کو کیسے کھودیں کیونکہ اُن کے اگلے نوکیلے دانت جڑیں ہی کھودنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ کترنے والے جانوروں کو درختوں کے کترنے میں کوئی تکلف

نہیں ہوتا کیونکہ اُس کے کرنے کے اوزار ٹھیک اُس کے منہ کے اندر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح جانوروں کے نہ کوئی اسکول ہوتے ہیں نہ کارخانے جہاں وہ کام سیکھ سکیں۔

لیکن انسان اپنے اوزار خود بناتا ہے۔ وہ ان کے سمیت پیدا نہیں ہوتا اور اس کے یہ معنی بھی ہوئے کہ اِن اوزاروں کے استعمال کرنے کا علم بھی اُسے اپنے والدین سے وراثت میں نہیں ملتا بلکہ کام کرنے کے دوران میں اُسے یہ علم اُستادوں اور اپنے سے بڑے لوگوں سے سیکھنا پڑتا ہے۔

یہ بات تو ضرور ہے کہ اگر لوگ حساب کے سوالات نکالنا اور قواعد کے قاعدوں کو سیکھ کر ہی پیدا ہوا کرتے تو سُست اور نکمے طالب علموں کی تو خوب بن آتی تب اُنہیں اسکول نہ جانا پڑتا لیکن یہ بات اُن کے حق میں کچھ اچھی نہ ہوتی اگر اسکول نہ ہوتے تو لوگ نئی نئی باتیں ہی نہ سیکھتے۔ انسان کے کام اور انسان کے رسم و رواج ایک خاص سطح پر آکر ٹھہر جاتے جیسے گلہری کے قاعدے اور طریقے اور کام ہیں۔

یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ لوگ بنی بنائی عادتیں لے کر پیدا نہیں ہوتے بلکہ سیکھتے اور معلوم کرتے ہیں اور ہر پُشت کے لوگ انسانی تجربات کے خزانے میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے ہیں اس طرح تجربات بڑھتے ہی جاتے ہیں اور انسان اپنی معلومات کی حد کو برابر پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

جیسے اسکول جانے والا ہر لڑکا معلومات حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح کل انسانیت معلومات حاصل کرتی ہے اور ہر وقت نئی نئی باتیں دریافت کرتی رہتی ہے۔ یہی وہ ہزار سالہ اسکول یا مدرسہ ہے جس سے انسان کو سائنس، کاریگری اور فنون حاصل ہوئے جس نے انسان کو تہذیب اور تمدن بخشا!

پتھر کے زمانے کے وقت ہی سے انسان اس ہزار سالہ مدرسہ میں داخل ہو

گیا تھا۔ بوڑھے تجربہ کار شکاری، نوجوان لوگوں کو شکار کا مشکل فن سکھانے لگے تھے، یہ بتانے لگے تھے کہ زمین پر مختلف جانوروں کے پیروں کے نشانات میں تفریق کس طرح کرنا چاہیئے اور کس طرح شکار کو ڈرائے بغیر اس کو دبوچ لیا جاتا ہے۔

شکار کرنے کے لئے آج بھی بہت مہارت کی ضرورت ہے حالانکہ اب شکاری بننا نسبتاً آسان ہے کیونکہ شکاری کو اپنے اوزار اور اسلحے خود نہیں بنانا پڑتے۔ پتھر کے زمانے میں شکاریوں کو اپنے اوزار بھی خود ہی بنانے پڑتے تھے، جیسے ڈنڈے چھریاں نیزے کی نوکیں وغیرہ۔ بوڑھے اُستاد کو نوجوان طالب علم کو بہت کچھ سکھانا پڑتا تھا۔ عورتوں کو بھی اپنا کام سیکھنا پڑتا تھا۔ عورت کو نہ صرف گرہستن ہونے کی ضرورت تھی بلکہ ساتھ ہی اس کو معمار، لکڑ ہارن، اور درزی کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔

ہر قبیلے میں بوڑھی عورتیں اور مرد ہوتے تھے جو اپنی طویل اور جفاکش زندگی کے تجربات اُٹھتی جوانیوں کو سکھایا کرتے تھے۔

لیکن وہ اپنی معلومات اور تجربات دوسروں تک کس ذریعہ سے پہنچاتے تھے؟ یا تو کام کر کے ان کو دکھاتے تھے یا زبان سے سمجھاتے تھے لیکن اس کے لئے تو ان کو زبان کی ضرورت تھی! کسی جانور کو اپنے بچوں کو اُن کے زندہ اوزار، پنجوں اور دانتوں کا استعمال سکھانا نہیں ہوتا لہٰذا جانوروں کو زبان کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن انسان کو بولی سیکھنے کی ضرورت تھی اس کے لئے زبان اشد ضروری تھی، اپنے کام کے لئے بھی اور پھر اپنا تجربہ اور مہارت، بڑوں سے چھوٹوں تک پہنچانے کے لئے بھی تو پھر انسان اس پتھر کے زمانے میں بات کیسے کرتا ہوگا؟

ماضی کا ایک اور سفر

چلئے ہم ماضی کا ایک سفر اور کریں لیکن اب کی دفعہ ہم بیس ہزار سے

طریقے سے ہلکے پھلکے چلیں گے۔ اتنا ساز و سامان ساتھ ڈھونے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی آپ کو جہاز میں بیٹھنا پڑے گا۔ آپ گھر میں بیٹھے بیٹھے ہی یہ سفر انجام دے لیں گے

جب ہم ریڈیو کا بٹن گھماتے ہیں تو ایک منٹ میں ہم نیویارک سے پیرس، پیرس سے ماسکو، ماسکو سے بمبئی پہنچ جاتے ہیں اور گھر کے گھر ہی میں بیٹھے رہتے ہیں۔

اور اگر ہمارے پاس ٹیلیویژن کاسٹ بھی ہے تو ہم نہ صرف اور ملکوں کے لوگوں کی باتیں سُن سکتے ہیں بلکہ دریاؤں سمندروں اور پہاڑوں کے اُس پار، دوسرے ملکوں اور دوسرے شہروں کے لوگوں کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔

لیکن جن لوگوں میں اور ہم میں، میلوں نہیں بلکہ سالہا سال کی دوری ہے، ان کی باتیں ہم کیسے سُن سکیں گے؟

کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ جس طرح ہم فضا کو پار کر جاتے ہیں اُسی طرح وقت کو بھی پار کر جائیں۔

ہاں ہے —— بولتی ہوئی تصویریں

پردۂ سیمیں پر ہمیں پوری دُنیا دکھائی دیتی ہے۔ نہ صرف موجودہ زمانہ کی دُنیا بلکہ ماضی کی دُنیا بھی لیکن یہ متحرک تصویریں بھی ایسا سمجھئے کہ گویا ایک جہاز ہے جو ہم کو صرف اُسی قدر دُور لیجا سکتا ہے جتنی دور وہ خود بنا تھا یعنی اب سے صرف چند سال قبل۔ سب سے پہلی متحرک اور بولتی تصویر ۱۹۲۷ء میں تیار کی گئی تھی۔

اب اگر ہم ماضی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا چاہیں تو ہمیں ایک جہاز سے دوسرے جہاز میں بدلنا ہوگا، اور ہر نیا جہاز پہلے جہاز سے بدتر ہوتا جائیگا۔ اسٹیمر سے ہم بادبانی کشتی میں جائیں گے، اور بادبانی کشتی سے پتوار کی کشتی میں۔

اب خاموش اور متحرک تصویروں کو لیجئے۔ اِن میں ہم ماضی کو دیکھ تو سکتے ہیں مگر سُن نہیں سکتے۔

گراموفون کو لیجئے۔ اس میں ہم آواز اور اُس کا ہر اُتار چڑھاؤ تو سُن سکتے ہیں مگر بولنے والے کو دیکھ نہیں سکتے۔

اور یہ تمام جہاز بھی ہمیں صرف اُسی ساحل تک پہنچا سکتے ہیں جہاں سے یہ خود روانہ ہوئے تھے۔ متحرک تصویریں ہمیں ۱۸۹۵ء سے پہلے جو کچھ ہوا وہ نہیں دکھا سکتیں اور گراموفون ہم کو صرف ۱۸۷۷ء تک لے جا سکتا ہے کیونکہ اسی سال میں اس کی ایجاد ہوئی تھی۔

پُرانی فوٹوگرافی تصویروں اور اِن سے بھی پُرانی دستی تصویروں میں پُرانی مسکراہٹیں اور بشرے منجمد ہیں۔ کسی خاندان کے پرانے البم کو اُٹھا کر دیکھئے۔ سبز رنگ کے ساٹن کی جلدیں، لوہے کی کلپوں کے درمیان آپ پشتوں کی زندگی کا عکس دیکھیں گے۔

دفتی والے کاغذ پر کسی لڑکی کی دھندلی سی تصویر ہوگی جو ۱۸۶۰ء کے زمانے کی لڑکیوں کے سے کپڑے پہنے ہوگی۔ لڑکی باغ کے ایک بہت ہی خوبصورت سے پھاٹک پر جھکی کھڑی ہے۔ ایسا پھاٹک صرف تصویر کھینچنے والوں کے اسٹوڈیو ہی میں ہو سکتا ہے۔ اُسی صفحہ پر ایک دلہن، معہ اپنے لمبے سے نقاب کے کھڑی ہے اور ساتھ ہی اُس کا موٹا سا چکنی چاند والا دولھا، فراک کوٹ پہنے کھڑا ہے۔ اُن کے ہاتھ، اکڑے ہوئے، ایک سنگِ مرمر کے طاق پر رکھے ہیں، جو اسی مقصد کے لئے بنا ہوا ہے۔ ان کی شادی کی انگوٹھی بخوبی دکھائی دے رہی ہے۔ دولھا دُلھن سے کم از کم تیس سال بڑا ہے اور دُلھن کی آنکھیں اب بھی ویسی ہی معصومانہ اور خوفزدہ ہیں جیسی اُس دوسری تصویر میں اُس چھوٹی سی لڑکی کی ہیں۔

اور یہ دیکھئے یہاں پھر اُسی کی تصویر ہے۔ چالیس پچاس سال بعد آپ بمشکل اُسے پہچان سکیں گے۔ اس کی پیشانی پر، جس پر ایک سیاہ گوٹے دار رومال بندھا

ہوا ہے، جھریوں کی قطاریں ہیں، اُس کے گال اندر کو دھنس گئے ہیں، اور اُس کی آنکھیں تھکی ہاری لگتی ہیں۔ تصویر کے پشت پر لکھا ہے "میرے پیارے پوتے کو اُس کی چاہنے والی دادی کی طرف سے"

اِس طرح تصویروں کے البم کے ایک صفحہ پر ایک انسانی زندگی کی پُوری داستان لکھی ہوئی ہے۔

جیسے جیسے ہم اور پیچھے ہٹتے جاتے ہیں تصویروں میں بشرہ کا اظہار، ہاتھ پاؤں کی حرکات، اور سر کا رُخ ظاہر کرنے کی اہلیت کم ہوتی جاتی ہے۔ آج کل ہم اپنی تصویروں کی فلم پر تیز دوڑتے ہوئے گھوڑ سوار اور پانی میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے تیراک کو بخوبی اُتار سکتے ہیں لیکن اُن دِنوں جب کسی کی تصویر کھینچنی ہوتی تھی تو اُس کو ایک خاص کرسی پر چاروں طرف سے ٹھیپیاں لگا کر بٹھا دیا جاتا تھا تاکہ اس کے کندھے اور سر بالکل حرکت نہ کرے پھر اگر وہ تصویر انسان کے بجائے کسی کٹھ پتلی کی معلوم ہوتی تو تعجب ہی کیا!

سنہ ۱۸۳۹ء — اِس سے پہلے تصویریں بھی نہیں ملتیں اور اگر ہم اس سے بھی اور پیچھے ماضی میں جانا چاہیں تو ہمیں دوسری شہادتوں کا سہارا لینا ہوگا اور یہ شہادتیں کیمرہ کی طرح غیر جانب دار اور بالکل صحیح نہ ہوں گی۔

ماضی کو پھر سے لا کھڑا کرنے کے لیے ہمیں اُن شہادتوں کو سُننا اور آپس میں مقابلہ کر کے دیکھنا ہوگا جو تصویروں کی گیلریوں، لائبریریوں اور عمارات میں پائی جاتی ہیں اور اس طرح سینکڑوں تاریخیں ہمارے سامنے سے ہوا کی طرح گزر جاتی ہیں، جیسے سڑک پر لگے ہوئے میلوں کے پتھروں کے اعداد ہوں۔

سنہ ۱۴۵۶ء — اِس سے قبل ہمیں چھپی ہوئی کتابیں بھی نہیں ملتیں۔ صاف ستھری چھپائی کے بجائے کاتب کی پُر تکلف لکھائی کام دیتی ہے۔ نقل کرنے والوں کا پُر کار قلم دھیرے دھیرے موم جامے پر سرکتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہم بھی

مڑتے جاتے ہیں اور اس طرح ایک ایک حرف سے گذر کر ماضی کی طرف چلتے جاتے ہیں۔ موم جامے کے بعد پھر نرسل کی باری آتی ہے اور پھر مندروں وغیرہ کی دیواروں کی لکھائی کے ذریعے ہم ماضی کی طرف چلتے ہی جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم اور زیادہ پیچھے ہٹتے جاتے ہیں ویسے ویسے گذرے ہوئے زمانے کے لوگوں نے جو تحریریں چھوڑی ہیں وہ زیادہ پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی جاتی ہیں اور اُن کو سمجھنا دشوار تر ہوتا جاتا ہے۔

آخر کار لکھائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اب ماضی کی آواز بالکل معدوم ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔

اب اس پار کیا ہے ؟

اب ہم انسان کے نشانات کی تلاش زمین میں کرنے لگتے ہیں، بھلائی ہوئی قبروں کو کھودتے ہیں، قدیم اوزاروں کا جائزہ لیتے ہیں، پرانی گری ہوئی عمارتوں کے کھنڈروں اور پتھروں کو ٹٹولتے ہیں، مدتوں کی بجھی ہوئی آگ کے کوئلوں اور راکھ کو کریدتے ہیں۔

قدیم زمانے کی یہ یادگاریں ہمیں یہ تو ضرور بتاتی ہیں کہ انسان کس طرح رہتا سہتا تھا اور کس طرح کام کرتا تھا لیکن کیا یہ ہمیں یہ بھی بتا سکتی ہیں کہ وہ کس طرح سوچتا اور کس طرح بات کرتا تھا ؟

بغیر الفاظ کی زبان

قدیم انسان کے شکاری ڈیروں میں جو غار ہیں اُن میں ہم اکثر انسان کی باقیات اور نشانات تو کیا، خود انسان ہی کو پا جاتے ہیں۔

بائیبیکینتھروپس کے بعد ہزارہا سال گذرنے پر اب ہمارے ہیرو کی

شخصیت اور ہستی کیسی تھی؟

سب سے پہلے تو ہمیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہئے کہ اب سے ہم اس کا نام کیا رکھیں گے کیونکہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر باب پر ہمارے ہیرو کا نام بدلتا جاتا ہے۔ ہم اُس کا وہی نام رکھیں گے جو سائنس نے اس کے لئے تجویز کیا ہے یعنی نیانڈرتھل کا آدمی۔

نیانڈرتھل ایک وادی کا نام ہے اور میمتھوں کے زمانے کے ایک انسان کی کھوپڑی اسی وادی میں پائی گئی تھی لہٰذا اس نسبت سے اس کا یہی نام ہوا۔ اب اس منزل پر پہنچ کر ہمیں اپنے ہیرو کو ایک نیا نام تو دینا ہی چاہئے تھا، کیونکہ آپ جانئے اب تو وہ بہت کچھ بدل چکا ہے بلکہ ایک دوسری ہی شخصیت بن گیا ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی اب سیدھی ہو گئی ہے ہاتھ زیادہ لچکدار ہو گئے ہیں اور چہرہ بہت کچھ انسانی ہو چکا ہے۔

ناول نویسوں کی عادت ہے کہ اپنے ہیرو کی ظاہری شکل کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتے ہیں اور اُس پر حُسن کی بھرمار کرتے کرتے کبھی نہیں تھکتے۔ کہیں اس کی آنکھیں "آہو چشم اور نرگس بیمار ہیں" تو اس کی ناک "ستواں اور سیدھی ہے" تو اُس کی زلفیں "ناگن اور مشکبار اور عنبریں" ہیں مگر وہ یہ کبھی نہیں بتاتے کہ اُن کے ہیرو کا دماغ کتنا بڑا ہے۔

ہماری حالت اِن سے بالکل ہی الگ ہے۔ ہمارے لئے دماغ کا سائز اولین اہمیت رکھتا ہے اور ہمیں اُس کی ترچھی نگاہوں اور "اشرفی کی بلور پر جھنکار" قسم کی آواز کے مقابل اس کے دماغ کی جسامت میں زیادہ دلچسپی ہے۔

جب نیانڈرتھل کے انسان کی کھوپڑی کا بہت احتیاط کے ساتھ مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بلا شک وشبہ، اس کا دماغ پائی تھنے کین تھروپس کے دماغ

سے بڑا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ ہزار ہا سال جو کام کرتے کرتے گذرے، یہ ضائع نہیں گئے۔ انہوں نے انسان کی پوری کایا پلٹ دی اور خاصکر اس کے دماغ اور ہاتھوں کی کیونکہ یہ اُس کا دماغ ہی تھا جو کام کے متعلق سوچتا اور احکام جاری کیا کرتا تھا اور ہاتھ کام کو انجام دیا کرتے تھے۔ جب انسان پتھر کی کلہاڑی میں اُلجھا ہُوا، پتھروں کو مختلف شکل میں ربیت رہا تھا تو لاشعوری طور پر وہ اپنے کو بدل رہا تھا اور اپنی انگلیوں کی کایا پلٹ رہا تھا اور ان کو زیادہ پھرتیلی اور لچکدار بناتا جا رہا تھا۔

اگر آپ نیانڈرتھل کے آدمی کو دیکھیں تو آپ فوراً پہچان لیں گے کہ وہ بندر نہیں ہے۔

لیکن پھر بھی وہ بندر سے کس قدر ملتا جلتا ہے!!

اس کی تنگ پیشانی، آنکھوں پر ایسی جھکی ہوئی ہے جیسے جھالردار ٹوپی، اس کے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ پیشانی اور ٹھوڑی کے معاملہ میں وہ موجودہ انسان سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ اس کی پیشانی آگے کو جھکی ہوئی ہے اور ٹھوڑی تو گویا ہے ہی نہیں۔

اس کی اِس کھوپڑی میں، جو آگے کو بہت جھکی ہوئی پیشانی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے انسان کا جو دماغ ہے اس کے کچھ حصے اُس کی کھوپڑی میں نہیں پائے جاتے اور نیچے کا جبڑا اور ڈھلوان ٹھوڑی ابھی تک اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بات کر سکے۔ ایسی پیشانی اور اس طرح کے نیچے جبڑے والا آدمی ہماری آپ کی طرح نہ سوچ سکتا ہوگا نہ بات کر سکتا ہوگا۔

لیکن پھر بھی اُسے بات تو کرنی ہی ہوتی ہوگی۔ اگر اکٹھے ہوکر کام کرنا ہو تو بات کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جب لوگ ایک ساتھ کام کرتے ہیں تو اُنہیں اپنے کام کے

متعلق آپس میں متفق ہونا پڑتا ہے۔ اب انسان اتنی دیر تو ٹھہر نہیں سکتا تھا کہ اس کی پیشانی اوپر اُٹھ کر برابر ہو جائے اور جبڑے اور بڑے ہو جائیں۔ اس کے لئے تو اُسے ہزار سال تک ٹھہرنا پڑتا

تو پھر انسان اپنا مطلب اوروں کو کیسے سمجھاتا ہوگا ؟

جس طرح بھی بن پڑتا وہ اپنے پورے جسم سے اپنا مفہوم سمجھاتا تھا۔ ابھی تک اس کے جسم کا کوئی عضو بات کرنے کے لئے مخصوص نہیں ہوا تھا لہٰذا وہ اپنے تمام جسم کے ذریعہ بولتا تھا، اس کے چہرے کے خدوخال بولتے تھے، اس کے کندھے بولتے تھے، اس کے پیر بولتے تھے اور سب سے زیادہ اس کے ہاتھ بولتے تھے۔

کیا آپ نے کبھی کسی کتے سے گفتگو کی ہے ؟ جب کتا اپنے مالک سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ اس کی آنکھوں کی طرف تکنے لگتا ہے، اپنی ناک اس کے جسم میں ملتا ہے، اس کے گھٹنوں پر اپنے پنجے رکھ دیتا ہے، دُم ہلاتا ہے اور بےچین ہو ہو کر غُرغُر کرتا اور ہلتا جاتا ہے۔ وہ الفاظ میں بات نہیں کر سکتا لہٰذا اپنے پورے جسم کے ذریعہ بات کرتا ہے۔

قدیم انسان بھی الفاظ میں بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کام کے لئے اپنے ہاتھ ہی استعمال کرتا تھا، زبان کا کوئی استعمال کام کے لئے نہیں تھا۔

مثلاً اگر اُسے یہ کہنا ہوتا کہ "کاٹو" تو ہاتھ سے کاٹنے کا اشارہ کرتا۔ یہ کہنے کے بجائے کہ "دو" وہ اپنی ہتھیلی آگے بڑھا دیتا۔ "ادھر آؤ" کے عوض وہ اپنے طرف اشارہ کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی آواز سے بھی اپنے ہاتھوں کی امداد کرتا جاتا تھا۔ وہ چلاتا، آہیں بھرتا اور چیخیں مارتا تاکہ جس شخص سے وہ بات کر رہا ہے وہ اس کی طرف مخاطب ہو جائے اور جو اشارے وہ کر رہا ہے اُن کو دیکھے

اچھا تو ہمیں یہ کیسے معلوم ہوا ؟

زمین پر جتنے پتھر کے اوزار پائے جاتے ہیں یہ سب زمانۂ ماضی کی یادگاریں ہیں لیکن ان اشاروں کے ٹکڑے اور یادگاریں ہمیں کہاں سے ملیں گے؟ ہاتھوں کے ان اشاروں کو جو کبھی کے ٹوٹ پھوٹ چکے ہم پھر سے جوڑ کر مکمل کیسے کر سکتے ہیں؟ ایسا کرنا بالکل ناممکن ہوتا اگر یہ واقعہ نہ ہوتا کہ یہ قدیم لوگ ہمارے آباؤ اجداد تھے، اور ہم موجودہ زمانہ کے لوگوں نے اُن سے کچھ وراثت میں حاصل کیا ہے۔

اشاروں کی شکلیں

چند سال قبل نیز پرسیس قبیلے کے ایک شمالی امریکی انڈین نے یورپ کا سفر کیا لیکن وہ اُن انڈینز کی طرح نہ تھا جن کا حال آپ نے کوپر کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ کھانے کے لئے گھوما کرتے ہیں۔ نہ تو وہ چمڑے کا لہنگا پہنے تھا اور نہ ہی اس کے سر پہ پر لگے تھے۔ وہ ہم لوگوں ہی کی طرح لباس پہنتا تھا اور اپنی زبان اور انگریزی زبان بخوبی روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔

لیکن ان دونوں زبانوں کے علاوہ وہ ایک تیسری زبان اور بھی جانتا تھا جو ان انڈینز میں بہت ہی قدیم زمانہ سے لے کر اب تک محفوظ ہے۔

یہ دنیا کی سب سے زیادہ سہل اور آسان زبان ہے۔ اگر آپ اسے سیکھنا چاہیں گے تو آپ کو طرح طرح کی گردان اور صرف کے جھگڑوں میں بالکل نہ پڑنا پڑیگا اور حال اور حرفِ جار اور اس قسم کی چیزیں جو ہماری زبانوں کو اس قدر مشکل بنا دیتی ہیں وہ آپ کو قطعی نہیں سیکھنی ہوں گی۔ رہ گیا تلفظ تو اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کیونکہ اس زبان میں تلفظ تو سرے سے ہے ہی نہیں۔

یہ انڈین پردیسی جو زبان بولتا تھا وہ لفظوں اور آواز کی نہیں بلکہ اشاروں کی زبان تھی۔

اگر آپ اس زبان کی کوئی لغت بنانا چاہیں گے تو وہ کچھ اس قسم کی ہو گی۔

اشاروں کی لغت کا ایک صفحہ

کمان	ایک ہاتھ سے خیالی کمان بنتی ہے اور دوسرا ہاتھ کمان کی رسی کو خیالی طور پر کھینچتا ہے۔
بھیڑیا	ایک ہاتھ اور اس کی دو انگلیاں آگے کو نکلی ہوئی جیسے دو کان ہوں
خرگوش	اُسی طرح ایک ہاتھ اور دو انگلیاں مگر دوسرے ہاتھ کو موڑ کر گول کر دیا جائے جس سے خرگوش کی مُڑی ہوئی پیٹھ واضح ہو۔
مچھلی	ہاتھ کھلا ہوا، ہتھیلی نیچے کی طرف، ہوا میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر مڑتا ہوا۔ یہ پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی کے لئے اشارہ ہے کہ وہ تیرتے وقت اپنی دم سے پانی میں پہلے ایک طرف مارتی ہے اور پھر دوسری طرف
مینڈک	ہاتھ کی انگلیاں اندر کو نیچے کی طرف کھنچی ہوئی اور پھر ہاتھ بار بار جست مارتا ہے۔
بادل	دونوں مٹھیاں سر کے اوپر۔ جن سے منڈلاتے ہوئے بادلوں کا اندازہ ہو
برفباری	دونوں مٹھیاں دھیرے دھیرے الگ ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ نیچے آتی ہیں جن سے گرتے ہوئے برف کے چھیروں کا اندازہ ہوتا ہے۔
بارش	دونوں مٹھیاں الگ ہو کر تیزی سے نیچے آتی ہیں
ستارہ	دو انگلیاں، سر کے اوپر، کبھی مل جاتی ہیں کبھی کھل جاتی ہیں جن سے ستاروں کا جھلمل جھلمل کرنا اور ٹمٹمانا ظاہر ہوتا ہے۔

ان اشاروں میں سے ہر ایک بجائے خود ایک تصویر ہے جو ہاتھوں سے ہوا میں کھینچی جاتی ہے جس طرح پرانے زمانے میں لکھائی الفاظ کے بجائے تصویروں

سے کی جاتی تھی، اسی طرح شاید یہ اشارے بھی اشاروں کی تصویریں رہے ہوں گے۔

ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ آج جو یہ اشاروں کی زبان جوانڈ نیز استعمال کر رہے ہیں یہ وہی ہے جو قدیم لوگ استعمال کیا کرتے تھے۔ اشاروں کی اس زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو قدیم لوگوں کی زبان میں پائے جانے ناممکن ہیں۔ مثلاً اب ایسے اشاروں کو لیجیئے جو حال ہی میں ہمیں معلوم ہوئے ہیں۔

موٹر کار — ہاتھ سے گول بناکر پہیئے کا اشارہ۔ پھر ہاتھوں سے اشارہ کہ چلانے کا پہیہ کس طرح گھمایا جاتا ہے

ریل — وہی دونوں پہیوں کا گول نشان اور ہاتھ سے لہر کا سا اشارہ جس سے انجن سے نکلتا ہوا دھواں معلوم ہو۔

یہ اشارات بہت حال کے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ بھی ہماری اشاروں کی لغت میں کچھ ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو کھلم کھلا قدیم لوگوں سے آئے ہوئے جان پڑتے ہیں۔ مثلاً

آگ — ہاتھوں سے لہر بناتے ہوئے اوپر کو اٹھائے جائیں جس سے الاؤ میں سے نکلتا ہوا دھواں ظاہر ہو۔

کام — کھلے ہاتھوں سے ہوا میں مارنا۔

کون جانے قدیم لوگ بھی جب "کام" کے لئے کہنا چاہتے ہوں تو کھلے ہاتھوں سے ہوا میں مارتے رہے ہوں!

ہماری اپنی اشاروں کی زبان

اشاروں کی زبان آج بھی استعمال کی جارہی ہے۔

جب ہمیں کہنا ہوتا ہے "ہاں" تو ہم ہمیشہ "ہاں" نہیں کہتے۔ اکثر صرف سر

ہلا دیتے ہیں۔

جب ہمیں "وہاں" کہنا ہوتا ہے یا "اُس طرف" کہنا ہوتا ہے تو ہم اکثر ایک انگلی اٹھا دیتے ہیں بلکہ جو انگلی اِس کام کے لئے استعمال ہوتی ہے اس کا ہم نے نام بھی الگ رکھ چھوڑا ہے اسے "اشارے کی" یا کلمہ کی" انگلی کہتے ہیں۔

جب ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو تعظیماً جھک جاتے ہیں۔ ہم اپنا سر ہلاتے ہیں، اپنے کندھے ہلاتے ہیں، ہاتھ پھیلا دیتے ہیں، انگلی سے خبردار کرتے ہیں، میز پر مُکا مارتے ہیں، فرش پر پیر تھپتھپاتے اور پٹکتے ہیں ہاتھ ہلا کر اشارہ کرتے ہیں، دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ لیتے ہیں۔ دل پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں، ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، ہاتھ ملاتے ہیں، ہوا پر بوسہ اڑاتے ہیں۔

اب یہ تمام باتیں ہو جاتی ہیں اور ایک لفظ بھی کہا نہیں جاتا یہ بغیر لفظوں والی زبان، یہ اشاروں کی زبان، آسانی سے اپنی جگہ چھوڑنے والی نہیں ہے۔

اور اس کے فائدے بھی ہیں۔ بعض وقت صرف ایک اشارہ سے ہم اتنا ظاہر کر سکتے ہیں جتنا ایک پوری تقریر سے بھی نہیں کر سکتے

کوئی اچھا ایکٹر، آدھے گھنٹے میں، ایک لفظ کہے بغیر، اپنی ابروؤں، اپنی آنکھوں اور اپنے لبوں سے اتنا ادا کر سکتا ہے جتنا ہزاروں الفاظ سے بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یہ تو ہے ہی کہ ہمیں اس اشاروں کی زبان کو پھر سے اپنانا نہیں چاہئے کیونکہ جو بات ہم الفاظ سے کہہ سکتے ہیں اُسے اپنے ہاتھوں اور پیروں سے ادا کرنا بیکار سی بات ہے اور پھر ہم قدیم لوگ ہیں بھی تو نہیں۔ پیر پٹکنا، زبان نکالنا، لوگوں کی طرف انگلی اٹھا کر اشارے کرنا، یہ سب تو ایسی عادتیں ہیں جو ختم ہی ہو جائیں تو اچھا ہے لیکن بعض موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ ایسی بغیر الفاظ والی زبان کے بغیر کام

نہیں چلتا۔

کبھی آپ نے ایک جہاز سے دوسرے جہاز کو جھنڈیوں کے ذریعہ اشارے کرتے دیکھا ہے؟ اگر ہوا کے ان جھکڑوں، لہروں کی اس گرج، اور بعض اوقات توپوں کی دھائیں دھائیں کے درمیان چلّانا پڑتا تو سوچیے تو سہی کتنی اونچی آواز کی ضرورت ہوتی کہ اِدھر سے اُدھر سُنی جاسکے؟ اس موقعہ پر انسان کے کان بیکار ہیں صرف آنکھیں ہی اُس کی مدد کو پہنچتی ہیں۔

آپ خود بھی بعض وقت اس قسم کی بغیر لفظوں والی زبان استعمال کرتے ہیں۔ پڑھتے وقت، جماعت میں، جب آپ اُستاد کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو اپنا ہاتھ اٹھا دیتے ہیں اور آپ کو ایسا کرنا بھی چاہئے کیونکہ تیس چالیس طالبعلموں کے کلاس میں اگر سب ایک ساتھ بات کرنے لگیں تو کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے۔

چنانچہ اس طرح ہم موجودہ زمانہ میں بھی اس قدیم گذرے ہوئے بھلائے ہوئے ماضی کے آثار دیکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ بغیر لفظوں والی زبان کچھ ایسی تنگ بھی نہ تھی کیونکہ ہزاروں سال تک زندہ رہی اور اب بھی اُس کے بغیر لوگوں کا کام نہیں چلتا اور اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ زبانی بولی نے اُس پر فتح ضرور پالی مگر اس قدیم زبان کو میدان سے قطعی طور پر بھگا نہ سکی۔ البتہ یہ ہوا کہ مفتوح نے فاتح کی خدمت کرنی شروع کردی۔

یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے کہ اب تک بعض لوگوں اور قوموں میں اس زبان کو رعایا اور غلاموں اور بچوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔ کاکیشیا کے ترکی اور آرمینی دیہاتوں میں، ابھی کچھ ہی دن قبل یہ دستور تھا کہ عورتیں اشاروں سے باتیں کیا کرتی تھیں کیونکہ اُن کو اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے مردوں سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ شام میں بھی ایک ایسی اشاروں کی زبان دریافت

کی گئی تھی اور اور کئی مقامات پر بھی۔ اسی طرح ایران میں شاہ کے دربار کے وقت، ملازمین اشاروں کے ذریعہ باتیں کیا کرتے تھے اور صرف اپنے برابر والوں سے بات کرنے کی اجازت تھی۔ یہ بدنصیب لوگ، صحیح معنوں میں گفتگو کی آزادی سے بھی محروم تھے۔

اِنسان نے دماغ حاصل کرلیا

جنگل میں ہر جانور ہر وقت اُن اِشاروں پر کان اور نگاہ دئے رہتا ہے جو اُسے چہار طرف سے ملتے رہتے ہیں۔ کہیں کوئی پتہ کھڑکا۔ شاید کوئی دشمن وہاں گھات لگائے بیٹھا ہو۔ یا تو بھاگ کھڑا ہونا چاہیئے یا لڑائی اور مقابلے کے لئے تیار ہوجانا چاہیئے۔

بادل کی ذرا گرج سُنائی دی، ہوا نے پتوں کے درمیان سرسرانا شروع کیا۔ بس دوڑ کر اپنے گھونسلے یا بِل میں گھُس کر آنے والے طوفان سے پناہ لینی چاہیئے۔

زمین پر سڑے ہوئے پتوں اور گلے سڑے پھلوں کی بو کے ساتھ شکار کی بھی ایک ہلکی سی خوشبو ہے۔ بس اِسی خوشبو کو تھامے چلے جاؤ اور شکار کو دبوچ بیٹھو۔

ہر سرسراہٹ، ہر بوباس، گھاس میں نظر آنے والا ہر نشان، کہیں سے سیٹی یا چوں چوں کی آواز کا کوئی نہ کوئی مطلب ہے کسی نہ کسی عمل کی ضرورت ہے۔

قدیم انسان بھی اِسی طرح اپنی چاروں طرف کی دُنیا سے آنے والے اشاروں پر دھیان دیا کرتا تھا لیکن اُس نے بہت جلد ہی دوسرے اشاروں کو بھی سمجھنا سیکھ لیا۔ وہ اشارے جو دوسرے قبیلوں کے لوگ اُسے کیا کرتے تھے۔

ایک شکاری ہرن کو کھوجتا ہُوا آتا ہے۔ اپنے پیچھے پیچھے آنے والے شکاریوں کو وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ اُن لوگوں نے ابھی تک ہرن کو نہیں دیکھا ہے لیکن اشارہ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ہتھیار وغیرہ ٹھیک ٹھاک کرکے ایسے تیار ہوجاؤ جیسے تم نے خود ہرن کے سینگ اور کنوتیاں دیکھ لی ہوں۔

زمین پر ہرن کے پاؤں کے نشانات ایک اشارہ ہیں۔ ہانک کا اشارہ جو یہ بتارہا ہے کہ نشان مل گیا، گویا اشارے کے لئے اشارہ ہے۔ جب کسی شکاری کو کسی جانور کے پاؤں کے نشان یا گھاس میں کسی جانور کی سرسراہٹ معلوم ہوتی ہے تو وہ اور لوگوں کو ان اشاروں کے متعلق اشارہ کرتا ہے۔

اب اس طرح یہ اشارے جو انسان انسان کو کرتا تھا، اُن اشاروں سے ملحق ہو گئے جو قدرت انسان کو کرتی تھی۔

"ایوان پیٹروچ پاولو اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ انسانی تقریر" اشاروں کا اشارہ ہے"

شروع شروع میں صرف اشارے اور چیخیں تھیں۔ یہ اشارے، آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ انسان کے دماغ تک پہنچتے تھے، جیسے کوئی ٹیلیفون اسٹیشن ہو۔ دماغ کو جیسے ہی یہ "اشارے کا اشارہ" ملتا تھا مثلاً جیسے کہ کسی جانور کی آمد کا اعلان ہو، تو وہ فوراً احکامات دینے لگتا تھا: ہاتھوں کو نیزہ مضبوطی سے پکڑنے کے لئے، آنکھوں کو ڈالیوں کے درمیان دھیان سے دیکھنے کے لئے، کانوں کو ڈالیوں کی چرچراہٹ اور پتوں کی سرسراہٹ غور سے سننے کے لئے۔ یہ دھیان رہے کہ جانور ابھی تک نہ دکھائی دیا ہے نہ اس کی آہٹ سنائی دی ہے مگر انسان اس سے جھڑپ کے لئے بخوبی تیار ہو گیا ہے۔

جتنی ہی اشاروں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اُتنے ہی زیادہ یہ اشاروں کے اشارے دماغ کو بھیجے جاتے تھے اور اُس مرکزی اسٹیشن کا کام بڑھتا جاتا تھا جو کھوپڑی کے اگلے حصے میں رہتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی ضرورت بھی پڑی کہ اس مرکزی اسٹیشن کو زیادہ وسیع کیا جائے۔ دماغ میں نئے نئے خانے (Cells) برابر بنتے جا رہے تھے۔

اور ان خانوں کا آپس میں تعلق زیادہ پُرپیچ ہوتا جا رہا تھا لہٰذا دماغ بڑھا اور

اس طرح اس کی جسامت بڑھی۔

یہی وجہ ہے کہ نیانڈرتھل کے انسان کے دماغ کا سائز پیتھیکن تھروپس کے دماغ سے بڑا ہے۔ انسان کا دماغ نشو ونما پارہا تھا۔ انسان نے سوچنا سیکھ لیا تھا مثلاً جب وہ کوئی ایسا اشارہ دیکھتا یا سُنتا جس کے معنی "آفتاب" کے ہوتے تھے تو چاہے آدھی رات ہی کیوں نہ ہو، اُسے سورج کا خیال آجاتا تھا۔ جب کوئی اُسے اشارہ کرتا کہ آؤ اور اپنا نیزہ بھی ساتھ لیتے آؤ تو چاہے اس وقت نیزہ اس کے پاس نہ بھی ہو، تو بھی اُسے نیزے کا خیال آجاتا تھا۔

ایک ساتھ مِل کر کام کرنے سے اِنسان نے بولنا سیکھا اور بولنا سیکھنے کے سلسلہ میں سوچنا بھی سیکھا۔

اِنسان نے اپنا ذہن اور اپنی عقل قدرت سے تحفے کے طور پر نہیں پائی اُس نے بڑی محنت سے اس کو خود حاصل کیا۔

ہاتھوں کا کام زبان نے کیسے سنبھال لیا

جب تک اوزاروں کی تعداد تھوڑی تھی اور انسان کا تجربہ اتنا وسیع نہ تھا تو کام چلانے کے لئے معمولی قسم کے سیدھے سادھے اشارے بھی کافی ہوتے تھے لیکن جیسے جیسے کام زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے ویسے ویسے اُن کے متعلق اِشارے بھی پیچیدہ ہوتے گئے۔ ہر چیز کے واسطے ایک الگ اشارے کی ضرورت اور یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اِشارہ اُس چیز کی صحیح طور پر بخوبی تصویر کھینچ سکے۔ اس طرح تصویروں سے اِشاروں کا رواج ہوا اب انسان ہوا میں تصویریں کھینچنے لگا، جانور کی، اسلحہ کی، درخت کی۔

فرض کیجئے کسی شخص کو خار پُشت کے متعلق بیان کرنا ہے۔ وہ نہ صرف خار پُشت

کی تصویر کھینچ دیتا ہے بلکہ اُس موقعہ پر خود بھی خار پشت بن جاتا ہے اور اشاروں کے ذریعہ یہ واضح کرتا ہے کہ خار پشت کس طرح اپنے کان کھڑے کرتا ہے، کس طرح زمین کھود کر مٹی ایک طرف کو پھینکتا جاتا ہے اور کس طرح اس کی مونچھیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس طرح سے کسی معمولی چیز کو بھی بیان کرنا ہوتا تھا تو پہلے اس چیز کو اتنی غور سے دیکھنا پڑتا تھا جیسے آج کل صرف آرٹسٹ ہی دیکھتے ہیں۔

جب آپ کہتے ہیں "میں پانی پیتا ہوں" تو کوئی آپ کے اس کہنے سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کیسے پانی پی رہے ہیں، گلاس سے، بوتل سے یا اوک سے۔ جب انسان ہاتھوں کے ذریعہ اپنا مطلب واضح کیا کرتا تھا تو اس کے بات کرنے کا طریقہ صرف یہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی اوک بنا کر اپنے منہ کو لگاتا اور پھر خیالی پانی کو زبان سے لپر لپر سُڑکتا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پانی مزیدار ہے اور پیاس بُجھاتا ہے۔

ہم لوگوں کے صرف "شکار کرنا" یا "کمند ڈالنا" کہہ دینا کافی ہوتا تھا مگر قدیم انسان شکار کا پورا منظر اپنے اِشاروں کے ذریعہ بیان کرتا تھا۔

یہ اشاروں کی زبان بیک وقت تنگ بھی تھی اور وسیع بھی، وسیع تو ان معنوں میں تھی کہ بہت کُھلی ہوئی اور صاف تھی اور واقعات اور اشیا کی تصویریں بہت واضح ہوتی تھیں۔ تنگ اس لحاظ سے کہ اگرچہ اشارے سے "داہنی آنکھ" اور "بائیں آنکھ" بخوبی کہہ سکتے تھے لیکن صرف "آنکھ" کہنا بہت مشکل تھا۔

اِشاروں کے ذریعہ آپ کسی مادی چیز کو بخوبی ظاہر کر سکتے تھے لیکن کسی خیالی بات کو خیالی اشاروں سے بھلا کیسے واضح کیا جاتا۔

اِس کے علاوہ اشاروں کی زبان میں اور بھی خامیاں تھیں۔ مثلاً آپ رات کے وقت اِس کے ذریعہ بات نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ چاہے آپ اندھیرے میں کتنا بھی ہاتھ ہلائیں کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہی نہیں بلکہ دن میں بھی ہر موقعہ پر اور

ہمیشہ اِشاروں سے بات کرنا ممکن نہ تھا۔ کُھلے میدانوں میں تو اشاروں کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے لیکن جنگلوں میں جب شکاریوں کے درمیان درختوں کی دیواریں ہوتی تھیں تو بات کرنا قطعی ناممکن تھا۔

چنانچہ انسان کو آواز کے ذریعہ اپنی وضاحت کرنی ہی پڑی۔ شروع شروع میں ٹینگلے (حلق) اور زبان نے اس کا زیادہ ساتھ نہیں دیا اور ایک قسم کی آواز سے دوسری قسم کی آواز میں تفریق کرنا مشکل ہوتا تھا۔ ہر ایک بات ایک گرج، ایک چیخ یا ایک منمناہٹ لگتی تھی۔ انسان کو اپنی آواز کو قابو میں لاتے لاتے اور اُس میں ادائیگی کی اہلیت پیدا کرتے کرتے کافی عرصہ لگا۔

شروع شروع میں تو زبان صرف ہاتھوں کی مددگار تھی لیکن جوں جوں زبان زیادہ صفائی اور وضاحت سے بولنے لگی تو وہ پھر اس ناٹک میں اونچا کردار حاصل کرتی گئی اور زبان مسموع کو درجہ اولی حاصل ہوگیا۔

اگرچہ جسمِ انسانی جتنے بھی اِشارے کر سکتا ہے اُن میں زبان کا مُنہ کے اندر گھومنا سب سے کم دکھائی دیتا ہے مگر اس میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس کی آواز سُنی جا سکتی تھی۔

شروع شروع میں، یہ مسموع زبان بھی بہت کچھ اشاروں کی زبان سے ملتی جُلتی تھی وہ بھی اِشاروں کی زبان کے طرح ہر چیز کی صاف اور واضح تصویر کھینچتی تھی۔

یوی قبیلے کی زبان میں "چلنے" کو صرف "چلنا" نہیں کہا جاتا ہے بلکہ وہ لوگ:

قدم جما کر چلنے کو "زوڈزی ڈزی" کہتے ہیں
بھاری قدموں سے اُمرتے آدمیوں کی طرح چلنے کو "زوبوچو بوچو" کہتے ہیں۔

بہت تیز اندھا دھند چلنے کو "زوبولا بولا" کہتے ہیں
چھوٹے چھوٹے ملے جلے قدموں سے چلنے کو "زو پیا پیا" کہتے ہیں۔
آگے کو سر جھکا کر چلنے کو "زو گوؤ گوؤ" کہتے ہیں۔

اب ان میں سے ہر ایک اصطلاح بجائے خود ایک تصویر ہے جس میں چلنے کے متعلق معمولی نکتوں کو بھی بہت تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے مثلاً کوئی لفظ صرف قدم جما کر چلنے کے لئے ہے تو کوئی ایسے آدمی کے لئے ہے جو قدم جما جما کر جھومتا ہوا چلتا ہے اور کہیں ایسے شخص کو بیان کیا گیا ہے جو اپنی ٹانگیں جھکائے بغیر سیدھا چلتا ہے۔ غرض کہ چلنے کی جتنی قسمیں ہیں اتنے ہی ان کو بیان کرنے کے لئے الفاظ ہیں۔

پھر اس اشاروں کی تصویروں کی جگہ لفظوں کی تصویروں نے لے لی اور اس طرح انسان نے پہلے اشاروں اور پھر الفاظ کے ذریعہ بولنا سیکھا۔

دریا اور اُس کے مخرج

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ماضی کی اس سیر میں ہم نے کیا کیا دریافت کیا۔ اب ہم اُس ننھے مُنے سے چشمے تک پہنچ گئے ہیں جہاں سے تجرباتِ انسانی کے اس عظیم الشان دریا کا دھارا پھوٹا تھا جیسے کوئی مسافر دریا کا کنارا پکڑے پکڑے اس کے سوتے تک پہنچ جائے۔

یہاں، دریا کے اس سوتے میں ہم نے انسانی سماج کی شروعات، زبان کی شروعات اور قوت متخیلہ کی شروعات کو دریافت کر لیا۔

دریا کی خاصیت ہے کہ جیسے جیسے اور چشمے ملتے جاتے ہیں وہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی طرح انسانی تجربات کا دریا بھی برابر زیادہ وسیع اور زیادہ عمیق ہوتا

گیا کیونکہ ہر نسل کے تجربات اُس میں شامل ہوتے گئے۔

اس طرح پشتہا پشت گذر گئیں۔ ایسے بھی لوگ اور قبیلے گذرے جن کا نشان بھی باقی نہ رہا جن کے آثار مٹی میں مِل گئے اور جنہوں نے کوئی شہر اور گاؤں اپنی یادگار نہ چھوڑا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی طاقت جو ہر چیز کو روندتی اور کچلتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے اُسے کوئی چیز روک نہیں سکتی تھی لیکن انسان کا تجربہ ہی ایک ایسی شے تھا جو برابر بڑھتا رہا اور وقت کی بھی طاقت پر فتح پا کر اُس نے زبان، سائنس اور ہنر کی صورت میں اپنے لئے ابدی زندگی حاصل کی۔ زبان کا ہر ایک لفظ فن اور ہنر کی ایک ایک حرکت، سائنس کا ایک ایک تصور یہ سب پشتہا پشت کے لوگوں کے مِلے جُلے تجربات کا نچوڑ ہے۔

اِن تمام نسلوں کا کام ضائع نہیں ہُوا بالکل اُسی طرح جیسے ان ننھے چشموں کا پانی ضائع نہیں جاتا جو کسی بڑے دریا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ تجربات انسانی کے اس دھارے میں قدیم لوگوں اور موجودہ زمانے کے لوگوں کا کام ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک مکمل شکل اختیار کر گیا ہے۔

تو گویا اس طرح ہم اس دریا کے سوتے تک پہنچ کر زندگی کے اولین سرے تک پہنچ گئے اور ہم نے انسان کے وجود کو دریافت کیا۔ ایک ایسی ہستی کے وجود جو کام کرتی ہے، بولتی ہے اور سوچنے کی قوت رکھتی ہے۔

اور جب ہم اُن ہزار ہا سال کی مدت کو دیکھتے ہیں جو انسان اور بندر کے درمیان پھیلی ہوئی ہے تو ہم انگریزی کے اُس عاقلانہ قول کا خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "کام نے انسان کو جنم دیا"

حصّہ دوم

دلی کے شباب کا زمانہ

پہلا باب

ایک غیر آباد گھر میں

جب لوگ کسی گھر کو چھوڑ دیتے ہیں تو اُس گھر میں بہت سی ایسی ٹوٹی پھوٹی چیزیں نظر آتی ہیں جنہیں رہنے والے کوڑا کرکٹ سمجھ کر پھینک گئے ہیں کہیں خالی کمروں کے فرش پر کاغذ کے پُرزے بکھرے ہیں تو کہیں ٹوٹی ہوئی پیالیاں اور پرانے ڈبے لڑھک رہے ہیں کہیں بجھے ہوئے چولہے پر پرانے گرد سے پڑی ہوئی پتیلیاں ہیں تو کسی طرف سے ایک بغیر چمنی کا لیمپ اس منظر پر عبرت کی نظر ڈال رہا ہے کسی کونے میں ایک پرانی گدے دار کرسی پڑی اونگھ رہی ہے جس کے نچے ہوئے غلاف میں سے مونجھ کے پھونسڑے جھانک رہے ہیں اور ایک ٹانگ لنگڑی ہے اب اس سب سامان کو دیکھکر بھلا آپ کیا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس گھر کے رہنے والے کیسے رہتے سہتے ہوں گے۔

اور بالکل یہی مرحلہ آثارِ قدیمہ کے ماہر کے سامنے بھی ہوتا ہے کیونکہ وہی ایسا شخص ہوتا ہے جو سب کے چلے جانے کے بعد اس گھر میں داخل ہوتا ہے اور یہ بھی غنیمت ہوتا اگر کم از کم اس کو گھر کی چاروں دیواریں ہی سلامت ملیں

جائیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اکثر ایسے وقت میں وہاں پہنچتا ہے جب اس گھر کے آخری رہنے والوں کو بھی وہاں سے گئے سینکڑوں سال گذر چکتے ہیں۔ گھر کی جگہ اسے صرف گری ہوئی دیواریں، اور چیزوں کے آثار ملتے ہیں اور ایسی صورت میں اگر اسے کسی برتن کا کوئی ٹوٹن بھی مل جائے تو وہ اسے غنیمت، اور کسی چیز کا پرزہ بھی مل جائے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے۔

لیکن اگر کوئی واقعی ان کی زبان سمجھتا ہو تو یہ پرانے گھر اسے کیا کچھ نہیں بتا سکتے!!

یہ پرانے قلعے جو اپنے اٹل سنگین لبادوں میں ملبوس ہیں، جن کی دیواروں پر جابجا گھاس اگ آئی ہے، انہوں نے کیا کیا واقعات دیکھے ہیں اور کن کن لوگوں کو جانا پہچانا ہے!!

لیکن ان کے علاوہ اور گھر بھی ہیں۔ قدیم ترین گھر! وہ یہ غار ہیں جنہوں نے اپنے وقت میں ان قلعوں سے بھی کچھ بڑھ کر دیکھا ہے کیونکہ آپ جانتے ایسے بھی غار موجود ہیں جن میں لوگ آج سے پندرہ ہزار سال پیشتر رہتے سہتے تھے!

یہ ہماری ایک خوش نصیبی ہے کہ پہاڑ ایک مستقل اور اٹل چیز ہیں اور ان میں بنے ہوئے غاروں کی دیواریں انسان کی بنائی عمارتوں کی دیواروں کی طرح، بیٹھ نہیں جایا کرتیں۔

ان غاروں میں سے کسی کو لے لیجئے۔ اس میں ان گنت رہنے والے آتے جاتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس میں زمین دوز پانی پھوٹ نکلا تھا اور اپنے ساتھ کیچڑ، ریت اور کنکریاں لایا۔ پھر پانی ہٹ گیا اور لوگ اس غار میں رہنے لگے۔ مٹی میں دبے ہوئے پتھر کے بھدے اور تیز اور نوکدار اوزار ہمیں اس بات کا پتہ دیتے ہیں۔ ان نوکدار اوزاروں سے قدیم لوگ گوشت کاٹا کرتے تھے،

ہڈیاں توڑ توڑ کر اُن کا گودا نکالتے تھے اور گوشت کو ہڈیوں سے علیحدہ کیا کرتے تھے۔

اِسی طرح بہت سے سال گذرے۔

لوگوں نے غار کو چھوڑ دیا اور دوسرے رہنے کو آئے۔ دیکھیے اس کی دیواریں رگڑنے کی وجہ سے چکنی ہوگئی ہیں۔ یہ غاروں میں رہنے والے ریچھ کا کام ہے جو اپنے گھر کی کھردری پتھریلی دیواروں پر اپنی پیٹھ رگڑ رگڑ کر کھجایا کرتا تھا! اور ذرا یہ دیکھیے یہاں تو وہ حضرت بہ نفسِ نفیس خود موجود ہیں! یعنی نفسِ نفیس سے مطلب ہے اُن کی کھوپڑی مع اُن کی چوڑی پیشانی اور پتلی سی تھوتھنی کے!!

ایک پرت اور اُٹھایئے تو ہمیں پھر انسانی رہائش کے آثار ملتے ہیں، کوئلہ اور الاؤ کی راکھ، منتشر ہڈیاں، پتھر اور ہڈی کے اوزار۔ یہاں پر لوگ پھر غار میں آباد ہوئے ہیں۔ ہم اِن لوگوں کو دیکھ نہیں سکتے پھر بھی اِن کے متعلق بہت کچھ اندازہ لگا کر کہہ سکتے ہیں۔ صرف ہمیں کرنا یہ ہوگا کہ جو چیزیں وہ چھوڑ گئے ہیں ان کو جانچیں۔

کسی ناواقف کی نگاہوں کے سامنے تو یہ چیزیں صرف پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جن میں آپس میں کچھ فرق نہیں ہے۔

لیکن اگر آپ اُن کو غور سے دیکھیں تو آپ کو اُن میں مستقبل کے ہتھوڑے چھریاں، آریاں، اور برمے نظر آئیں گے۔ ایک اوزار کی دھار اگر چھری کی طرح تیز ہے تو دوسرا الٹو کدار ہے تو تیسرے کے سرے پر دندانے ہیں۔

یہی چیزیں ہمارے موجودہ اوزاروں کے آباواجداد ہیں۔ ان میں سب سے پرانا ہتھوڑا ہے جو ایک گول بڑے سے پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اِسی سے وہ لوگ اور پتھروں کو توڑتے تھے، اُن کے ٹکڑے کرتے تھے اور پتھروں کے وہ پرت نکالتے تھے جن سے اُن کے اوزار بنتے تھے لیکن جہاں کہیں ہتھوڑا ہو وہاں چھینی بھی ہونی چاہیے۔

اگر ہم غار کے باشندوں کی اچھی طرح کریدیں گے تو ہمیں ہتھوڑے دادا

کے پاس ہی کہیں نانی چھینی بھی مل جائیں گی۔
مگر ہتھوڑے دادا پتھر کے ہیں
اور نانی چھینی ہڈی کی بنی ہوئی ہیں۔

یہ مسکتی ٹانگ والی بڑی بی ہمارے موجودہ برمے کی دادی ہیں لیکن اگر آپ انہیں غور سے دیکھیں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ اپنا کام بخوبی کر لیتی ہوں گی کیونکہ ان پر جگہ جگہ ہتھوڑے کی چوٹ کے نشان دکھائی دے رہے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ جب ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہوگی تو بڑی بہادری سے برابر کھڑی رہتی ہوں گی۔

اب یہ اوزار ہمیں کیا بتاتے ہیں؟

وہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ غاروں کے یہ نئے رہنے والے پہلے رہنے والوں سے بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔

ان ہزار ہا سال کے عرصہ میں انسان کا کام بہت زیادہ متنوع اور پیچیدگی حاصل کر چکا تھا۔ پہلے ہر طرح کے کاموں کے لئے پتھر کا صرف ایک ہی اوزار استعمال کیا جاتا تھا جو تیز ہوا کرتا تھا۔

اب وہ لوگ ایک اوزار سے کاٹتے تھے، دوسرے سے پھاڑتے تھے، تیسرے سے چھیلتے تھے، چوتھے سے کوٹتے تھے وغیرہ۔ یہ اوزار جس میں نوک بنی ہوتی ہے برمے اور کیل کا کام دیتا تھا جس سے وہ چمڑے کے کپڑے سیتے وقت اس میں چھید کرتے تھے اور یہ دوسرا جس میں دندانے ہیں یہ چھینی کا ہے اِس سے وہ گوشت کاٹتے تھے اور کھال چھیلتے تھے، اور یہ دوسرا جس کے سرے پر بہت ہی زیادہ تیز نوک ہے، بھالے کا کام دیتا تھا۔

اس طرح ظاہر ہے کہ انسان زیادہ کام کرنے لگا تھا اور اپنے کام میں زیادہ محنت اور توجہ بھی کرنے لگا تھا۔ اس کو سخت اور سرد موسم کا مقابلہ کرنا پڑا تھا

اور اُسے یہ فکر کرنی پڑی تھی کہ ریچھ کے چمڑے کا لباس بنوایا جائے، جاڑے کے لئے گوشت اکٹھا کر کے رکھا جائے اور رہنے کے ایسے گھر بنائے جائیں جہاں سردی سے بچاؤ ہو سکے

اور ان تمام کاموں کے لئے ایک اوزار، چاہے وہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو کام نہیں دے سکتا تھا۔ اس کو اوزاروں کے ایک پورے سیٹ کی ضرورت تھی

اور چنانچہ اس طرح اپنے آبا و اجداد کے ان پرانے قدیم گھروں میں ہماری ملاقات اپنے موجودہ اوزاروں کے آباو اجداد سے بھی ہوئی۔

لیکن ہمیں صرف وہی چیزیں مل سکتی ہیں جنہیں وقت نے محفوظ رکھا ہے اور وقت کوئی اچھا محافظ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ہمارے لئے صرف وہی چیزیں محفوظ رکھ سکا ہے جو سب سے زیادہ مضبوط اور پائدار تھیں۔ یعنی جو پتھر اور ہڈیوں کی بنی ہوئی تھیں اور باقی تمام چیزیں جو لکڑی یا چمڑے کی بنی ہوئی رہی ہوں گی انہیں وقت نے نیست و نابود کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں وہ سوا تو مل گیا لیکن وہ لباس نہیں ملا جو اس سوئے کی مدد سے سیا گیا ہوگا۔ بھالے کی نوک تو مل گئی لیکن جس لکڑی کے سرے میں یہ نوک لگی رہی ہو گی وہ نہ مل سکی

خیر آئیے ہم اپنی تلاش جاری رکھیں۔

کھدائی کا کام عموماً اوپر سے نیچے کی طرف کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے بلند ترین سطح کھودی جاتی ہے پھر اس سے نیچے اور پھر اس سے اور نیچے۔ یہاں تک کہ زمین کی تہہ اور تاریخ کی آخر ترین حد آجاتی ہے لیکن آثارِ قدیمہ کا ماہر اپنی کتاب کو دوسری طرف سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔ وہ آخری باب سے شروع کرتا ہے اور پہلے باب پر لاکر ختم کرتا ہے۔

ہم نے بھی اپنا افسانہ دوسری طرف سے شروع کیا ہے۔ سب سے نچلی سطح

سے شروع کرتے ہوئے غاروں کی تاریخ والے باب سے گذر کر اب ہم رفتہ رفتہ اُوپر اپنے موجودہ زمانہ تک، پہنچتے جا رہے ہیں۔

پچھا تو پھر ان غاروں کو کیا ہوا اور اُن پر کیا گذری؟ مختلف طبقات کا معائنہ کرنے کے بعد ہم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں نے کئی مرتبہ ان غاروں کو چھوڑا اور کئی بار پھر اُس میں آکر بسے۔ جب ان غاروں میں لوگ نہیں رہتے تھے تو یہ ریچھوں اور لکڑ بھگوں کا مسکن ہوا کرتا تھا یا پھر مٹی اور دھول سے بھرے رہا کرتے تھے۔ بہت سالوں بعد جب انسانوں کے ایک اور جتھے نے اس پر قبضہ کیا تو کوئی آثار باقی نہ تھے جن سے معلوم کیا جا سکتا کہ اس غار کے پہلے رہنے والے کون تھے۔

اسی طرح سالہا سال گذرتے گئے۔ صدیاں گذر گئیں۔ ہزاروں برس گذر گئے۔ لوگوں نے اپنے لیے کھلے آسمان کے نیچے گھر بنانے شروع کر دیئے اور اُن محفوظ مقامات کو چھوڑ دیا جو قدرت نے ان کے لیے بنائے مہیا کئے تھے۔

اب ان غاروں میں صرف گڈریئے رہتے تھے اور وہ بھی تھوڑے عرصے کے لئے جب وہ اپنی ریوڑ چرایا کرتے تھے یا پھر مسافر اِن میں پناہ لیتے تھے جو پہاڑوں میں بھٹک جایا کرتے تھے۔

آخر کار ہم غاروں کی اس تاریخ کے آخری اور اختتام کے باب پر آ پہنچے۔ اس مرتبہ لوگ پھر اِن غاروں میں پہنچے مگر وہاں رہنے سہنے کے لئے نہیں بلکہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جو لوگ ان غاروں میں بستے تھے وہ کس طرح رہتے سہتے تھے۔

درماضی کے ان سیاحوں نے ایک ایک ورق پلٹ کر ان غاروں کی تاریخ کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔

تمام ادواروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کر کے انہوں نے یہ دریافت کیا کہ کیسے نسلاً بعد نسلاً انسان کی قابلیت بڑھتی گئی، اُس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ اُس نے

دیکھا کہ انسان کے اوزار ان ہزاروں سال میں تبدیل ہوئے بغیر نہ رہے اور دن بدن بہتر سے بہتر ہوتے گئے۔ کُند دھار والی بھدی کلہاڑی کی جگہ تیز نوک والے بھالے برمے اور چقماق کی پرت کے سوؤں نے لے لی پتھروں کے اوزاروں کے ساتھ ساتھ ہڈیوں اور سینگوں کے اوزار بھی شامل ہو گئے اور اُس ہتھوڑے کے پاس، جس سے پتھر کے اوزار بنائے جاتے تھے، اب ایسے اوزار بھی نظر آنے لگے جن سے ہڈی، لکڑی اور چمڑے کی چیزیں بنائی جا سکتی تھیں۔

اب اُسی پتھر سے انسان کاٹنے کے لئے چھینی، اور چمڑا صاف کرنے کے لئے رینی اور لکڑی میں سوراخ کرنے کے لئے برما بھی بنانے لگا۔

انسان کے نقلی دانت اور پنجے زیادہ تیز اور معمولی دانتوں اور پنجوں سے کہیں زیادہ مختلف ہو گئے تھے۔

لمبا ہاتھ

جب انسان نے نیزہ بنایا اور اس کے سرے پر پتھر کی بنائی ہوئی ایک نوک لگائی تو اُس نے اپنے ہاتھ کی لمبائی کو بڑھا لیا

اور اس بات نے اس کو زیادہ مضبوط، زیادہ بہادر بنایا۔

پہلے جب انسان کا سامنا کسی ریچھ سے ہو جاتا تھا تو مارے ڈر کے اس کے اوسان خطا ہو جاتے تھے اور وہ بھاگ نکلتا تھا۔ غاروں کے ان بالدار باسیوں کے آگے انسان کی مجال نہ تھی کہ ٹھہر سکے۔ چھوٹے چھوٹے جانوروں پر تو وہ بخوبی قابو پا کر ان کو مار لیتا تھا لیکن ریچھ کا مقابلہ کرنے کی ہمت اس میں بھلا کہاں! وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دفعہ اگر ریچھ کے پنجوں میں پھنس گئے تو سلامت آنا معلوم!

اور یہی حالت اس وقت تک رہی جب تک کہ انسان نے اپنے ہاتھ میں نیزہ

سنبھال لیا۔ اس نیزہ نے اس کو طاقت بخشی۔ اب جب وہ کسی ریچھ کو دیکھتا تھا تو بھاگ نہیں نکلتا تھا بلکہ سیدھا اس پر چڑھ دوڑتا تھا۔

ریچھ اپنے پورے قد سے کھڑا ہو کر شکاری پر جھپٹ پڑتا تھا لیکن ابھی انسان تک اس کے پنجے پہنچ بھی نہ پاتے تھے کہ نیزہ کی نوک اس کے بالدار سینے میں پیوست ہو جاتی تھی کیونکہ نیزہ کی لمبائی ریچھ کے ہاتھوں سے بڑی ہوا کرتی تھی۔

زخمی ریچھ، چبھن محسوس کر کے، ہاتھ پیر مارتا آگے ہی کو بڑھتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پتھر کی نوک اس کے کلیجہ میں اور زیادہ گڑتی ہی جاتی۔ ہاں بعض وقت یہ بدنصیبی ضرور ہوتی تھی کہ نیزہ کی لکڑی بوجھ برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے شکاری ہی کے ہاتھ میں چٹ سے دو ہو جاتی اور پھر ریچھ اس پر چڑھ بیٹھتا اور اس کے منہ اور کندھے اپنے پنجوں اور دانتوں سے نوچ ڈالتا۔

لیکن اکثر ایسا نہیں ہوا کرتا تھا کہ ریچھ انسان پر قابو پا جائے کیونکہ یہ وہ وقت تھا کہ انسان تنہا شکار کو نہیں جاتا تھا اور جب مدد کے لئے کسی کی چیخ پکار سنائی دیتی تو جتھے کا جتھا اس کی مدد کو دوڑ پڑتا، لوگ چاروں طرف سے ریچھ کو گھیر لیتے اور اپنی پتھر کی کلہاڑیاں مار مار کر اس کا خاتمہ کر دیتے تھے۔

اس طرح نیزہ کی وجہ سے انسان کو اتنا مالِ غنیمت حاصل ہوا جتنا اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ ابھی تک غاروں میں پتھر کے ایسے گودام بنے ہوئے ملتے ہیں جن میں ریچھ کی ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر لوگ ریچھ کا اس قدر گوشت جمع کر کے رکھ سکتے تھے تو شکار ضرور خوب کامیاب ہوا کرتا ہوگا۔

اگر انسان ہمیشہ ریچھ ایسے بھدے جانوروں پر ہی قانع رہتا تو نیزہ سے تمام کام نکل سکتے تھے لیکن انسان تو اور جانوروں کا بھی شکار کرنا چاہتا تھا جو ریچھ سے زیادہ تیز دوڑنے والے اور پھرتیلے تھے۔

جب انسانوں کے یہ جھنڈ میدانوں میں گھومتے پھرتے تو انہیں جنگلی گھوڑوں اور نیل گایوں کے گلے نظر پڑتے۔ وہ دبے پاؤں اُن کی طرف کھسکتے لیکن ذرا سی سرسراہٹ ہوتے ہی وہ چوکنے ہو جاتے اور ہوا کی طرح یہ جا وہ جا۔

ابھی تک انسان کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہوئے تھے کہ وہ گھوڑوں اور نیل گایوں کا شکار کر سکے۔

پھر شکار ہی کے ذریعہ انسان کو ایک نئی اور بہت مضبوط چیز ہاتھ لگی۔ ہڈی پتھر کی ایک چھینی سے انسان نے اس ہڈی میں سے ایک تیز نوک نکال لی۔

اس نوک کو اس نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے سرے پر لگا دیا اور اب اس کے ہاتھ میں ایک نیا اسلحہ تھا۔ تیر

بھاگتے ہوئے گھوڑے کو بھاری نیزہ پھینک کر نہیں مارا جا سکتا تھا لیکن ہڈی کی اس تیز نوک والے تیر سے نشانہ لگایا جا سکتا تھا اور یہ جاتا بھی دور تھا چنانچہ اس طرح انسان کا ہاتھ کچھ اور لمبا ہو گیا۔ اس ہلکے اسلحہ یعنی تیر کے ذریعہ اب وہ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر بھی نشانہ لگا سکتا تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ بھاگتی ہوئی شے پر نشانہ لگانا کوئی آسان بات نہ تھی اس کے لئے مضبوط بازوؤں اور صحیح نگاہ کی ضرورت تھی۔

شکاریوں کو بچپن ہی سے تیر پھینکنے کی مشق کرنی ہوتی تھی اور پھر بھی اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سینکڑوں تیر پھینکے گئے تو کہیں ایک درجن جا کر صحیح نشانے پر بیٹھے۔

زمانہ گذرتا گیا۔ ہزاروں سال نکل گئے۔ گھوڑوں اور ہرنوں کے گلے کم ہوتے گئے بہتوں کو انسان ہی نے ختم کر دیا تھا۔ شکاری اکثر خالی ہاتھ لوٹنے لگے۔ اب کسی ایسے اسلحے کی ضرورت تھی جس سے تیر دور پھینکا جا سکے۔ انسان کے ہاتھ کو ابھی اور لمبا ہونے کی ضرورت تھی۔

اور پھر انسان نے ایک نیا اسلحہ ایجاد کیا۔

اُس نے ایک لچکدار شاخ کاٹی، اسے بیچ میں سے جھکایا اور دونوں سروں کو چمڑے کی ایک پٹی کے چلّے سے باندھ دیا۔

اب شکاری کے ہاتھ میں کمان بھی آ گئی۔

جب وہ چلّے کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچتا تھا تو اُس کے بازوؤں کی طاقت کھنچ کر اس میں جمع ہو جاتی تھی اور جب چھوڑتا تھا تو یہ تمام طاقت ایک دم جھٹکے سے کھنچ کر تیر میں منتقل ہو جاتی تھی اور پھر کھلے میدان میں یہ تیر ایسا جاتا تھا جیسے شکار کے پیچھے تھا۔ ہماری نظروں میں تیر کمان جوڑواں بھائی بہن ہیں حالانکہ بہن بھائی سے ہزاروں سال چھوٹی ہے۔

انسانوں کو کمان بناتے بناتے ہزاروں سال لگ گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے تیر ان کمانوں میں استعمال کئے اور پھر انہوں نے ان کمانوں کو قد آدم کے برابر بڑا بنایا۔

اِس طرح انسان نے اپنے چھوٹے سے کمزور بازوؤں کو زیادہ لمبا اور مضبوط بنایا

جب اُس نے اپنے تیروں کی نوک کے لئے بارہ سنگھے کے سینگ اور ہیمتھ کے اگلے دانت استعمال کئے تو اُس نے گویا اِن جانوروں کے اوزار اُن کے ہی خلاف پھیر دئے اور دُنیا میں اِنسان ہی ایک واحد جانور ہے جو ایسا کر سکتا تھا۔

تیر کا نشانہ لگانے اور کمان کا چلّہ کھینچنے والا ہاتھ کوئی معمولی ہاتھ نہ تھا۔ وہ ایک دیو کا ہاتھ تھا۔

اور جب یہ نوجوان دیو شکار کرنے باہر نکلا تو اُس نے ایک دو جانوروں کا تو کیا ذکر گلے کے گلے صاف کر دئے۔

زندہ آبشار

فرانس میں ایک مقام ہے ہے دلیونر ہے اور وہاں ایک بڑی سی بالکل عجیب سی

چٹان کھڑی ہے۔ اس چٹان کے چھیدے میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے ہڈیوں کا ایک بڑا ذخیرہ کھود کر نکالا ہے۔ ان میں میمنے کی ہڈیاں ہیں، قدیم مویشیوں کی ہڈیاں ہیں، اور غار میں رہنے والے ریچھوں کی کھوپڑیاں ہیں۔

لیکن ان میں زیادہ تعداد گھوڑوں کی ہڈیوں کی ہے۔ کہیں کہیں تو ان ہڈیوں کے کئی کئی فٹ اونچے ڈھیر ہیں، آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لاکھوں گھوڑوں کی ہڈیاں ہوں گی۔

گھوڑوں کا یہ قبرستان کہاں سے آگیا۔

جب ان ہڈیوں کا معائنہ کیا گیا تو سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ بہت سی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، اکھڑی ہوئی تھیں اور چھل گئی تھیں اور سراغ لگانے پر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ گھوڑوں کا قبرستان نہیں بلکہ باورچیخانے کی بچی کھچی ہڈیوں کا ڈھیر ہے۔

اس طرح کا بڑا سا ڈھیر ایک دو سال میں اکٹھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ لوگ لگاتار سالہا سال تک اس جگہ پر رہتے بستے رہے۔

لیکن اس کوڑے کا ڈھیر خاص اسی مقام پر کیوں اکٹھا ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ گھوڑوں کے ان قدیم شکاریوں نے کسی ہموار مقام کے بجائے اس چٹان پر ڈیرا جما یا ہو۔

ضرور ایسا ہوا ہوگا کہ: جب شکاریوں نے کھلے میدان میں گھوڑوں کے گلے کو دیکھا تو وہ چپکے چپکے دبے پاؤں، لمبی لمبی گھانس اور جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے، ان کی طرف بڑھے۔ ہر شکاری کے ہاتھ میں کئی کئی تیر تھے۔ آگے والوں نے اشارے کے ذریعہ بتایا کہ گھوڑے کہاں ہیں، کتنے ہیں اور کس سمت کو جا رہے ہیں اب شکاریوں کے ایک گھیرے نے گھوڑوں کے گلے کے گرد گھیرا ڈال دیا اور دھیرے دھیرے یہ دائرہ تنگ ہو تا گیا۔ گھوڑے جو دور سے پہلے ان میں دھبوں کی طرح نظر آتے تھے اب صاف نظر آنے لگے۔ ان کے بڑے بڑے سر، سبک ٹانگیں، خم کھاتی ہوئی گردنیں

کہ ایال، ان کے لمبے لمبے اُونی بالوں سے ڈھکے ہوئے جسم نجو بی دکھائی دینے لگے لیکن اب وہ چوکنے بھی ہو گئے اور دشمن کی بُو سونگھ کر بھاگ کھڑے ہونے پر تیار ہو گئے لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا بھاگتے کہاں؟ تیروں کی ایک بوچھاڑ نے ان کو آلیا جیسے بہت سی لمبی چونچوں اور بے پروں والے گِدھ اُن پر ٹوٹ پڑے ہوں۔

تیر ان کے پہلوؤں میں، پیٹھ میں گردن میں پیوست ہو گئے۔ اب کدھر بھاگیں؟ اس میدان میں جو یکایک اُن کا جیتا جاگتا دشمن بن گیا تھا صرف ایک ہی راستہ، ایک ہی دروازہ باقی رہ گیا تھا۔ وحشیانہ طریقے سے ہنہناتا ہوا پورا گلے کا گلہ، شکاریوں سے بچنے کے لئے اس راستہ کی طرف دوڑا لیکن یہی تو شکاری چاہتے تھے، وہ تو خود اُس پورے گلے کو اُسی طرف دوڑا رہے تھے اور چٹان سے نزدیک تر کرتے جاتے تھے خوف کے مارے پاگل ہو کر گھوڑے آگے ہی بڑھتے گئے اور انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جا کہاں رہے ہیں، اُن کی دُمیں ہوا میں اُڑ گئی تھیں، منہ میں جھاگ بھر آیا تھا اور وہ ہوا کی طرح دوڑتے جا رہے تھے جیسے کسی زندہ دریا کا تُند دھارا! اور یہ دریا اُس اونچے مقام کی طرف بڑھتا ہی گیا، اور پھر یکایک ۔ چٹان! اِس گلے میں جو سب سے آگے دوڑنے والے تھے وہ کنارے پر پہنچ چکے تھے اور اب انہیں خطرہ دکھائی دیا، وہ اپنے پچھلے پاؤں پر اکڑ گئے ہوئے اور زور سے ہنہنائے لیکن رک نہ سکے ان کے پیچھے آنے والے دباؤ ڈال رہے تھے اور انہیں آگے ڈھکیل رہے تھے۔

اور آخر کار یہ دھارا زندہ آبشار کی طرح، اُس بلندی سے گرنے لگا اور نیچے خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں بن کر رہ گیا۔

شکار ختم ہو گیا۔ چٹان کے پیندے میں الاؤ لگائے گئے۔ بوڑھی عورتوں نے مالِ غنیمت تقسیم کیا جس پر تمام جتھے کا حق تھا مگر اس میں سے بہترین ٹکڑے

سب سے ہوشیار اور بہادر ترین لوگوں میں تقسیم کیے گئے۔

نئے لوگ

جب ہم گھڑی میں گھنٹے کی سوئی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھمی ہوئی ہے لیکن جب ایک، دو گھنٹے گذر جاتے ہیں تو پھر ہمیں یقین آتا ہے کہ سوئی چل رہی ہے۔

یہی حال لوگوں کی زندگی کا بھی ہے۔ خود ہم میں اور ہمارے چاروں طرف، جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ ہمیں محسوس نہیں ہوتیں گھنٹے کی سوئی کی طرح تاریخ کی سوئی بھی ہمیں رُکی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یکایک کئی سال گذر جانے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سوئی کھسک چکی ہے اور ہم خود بھی اس کے ساتھ کھسک چکے ہیں اور ہمارے چاروں طرف تمام چیزیں تبدیل ہو چکی ہیں۔

اگر ہم موجودہ لوگ بھی ہمیشہ اس تنوع کو نہیں دیکھ سکتے تو پھر ہمارے آباواجداد جو آج سے ہزارہا سال پہلے تھے تبدیلیوں کو محسوس کرنے سے اور بھی زیادہ قاصر تھے۔

ہمارے پاس ڈائریاں ہوتی ہیں، تصویریں ہوتی ہیں، اخبارات اور کتابیں ہوتی ہیں جن کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے ہم نئے اور پرانے زمانے کا موازنہ کر سکتے ہیں لیکن ہمارے آبا کے پاس موازنہ کرنے کے یہ ذرائع کہاں تھے۔ زندگی ان کے لئے منجمد اور غیر متحرک تھی کیونکہ نئے اور پرانے کا موازنہ کئے بغیر تبدیلیوں کا اندازہ کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کسی ایسی گھڑی پر سوئیوں کی رفتار جس پر اعداد لکھے نہ ہوں۔

اس زمانہ کے ہر صنعت ساز نے پتھر کے اوزار بناتے وقت بالکل ان

ہی حرکات اور اُن ہی قواعد کی نقل کی جیسے اُس کے سکھانے والے اُستاد نے کی تھی. جب وہ لوگ اپنے گھر بنا رہے تھے تو عورتوں نے بالکل اُسی طرح چولھے بنائے جیسے ان کی دادیوں نے بنائے تھے شکاری اُن ہی قواعد کے مطابق شکار کرتے رہے جو مروج تھے پھر بھی غیر شعوری طور پر لوگ برابر اپنے اوزار دل گھروں اور اپنے کام کاج میں تبدیلی کرتے گئے۔

ہر ایک نیا اوزار شروع شروع میں پُرانے اوزار سے ہوبہو ملتا جلتا تھا پہلا تیر بھالے کی نوک سے بالکل مشابہ تھا لیکن تیر اور بھالا بہر حال دو مختلف چیزیں تھیں اور پھر تیر کمان سے شکار کرنا تو کسی صورت سے بھی بھالے سے شکار کرنے سے مشابہ نہیں کہا جا سکتا۔

صرف یہی نہیں کہ انسان کے اوزار ہی تبدیل ہوتے ہوں بلکہ انسان بذاتہ خود بھی بدلا اور یہ اُن ڈھانچوں سے ظاہر ہے جو کھدائی میں ملتے رہے اگر آپ اُس آدمی کا جو پہلے پہل غار میں آباد ہوا تھا اُس آدمی سے مقابلہ کریں جس نے برفانی دور کے اختتام پر غار کو چھوڑا، تو آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ دو بالکل مختلف ہستیاں ہیں۔

نیانڈرتھال والا انسان جب غار میں داخل ہوا تھا تو ہنوز اس میں اپنے بندر آبا کے آثار باقی تھے۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی اس کی چال بھدی تھی اس کے چہرے پر پیشانی اور ٹھوڑی برائے نام تھی لیکن کرو میگنن انسان سیدھا اور پوری نشو نما پایا ہوا تھا اور دیکھنے میں ہم لوگوں سے بہت ہی کم مختلف تھا۔

اِن دونوں میں اس قدر زیادہ فرق ہے کہ بعض ماہرین آثار قدیمہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ دو بالکل مختلف ہی ہستیاں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ کرو میگنن انسان کسی دور دراز مقام سے آیا تھا اور اس نے پہلے رہنے والوں کو

مار بھگایا اور اُن کو صفحہ ہستی سے میٹا دیا بعض ماہرین آثار قدیمہ اس خیال پر قائم ہیں اور ظاہر ہے کہ اس خیال کے لوگوں سے یہ منوانا ناممکن ہے کہ کرو میگنن انسان وہی تھا جو پہلے نیانڈر تھل تھا۔

مکانوں کی تاریخ کا پہلا باب

جیسے جیسے انسان بدلا اس کے رہنے کے مکانات بھی بدلے۔

اگر ہم مکانات کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمیں غار سے شروع کرنا ہوگا انسان نے اپنا گھر بنایا نہیں تھا بلکہ پایا تھا۔ یہ مکان قدرت نے اس کے لیے مہیا کیا تھا۔

لیکن قدرت مکان بنانے میں کوئی خاص ماہر نہیں ہے۔ جب اُس نے پہاڑوں کو ادھر سے اُدھر کھسکا کر اُس میں غار بنائے تو اُسے بھلا اس کی کیا پرواہ تھی کہ کوئی اس میں رہے گا یا نہیں۔ لہذا جب لوگ اپنے لئے غار تلاش کرنے لگے تو انہیں مشکل ہی سے کوئی ایسا غار مل سکتا تھا جو اُن کے رہنے کے لئے موزوں ہوتا۔ کمروں کی چھتیں بہت زیادہ اونچی ہوتی تھیں یا پھر دیواروں کے آپڑنے کا اندیشہ رہتا تھا یا دروازے اتنے نیچے ہوتے تھے کہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بل رینگ کر ہی داخل ہو سکتے تھے۔

لہذا گروہ کا گروہ غار کو ہموار کرنے میں لگ گیا۔ انہوں نے فرش اور دیواروں کو پتھر کی رینبوں سے اور درختوں کی ٹہنیوں کی جھاڑوؤں سے کھرچا اور چھیلا۔

دروازہ سے ذرا ہٹ کر انہوں نے چولہے کے لئے ایک گڑھا کھودا اور اس میں چقماق کے پتھروں کی تہہ جمائی۔ عورتوں نے بچوں کے بچھونے سکھے۔ بچھونے کے لئے وہ لوگ زمین میں ایک گڑھا کھودتے تھے اور پروں کے گدوں کی

بجائے چولہے کی نکلی ہوئی گرم راکھ اس میں جما دی جاتی تھی۔
دور ایک الگ تھلگ کونے میں انہوں نے گودام بنایا جس میں ریچھ کا گوشت اور کھانے پینے کی اور چیزیں رکھی گئیں۔
اس طرح انہوں نے قدرت کے بنائے ہوئے اس غار کو ٹھیک ٹھاک کر کے اپنی محنت کے ذریعہ اپنے لئے مکان کی صورت میں تبدیل کر لیا۔
جیسے جیسے وقت گذرتا گیا یہ لوگ اپنے مکانوں کے متعلق اور زیادہ محنت کرنے اور تکلف برتنے لگے۔ جہاں کہیں انہیں کوئی چٹان نکلی ہوئی دکھائی دیتی جس کے نیچے سایہ ہوتا تو وہ اس کو دیواروں سے گھیر لیتے اور اگر دیواریں مل جاتیں تو اُن پر چھت بنا لیتے۔
اس قسم کا ایک قدیم مکان دکھنی فرانس کے پہاڑوں میں محفوظ ہے۔ وہاں کے مقامی لوگ اس کو "بھوتوں کا آتش دان" کہتے ہیں کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ اس مہیب غار کے اندر صرف بھوت ہی بیٹھ کر آگ تاپ سکتے ہوں گے۔ اگر وہ اپنے آباؤ اجداد کی داستان سے بہتر طریقہ پر واقف ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ "بھوتوں کا یہ آتش دان" جناتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی کاریگری ہے۔
اس مقام پر کسی زمانے میں قدیم لوگوں کو ایک ایسی چٹان ملی جو آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ اس چٹان کے کچھ حصے ٹوٹ کر گر گئے تھے جن کی وجہ سے دو طرف دیوار سی بن گئی تھی اب ان لوگوں نے دو دیواریں اور بنا لیں، جن میں سے ایک تو پتھر کی تھی اور دوسری اس طرح بنائی گئی تھی کہ ڈالیاں اور ٹہنیاں آر پار لگا کر اُن پر چھپرا چھا دیا گیا تھا۔ اس موخرالذکر دیوار کے متعلق ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کیونکہ وقت نے اس کو قطعی نیست و نابود کر دیا ہے۔
یہ دیواریں ایک مٹی کے جھونپڑے کو گھیرے ہوئے ہیں بلکہ جھونپڑا ابھی

زمین دوز جھونپڑا سمجھئے! اس زمین دوز جھونپڑے کے پیندے میں چقماق کے پرت اور چھلکے اور ہڈیوں اور سینگوں کے اوزار وغیرہ میں جواب تک محفوظ ہیں۔

یہ "بھوتوں کا آتش دان" آدھا گھر ہے اور آدھا غار، سچ مچ کے گھر سے بالکل مختلف۔

لیکن جب انسان نے دو دیواریں بنانا سیکھ لیا تو پھر چار دیواریں بنانا سیکھتے اُسے کیا دیر لگتی تھی اور پھر دیکھ ہی لیجئے کہ کھلے آسمان کے نیچے پہلے گھر نظر آنے لگے۔ یہ گھر بھی، آجکل کے گھروں کی مانند نہ تھے بلکہ گڑھوں کی طرح تھے قدیم لوگ زمین میں ایک بڑا سا گہرا گڑھا کھود لیتے تھے۔ کھائی کی طرح۔

دیواروں کو گرنے سے بچانے کے لئے وہ پتھر اور میمتھ کی بڑی بڑی ہڈیوں کا سہارا لگا کر اُس کا روک کرتے تھے، برفباری اور ہواسے بچنے کے لئے وہ لکڑیوں کو جھکا جھکا کر آپس میں پرو دیتے تھے اور پھر اس پر مٹی لیپ دیتے تھے اب اس چھت کی شکل ایسی ہو جاتی تھی جیسے کوئی گول پیالہ اُلٹا ہوا رکھا ہے۔

یہ گھر دیکھنے میں بڑا عجیب سا لگتا تھا باہر سے صرف اس کی چھت دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا گول گنبد ہو اس میں داخل ہونے کا ایک ہی دروازہ تھا یعنی چمنی کے ذریعہ جہاں سے دھواں نکلتا تھا۔ پورے گھر میں صرف یہی راستہ کھلا ہوتا تھا۔

بنچوں کی بجائے وہ میمتھ کے جبڑے کی ہڈیاں، مٹی کی دیوار سے اڑا کر رکھتے تھے اور دھرتی ماتا اُن کے لئے پلنگ کا کام دیتی تھی۔ ایک مربع جگہ صاف کر کے کوٹ پیٹ لی جاتی تھی اور لکڑی کا ایک گدّھا گاؤ تکیہ کا کام دیتا تھا۔

اس ہڈی کے بنچوں اور مٹی کے پلنگوں والے گھر میں میزیں پتھر کی ہوا کرتی تھیں۔ یہ آتش دان کے پاس، یعنی جو سب سے زیادہ روشن مقام ہوتا تھا

وہ اپنی کام کرنے کی میز جمانے تھے جو پتھر کی چکنی پٹیوں کا ہوتا تھا۔ اوزار، چیزوں کے ٹکڑے اور نامکمل سامان ابھی تک اس کام کی میز پر اسی طرح رکھے ہیں۔ میز پر ہڈیوں کے موتی بکھرے پڑے ہیں، کچھ ختم ہو چکے ہیں، ان کو چکنا کیا جا چکا ہے۔ ان میں چھید ڈالے جا چکے ہیں، بعض ادھورے ہی پڑے ہیں۔ بنانے والے نے ہڈی کے ایک لمبے سے ٹکڑے پر کاٹنے کے لئے نشانات تو ڈال لئے تھے لیکن موتی بنانے کے لئے انہیں علیحدہ علیحدہ کاٹنے کی مہلت اسے نہ مل سکی۔ کسی خاص بات نے ان کے کام میں رخنہ ڈال دیا اور لوگوں کو ایک دم اپنا گھر چھوڑ کر جانا پڑا۔

ظاہر ہے کہ خطرہ بہت ہی بڑا ہوگا ورنہ وہ لوگ اس خوبصورتی اور محنت کی بنائی ہوئی چیزیں، یوں چھوڑ کر نہ بھاگتے اور چیزیں بھی کیا کیا؟ ہڈیوں کی بنی ہوئی سوئیاں جن میں ناکوں کے لئے سوراخ کھودے گئے تھے، اور چقماق کے وہ تمام اوزار جو ہر قسم کی چیزیں بنانے کے کام آتے تھے۔

ان چیزوں کا بنانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک پر کئی کئی گھنٹے صرف ہوتے ہوں گے۔ مثلاً ہڈی کی سوئی ہی کو لیجئے۔ یہ انسانیت کی تاریخ میں پہلی سوئی تھی۔ دیکھنے میں تو چھوٹی سی ہے مگر اس کو بنانے کے لئے سب سے زیادہ کاریگری کی ضرورت تھی۔ اس طرح کے ایک مکان میں تو لوگوں کو اس طرح کی ہڈی کی سوئیاں بنانے کا پورا کارخانہ ملا۔ تمام اوزار، کچا مال اور ادھوری تیار کی ہوئی چیزیں ہر چیز بخوبی محفوظ تھی ایسے کہ اگر ہڈی کی سوئیوں کی مانگ ہو تو آپ کل ہی سے بنانی شروع کر دیجئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس موجودہ زمانے میں اس صنعت گری کرنے والا کاریگر ملے گا بھی کہاں!

وہ لوگ اس طرح سوئیاں بناتے تھے۔ کاٹنے کے ایک اوزار سے وہ خرگوش کی ہڈی کی ایک گول لکڑی کاٹ لیتے تھے۔ پھر وہ اس کو دندانے دار پتھر سے ریت کر ایک سرے

پر سے نوکدار بنا لیتے تھے۔ پھر ایک نوکدار پتھر سے اس کے دوسرے سرے میں ایک سوراخ کیا جاتا تھا اور پھر پوری سوئی کو پتھر پر رگڑ کر چکنا اور چمکدار کر لیا جاتا تھا۔

اب دیکھیئے کہ کتنے اوزار اور کتنا کام صرف ایک سوئی بنانے کے لئے مطلوب ہیں۔ ہر ایک جتھے اور گروہ میں ایسے ماہر کاریگر نہیں ہوتے تھے جو ہڈی کی سوئی بنا سکیں لہذا ہڈی کی سوئی اُن کے لئے بہت ہی قیمتی چیز تھی۔

آیئے ہم قدیم شکاریوں کی کسی ماں یا غار کے اندر چلیں۔ وہ دیکھیئے اس پرفیلے میدان کے بیچوں بیچ بہت سے چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں جن میں سے دھواں نکل رہا ہے۔

ہم ایک گنبد کے قریب پہنچتے ہیں اور چھت والے روزن کے ذریعہ اس جھونپڑے میں داخل ہو جاتے ہیں اور ہاں دیکھیئے دھوئیں سے اگر آپ کی آنکھیں جلنے لگیں تو گھبرایئے گا نہیں۔

فرض کیجیئے ہم وہ جادو کی ٹوپی پہنے ہوئے ہیں جس کو پہننے کے بعد انسان کسی کو نظر نہیں آسکتا۔ اب اس کھائی کے اندر اندھیرا ہے، دھواں ہے اور خوب شور وشغب ہے۔ یہاں کم از کم دس بڑے اور ان سے بھی زیادہ تعداد میں بچے ہیں۔ جب ہماری آنکھیں دھوئیں کی عادی ہو جاتی ہیں تو پھر ہم لوگوں کے چہرے اور جسم بخوبی پہچاننے لگتے ہیں۔ اب انسانوں میں بندر کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ اُن کے قد لمبے ہیں اور جسم گٹھے ہوئے اور مضبوط ہیں۔ اُن کے چہرے چوڑے اور آنکھیں قریب قریب ہیں۔ اُن کے سیاہ جسموں پر سُرخ رنگ سے مختلف ڈیزائن بنے ہوئے ہیں۔

فرش پر عورتیں بیٹھی ہوئی چمڑے کے لباس سی رہی ہیں، بچے کھلونے نہ ہونے کی وجہ سے کسی گھوڑے کی ٹانگ کی ہڈی یا ہرن کے سینگ سے کھیل رہے ہیں۔

آگ کے پاس ایک کاریگر پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھا، ایک لکڑی کے تیر میں ہڈی کی سوفار لگا رہا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک اور کاریگر پتھر کے ایک چپٹے ٹکڑے پر تصویریں کھود رہا ہے۔

چلئے ہم اس کے اور نزدیک چلیں اور دیکھیں کہ وہ کیسی تصویر کھینچ رہا ہے بلکہ کھرچ رہا ہے۔

ہاتھ کی دو چار ہلکی ضربوں سے اُس نے پتھر کے ٹکڑے پر ایک چرتے ہوئے گھوڑے کی تصویر کھینچ لی۔ جس استقلال اور کاریگری سے وہ اُس کی سبک ٹانگیں، چھوٹے ایال والی کھنچی ہوئی گردن اور اس کا ٹیڑھا سا سر بنا رہا ہے وہ حیرتناک ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گھوڑے میں جان پڑ گئی ہے گویا اب وہ آگے کو قدم اُٹھایا ہی چاہتا ہے۔ انسان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مصور کے سامنے گھوڑا ہی کھڑا ہے جسے دیکھ کر وہ ٹانگوں کی حرکت اور گردن کا موڑ بنا رہا ہے۔

گھوڑے کی تصویر ختم ہو چکی ہے مگر مصور برابر تصویر کھینچتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ گھوڑے کے جسم پر تین چار افقی لکیریں کھینچ دیتا ہے اور ایک عجیب و غریب تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ مصوری کا یہ قدیم اُستاد یہ کیا کر رہا ہے؟ ایسی اچھی تصویر کو جس پر موجودہ زمانہ کے مصوروں کو بھی رشک ہو، وہ اس طرح خراب کیوں کر رہا ہے؟

اب تصویر اور بھی زیادہ گنجلک ہو گئی۔ آخر کار ہم نے دیکھا کہ گھوڑے کے جسم پر ایک جھونپڑی کا خاکہ بن گیا۔ اسی جھونپڑی کے بالکل پاس مصور اور دو چار جھونپڑیاں بناتا ہے اور آبادی سی بن جاتی ہے۔

اس عجیب و غریب تصویر کے معنی کیا ہیں؟

کیا یہ صرف مصور کا تخیل ہے؟ یا اتفاقیہ طور پر ایسا ہوا ہے؟

نہیں! قدیم لوگوں کے غاروں میں ہمیں بہت سی ایسی عجیب و غریب تصویریں

نظر آتی ہیں کہیں کسی میمنتھ کے جسم پر دو جھونپڑے بنے ہیں تو کہیں کسی بھینسے کے جسم پر تین کٹیاں بنی ہیں اور یہ دیکھئے یہاں تو ایک پورا منظر کا منظر بنا ہے: تصویر کے بیچوں بیچ ایک بھینسے کی لاش پڑی ہے جو آدھی کھائی جا چکی ہے صرف اس کا سر ریڑھ کی ہڈی اور ٹانگیں بچ رہی ہیں۔ اس کا بالدار سر اور خم کھائے ہوئے سینگ اگلے پاؤں کے بیچ میں اٹکے پڑے ہیں۔ اس کے دونوں طرف دو قطاروں میں لوگ کھڑے ہیں اس طرح کی بہت سی گنجلک اور الجھی ہوئی تصویریں جن میں جانور اور گھر وغیرہ بنائے گئے ہیں پتھر، ہڈی اور چکنے پتھروں پر کھدی ہوئی اور چٹانوں کی دیواروں پہ محفوظ ہیں۔ جب ہم غار کی سیر کر رہے تھے تو ہمیں اس کی دیواروں پر تصویریں نہیں دکھائی دی تھیں لیکن بات یہ ہے کہ ہم تو غار کے منہ ہی پر تھے جہاں لوگ کھاتے پیتے سوتے اور کام کرتے تھے۔

چلئے ہم پھر غار کو چلیں اور اس کے کونے کھدروں اور مڑتے ہوئے راستوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ان چٹانی منصوبوں تک چلے جائیں جو اندر کبھی دو چار درجن فٹ اور کبھی کئی کئی سو فٹ گہرے ہیں۔

تصویروں کی زمین دوز گیلری

جب ہم اس طرح غار کی سیر کرنے چلیں تو ایک لالٹین ضرور ساتھ لے لیجئے گا اور ہاں ہر ایک موڑ اور ہر ایک چوراہے کا ذرا دھیان رکھئے گا یہ زمین دوز مقامات پوری بھول بھلیاں ہوتے ہیں۔

اس گلیارے میں چاروں طرف سے پتھر نکلے ہوئے ہیں اور یہ برابر پتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چھت میں سے پانی رس رہا ہے۔ ہم اپنی لالٹین کو اونچا اٹھا کر دیواروں کو برابر احتیاط سے اور غور سے دیکھتے جا رہے ہیں۔ اس زمین دوز پانی کی بدولت

غار میں چمک پیدا ہو گئی ہے مگر انسان کے ہاتھ نے یہاں کاریگری نہیں دکھائی ہے۔

ہم چلتے رہتے ہیں اور یکایک کوئی آواز دیتا ہے "یہ دیکھو!" دیوار پر سُرخ اور کالے رنگ سے کیا ہیں یہ ایک بھینسے کی تصویر کھنچی ہوئی۔ وہ اپنے اگلی ٹانگوں کے بَل گرا ہوا ہے اتیر اُس کی جھکی ہوئی کمر اور پیٹھ میں چبھے ہوئے ہیں۔

ہم رُک جاتے ہیں اور اُس مصور کی کاریگری کو دیکھتے ہیں جو یہاں آج سے ہزاروں سال پہلے تصویریں بنایا کرتا تھا۔

اور آگے بڑھ کر ہمیں ایک اور تصویر ملتی ہے۔ ایک مہیب سی ہستی دیوار پر ناچتی ہوئی بنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کوئی انسان نما جانور ہے یا جانور نما انسان! اِس دیو کے داڑھی ہے اور اس کے سر پر لمبے اور خم کھائے ہوئے سینگ ہیں اس کی پیٹھ پر ایک کوبڑ سا نکلا ہوا ہے اور گھنی جھاڑ دار سی دُم ہے لیکن اُس کے ہاتھ پاؤں انسانی ہیں اور ہاتھ میں کمان ہے۔

تصویر کو غور سے دیکھکر ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک آدمی ہے جو بھینسے کی کھال پہنے ہوئے ہے۔

اِس تصویر سے آگے بڑھکر ایک اور تصویر ہے اور پھر تیسری اور پھر چوتھی..

یہ تصویر خانہ کیسا عجیب ہے۔

آج کل کے زمانہ میں مصور ایسے اسٹوڈیو میں تصویریں بناتے ہیں جہاں روشنی اچھی طرح آتی ہو اور عجائب خانوں میں بھی ہم لوگ اُن کی تصویریں ایسی جگہ ٹانگتے ہیں جہاں سے اُن پر بخوبی روشنی پڑ سکے۔

لیکن قدیم انسان نے ان اندھیرے کمروں میں، انسانی آنکھوں اور نظر سے اوجھل، ان تصویروں کی نمائش کیوں کی؟

ظاہر ہے کہ اُس نے اپنی تصویریں اس مقصد ہی سے نہیں بنائی تھیں کہ

کوئی نہیں دیکھے۔

تو پھر قدیم مصور نے تصویریں بنائیں ہی کیوں؟ جانوروں کی کھالیں اوڑھے ہوئے یہ رقاص ہمارے لئے کیا معنی رکھتے ہیں؟

ایک پہیلی اور اُس کا جواب

"ناچ میں بہت سے شکاری حصہ لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے سر پر یا تو سچ مچ کے بھینسے کا سر ہے یا پھر کوئی بنایا ہوا سر ہے جس میں سینگ لگے ہیں۔ ہر شخص کے ہاتھ میں کمان یا برچھی ہے۔ یہ سب رقاص بھینسے کے شکار کا ناچ ناچ رہے ہیں۔ جب کوئی ناچتے ناچتے تھک جاتا ہے، تو وہ ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اب گرا ہی چاہتا ہے۔ تب کوئی اور شخص ایک کُند تیر اس کی طرف پھینکتا ہے۔ تب سب لوگ اسے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گھیرے کے باہر کر دیتے اور اس کے جسم پر جھوٹ موٹ چھُریاں مارتے ہیں پھر اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوئی دوسرا آدمی جو اُسی طرح بھینسے کا سر پہنے ہو، اس کی جگہ گھیرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعض وقت یہ ناچ دو تین ہفتے تک مسلسل جاری رہتا ہے، اور ایک منٹ کو بھی نہیں تھمتا"

قدیم شکاری رقص کے متعلق لوگ ہم سے یہ کہتے ہیں۔

لیکن یہ سب کس نے دیکھا اور کہاں دیکھا؟

اتفاقاً ہم نے ایک اپنے ہم عصر سیاح کی یادداشت میں لکھا دیکھا اور یہ بالکل اسی شکاری ناچ والی تصویر کو بیان کر دیتا ہے جو کسی قدیم مصور نے غار کی دیوار پر کھینچی تھی۔ اس سیاح نے شمالی امریکہ کے میدانوں میں یہ ناچ دیکھا تھا جہاں لوگوں نے قدیم شکاریوں کی رسم و رواج اور روایات کو اب تک قائم رکھا ہے۔

اب اس تصویر کی توضاحت ہو گئی جس نے ہم کو متحیر کر دیا تھا لیکن اس

کے جواب ہی سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسا پُر اسرار ناچ ہے جو ہفتوں چلتا رہتا ہے
ہمارے لئے ناچنا یا تو دل بہلاوا یا پھر ایک فن ہے لیکن یہ خیال کرنا ذرا مشکل ہے کہ دل بہلاوے کے لئے یا فنی اعتبار سے یہ انڈین لوگ اتنا ناچتے ہوں کہ آخر تھک کر گر پڑیں اور ناچ بھی بجائے خود ایک مذہبی رسم سی معلوم ہوتا ہے نہ کہ معمولی ناچ۔

ہمارے یہاں رقص کا کوئی اُستاد ناچ کی ہدایات دیتا رہتا ہے لیکن انڈینز میں کوئی جادوگر ہوتا ہے جو ان کو ہدایات دیتا ہے۔ جادوگر اپنے پائپ سے دھواں مختلف سمتوں کی طرف پھونکتا رہتا ہے اور جدھر وہ دھواں پھونکتا ہے اسی طرف ناچنے والے مُڑتے جاتے ہیں گویا کسی خیالی شکار کا پیچھا کر رہے ہوں۔

کبھی ادھر اور کبھی اُدھر دھواں پھینک کر یہ جادوگر ناچنے والوں کو کبھی شمال کی طرف کھسکاتا ہے کبھی مشرق کی طرف، کبھی جنوب کی طرف تو کبھی مغرب کی طرف اور اگر ناچ کی ہدایت کاری جادوگر کرتا ہے تو اس کے یہ معنی بھی ہوئے کہ یہ صرف ناچ ہی نہیں ہے بلکہ جادو کی ایک رسم بھی ہے جس سے جادو کا اثر پھیلتا ہے۔ گویا ناچنے والے اپنی ان عجیب وغریب حرکتوں سے بھینسے پر جادو کر رہے ہیں اور طلسمی طاقت کے ذریعہ اُسے میدانوں سے کھینچ بُلا رہے ہیں۔

اچھا تو غار کی دیوار پر بنے ہوئے اُس ناچتے ہوئے آدمی کی تصویر کا یہ مطلب ہے۔ وہ صرف رقاص ہی نہیں بلکہ ساحر بھی ہے اور وہ مصور جس نے ان اندھیرے کمروں میں بیٹھ کر چراغوں کی مدد سے یہ تصویریں کھینچیں وہ صرف مصور ہی نہ تھا بلکہ جادوگر بھی تھا۔ اور بھینسے کی کھال پہنے ہوئے شکاریوں یا ان کی زخمی بھینسے کی طرح گرتے ہوئے جسم کی تصویر بنا کر وہ گویا شکار کو کامیاب بنانے کے لئے طلسم کر رہا تھا اور اسے یہ پختہ یقین تھا کہ ناچ سے ضرور فائدہ ہوگا۔

ہم لوگوں کو یہ کیسی حماقت اور وحشیانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم کوئی گھر بنوانے لگتے ہیں تو معماروں اور کمانیوں کے کاموں کی نقل کر کے ناچنے تو نہیں لگتے اگر اسکول کے کسی استاد کے دماغ میں یہ سما جائے کہ رُول ہاتھ میں لے کر اپنے شاگردوں کے سامنے ناچنے لگے تو ہم اُسے سیدھے پاگل خانے کا رستہ پکڑا دیں گے لیکن ہمارے لئے جو پاگل پن ہے وہ ہمارے آباؤ اجداد کے نزدیک ایک سنجیدہ رسم تھی۔

اب ہم ایک تصویر کی پہیلی تو بوجھ چکے ہمیں معلوم ہو گیا کہ غار کی دیوار پر ناچتے ہوئے آدمی کی تصویر کیوں بنی تھی لیکن ہم اور بھی تصویریں دیکھتے ہیں جو اس سے کم تعجب خیز نہیں ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے غار میں، ایک پتھر پر ایک پوری کہانی کی کہانی ایک تیز اوزار سے کھدی ہوئی دیکھی تھی، ناچنے والوں کے درمیان ایک بھینسے کی لاش پڑی تھی جس کے اطراف شکاری کھڑے تھے، اور لاش میں سے سوائے سر اور اگلے پاؤں کے، سب کچھ کھایا جا چکا تھا۔

اس تصویر کے کیا معنی ہیں؟

اب کی مرتبہ اس تصویر کا حل دریافت کرنے کے لئے ہم امریکہ نہیں جائیں گے بلکہ دُور شمالی رُوس چلیں گے۔

سائبیریا میں، لوگوں کو اب بھی وہ زمانہ یاد ہے جب شکاری اگر کوئی ریچھ مارتے تھے تو "رسم ریچھ" منائی جاتی تھی، مرے ہوئے ریچھ کو اٹھا کر گھر میں لے جایا جاتا تھا اور بڑی شان سے گھر کے سب سے اُونچے اور معزز مقام پر اُسے رکھا جاتا تھا۔ اس کے سر کو اگلی دونوں ٹانگوں کے درمیان کر دیا جاتا تھا اور منہ کے سامنے بید کی چھال کے بنے ہوئے ہرن کے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھ دیئے جاتے تھے، یہ گویا اس کے لئے چڑھاوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سکے رکھتے تھے اور تھوتھنی پر بید

کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے پیالے سجاتے تھے۔ پھر سب شکاری آگے آ آکر اس کی ٹھوڑی کا بوسہ لیتے تھے اور یہ تو صرف اُس رسم کے شروع کا حصہ تھا، یہ رسم کئی کئی دن بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ کئی کئی رات جاری رہتی تھی۔ روزرات کو لوگ ریچھ کے بچے کھچے جسم کے پاس جمع ہوتے، اس کے آگے سر جھکاتے اور پھر ریچھ کی بھاری بھدی چال کی نقل کرتے ہوئے ناچنے لگتے۔ جب گانا ناچنا ختم ہو جاتا تو دعوت اُڑتی۔ ریچھ کا گوشت کھایا جاتا مگر اس کے سر اور اگلی ٹانگوں کو سالم چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اب ہماری سمجھ میں آگیا کہ پتھر کی اس سِل پر جو تصویر ہے اُس کے کیا معنی ہیں۔ یہ بھینسے کی رسم ہے، جیسے بھینسے کا ناچ ہوتا ہے۔ چاروں طرف جو لوگ کھڑے ہیں وہ بھینسے کا شکریہ ادا کر رہے ہیں کہ اس نے اپنا گوشت انہیں عنایت فرمایا اور اس سے استدعا کر رہے ہیں کہ آئندہ بھی اسی طرح اُن پر مہربان رہے

اب اگر ہم پھر انڈینز کی طرف واپس چلیں تو اس قسم کی شکار کی رسوم ان کے یہاں بھی ملیں گی۔ ہائیکولوں میں شکار کیے ہوئے ہرن کو مشرق رو کر کے لٹا دیتے ہیں۔ اس کے منہ کے سامنے ایک پیالہ رکھا جاتا ہے جس میں ہر قسم کے کھانے ہوتے ہیں۔ شکاری ایک ایک کر کے ہرن کے پاس جاتے ہیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے ہرن کو سر سے دم تک سہلاتے ہیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُس نے انہیں اپنی جان لینے کی اجازت دے دی اور کہتے جاتے ہیں "آپ چین کی نیند سوئیے بھائی صاحب" اور جادوگر ہرن کی طرف مُڑ کر

کہتا ہے "آپ نے ہمیں اپنے سینگ

دئے ہم اس کے عوض میں آپ

کا شکریہ ادا کرتے

ہیں"

دوسرا باب

اپنے آباؤ اجداد سے دو دو باتیں

جب ہم اور آپ بچے تھے تو شہزادوں اور شہزادیوں کی کہانیاں سُنا کرتے تھے، الف لیلا اور الہ دین کا چراغ اور چُپ چُپ شہزادی وغیرہ! ایسے جانوروں کے قصے جو آدمی بن گئے تھے اور ایسے آدمیوں کے قصے جو جب کبھی چاہتے اپنے آپ کو جانوروں کے قالب میں ڈھال لیتے تھے اگر ہم ان قصوں کو سچ مان لیں تو گویا دُنیا پُر اسرار ہستیوں سے بھری ہوئی ہے جو نیک بھی ہیں اور بد بھی، نظر بھی آتی ہیں اور روپوش بھی ہیں اور پھر اِس دُنیا میں ہر وقت انسان کو کسی جادوگر یا کسی ڈائن کی بددعا کا ڈر لگا رہے آدمی کو اپنی نظروں تک پر بھروسہ نہ رہے کہ نہ معلوم کس وقت کوئی مکروہ سا گندا مینڈک ایک خوبصورت شہزادی بن جائے اور کوئی وجیہہ جوان ایک خوفناک سانپ کی شکل اختیار کرے۔ اُن باتوں کے مطابق تو گویا ہر چیز کا ایک قانون ہی الگ ہے۔ مُردے زندہ ہو جاتے ہیں، کٹے ہوئے سر بات کرتے ہیں، تالاب میں ڈوب کر مرے ہوئے لوگوں کی روحیں مچھیروں کو پانی کے اندر گھسیٹ لیتی ہیں وغیرہ وغیرہ

جب ہم یہ پریوں اور جنوں کے قصے پڑھتے ہیں تو کم از کم اس وقت تو ہمیں ایسا ہی لگتا ہے گویا یہ سب باتیں واقعی ہوتی ہیں لیکن جب ہم کتاب بند کر دیتے ہیں تو فوراً حقیقی دُنیا میں واپس پلٹ آتے ہیں جہاں نہ جادوگر ہیں نہ چڑیلیں اور نہ ڈائنیں اور جہاں ہر بات قانون قدرت کے مطابق ہوتی ہے۔ پریوں کی وہ دنیا چاہے کتنی ہی دلفریب کیوں نہ ہو ہم اُس دُنیا میں رہنا کبھی پسند نہ کریں گے

جہاں سمجھ اور عقل کا دخل نہیں اور جہاں ان جادوؤں وغیرہ سے بچنے کے لئے پیدائشی خوش نصیب ہونا ضروری ہے۔

لیکن ہمارے آباو اجداد کے لئے یہ دُنیا بھی کچھ ویسی ہی تھی اور وہ سچ مچ کی دُنیا اور تخیلی دنیا میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کچھ ایسی نامعلوم اور خُفیہ طاقتیں ہیں جن کی خوشی اور ناخوشی پر سب کاموں کے ہونے کا دارو مدار ہے۔ ہم جب کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو اس کو اپنی بے پروائی اور حماقت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ قدیم انسان اپنے کو کبھی الزام نہیں دیتا تھا بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کسی بدروح کا کام ہے جس نے یہ پتھر اس کے راستہ میں رکھ دیا۔

جب کوئی آدمی چھُری بھونکنے سے مرجاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ "وہ چھُری کے زخم سے مرا" لیکن قدیم آدمی کچھ اور ہی کہتا۔ وہ کہتا کہ فلاں شخص اس لئے مرگیا کہ" جو چھُری اُسے بھونکی گئی تھی اُس پر جادو کیا ہوا تھا"

ویسے تو اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ نظر بد سے انسان بیمار پڑسکتا ہے، پیر یا سنیچر کے دِن کوئی کام نہ شروع کرنا چاہیئے اور اگر بلی راستہ کاٹ جائے تو یہ بدشگونی ہے۔

ہم ایسے لوگوں پر ہنستے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں تو ہم پرستی معاف نہیں کی جاتی لیکن ہمیں اپنے آباو اجداد سے یہ شکایت نہ ہونی چاہیئے کہ انہیں چڑیلوں، ڈائنوں اور روحوں پر اعتقاد تھا۔ وہ ایمانداری کے ساتھ کوشش کرتے تھے کہ ان کے اطراف میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کو سمجھیں اور سمجھا سکیں لیکن اُن میں علم کی اس قدر کمی تھی کہ صحیح وضاحت اور اسباب نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اب بھی ایسے قبائل موجود ہیں جہاں تہذیب اور تمدن ہنوز نہیں پہنچ سکا ہے اور وہ بھی اُسی طرح کے ہیں۔

ایک پادری، اُس کی بکری اور ملکہ وکٹوریہ کی تصویر کی سچی روداد

ایک مرتبہ ہوگنی کے ایک قبیلے کے لوگوں میں جس کا نام سوشموٹس تھا کوئی وبا پھوٹ پڑی۔ ایک کے بعد ایک کر کے لوگ مرنے لگے۔ ہر گھر سے گریہ و ماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پورے قبیلے میں ایک کھلبلی مچ گئی اور ڈر کے مارے لوگوں کا بُرا حال ہو گیا۔

آخر یہ ہیبت ناک مصیبت آئی کہاں سے ؟

اب لوگوں نے سوچنا شروع کیا اور سوچتے سوچتے یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ بیماری ٹھیک اُسی وقت شروع ہوئی تھی جب کہ کچھ سفید چمڑی والے لوگ آئے تھے یعنی ایک مشنری اور اُس کا خاندان! ٹھیک ہے وہ آئے کہ بیماری آئی!

بس اب یہ خیال ان کے دماغ میں جم گیا کہ یہی سبب تھا چنانچہ تمام باشندے برچھیاں اور لاٹھیاں لے لے کر اکٹھے ہوئے اور اُس مشنری کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر کر شور مچانے لگے "سفید لوگ مردہ باد۔ انہوں نے ہمارے اوپر جادو کر دیا۔ انہوں نے ہم پر بیماری پھونک دی"

پادری صاحب بیچارے کا چہرہ فق ہو گیا۔ بوکھلائے ہوئے دروازے پر آئے اور کہنے لگے "پیارے بھائیو اور بہنو ۔ ۔ ۔ " مگر توبہ کیجئے نقار خانے میں طوطی کی آواز بھلا کون سُنتا تھا۔ غریب نے اپنے جنم بھر میں ایسا وعظ نہیں کیا تھا جیسا وہ اس وقت فرما رہے تھے۔ انہوں نے اِن مقامی لوگوں کے سامنے جو تقریر کی وہ ان کے تمام وعظوں سے زیادہ مدلل تھی کیونکہ اور وعظوں کے موقعوں پر تو وہ لوگوں کی روحانی نجات کا سامان کیا کرتے تھے اور اس نازک موقع پر ان کی اپنی جان کا سوال آپڑا تھا

چیخیں کچھ کم ہوئیں مقامی لوگوں نے سُننا شروع کیا۔ پادری صاحب کو تھوڑا سا وقفہ تو ضرور مل گیا لیکن بہرحال معاملہ اب بھی نازک تھا۔ یکایک پادری صاحب کی خوش قسمتی سے ایک بکری باغ کی دیوار کے پاس آنکلی اور کھڑی ہو کر لگی اِس بھیڑ بھڑکے کو گھورنے۔ لوگوں نے بھی بکری کو غور سے دیکھا۔ خاموشی چھاگئی اور مقامی لوگوں کے دماغ پھر کام کرنے لگے۔ بکری بھی تو اُسی وقت آئی تھی جب یہ سفید لوگ اور یہ وبا آئی تھی! کیا عجب کہ یہ بکری ہی یہ وبالائی ہو؟ کسی نے پکارا "مارو اِس بکری کو۔ یہ اسی کا کام ہے" بیچاری بکری کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ درجنوں ہاتھوں نے باغ کی چوبی دیوار کو توڑ ڈالا مشنری چپ چاپ دیکھتا رہا اور اپنی بکری کو بچانے کے لئے سر کا تک نہیں۔ جب وہ لوگ اپنی برچھیوں سے اُس غریب جانور کا خاتمہ کر چکے تو عقلمندی کے نعرے لگاتے ہوئے یہ پوری بھیڑ کی بھیڑ واپس چلی گئی۔

چند دن گذر گئے لیکن مجرم بکری کو مناسب سزا مل جانے کے بعد بھی وبا کم نہ ہوئی تو ان لوگوں کو کوئی اور سبب معلوم کرنے کی فکر ہوئی انہیں یاد آیا کہ جس بکری کو انہوں نے مارا تھا اس کے علاوہ بھی اور دو بکریاں وہ پادری اپنے ساتھ لایا تھا چنانچہ سب نے پھر پادری کے گھر کو گھیرا اور مطالبہ کیا کہ وہ باقی دونوں دارھی دار بکر دل یا مجرموں کو بھی ان کے حوالے کر دے لیکن اب کی مرتبہ پادری نے فیصلہ کیا کہ وہ اُن کی بات نہ مانے گا اور مقابلہ کرے گا۔ بھلا آج یہ لوگ بکری مانگتے ہیں تو کل گائے کا مطالبہ کریں گے تو پھر آئندہ معلوم نہیں اور کس چیز کا مطالبہ کرنے لگیں لہٰذا اس نے بکریاں دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ قسم کھانے پہ تیار تھا کہ وہ غریب جانور بالکل معصوم اور بے گناہ تھے۔ اچھا تو پھر کون قصوروار تھا؟

پادری کے گھر کے چاروں طرف جو لوگ جمع تھے اُن میں سے چند نے ایک

کھڑکی میں سے دیکھا کہ کھانے کے کمرے کی دیوار پر ایک تصویر ٹنگی ہے یہ ایک عورت کی تصویر تھی جو شام کا بہت خوبصورت اور قیمتی لباس پہنے تھی۔ اس کے کندھے برہنہ تھے، سینے پر ستارے دمک رہے تھے اور سر پر ایک چھوٹا سا تاج رکھا ہوا تھا۔ یہ کوئن وکٹوریہ کی تصویر تھی جو اُس وقت انگلستان کی ملکہ تھی۔

اِس طرح کی تصویر، جس کی ہزاروں لاکھوں کاپیاں بنائی گئی تھیں، لندن کی ہر دکان اور طعام خانے میں لٹکی رہتی تھی لیکن یہاں، موٹسملوں کے ملک میں کسی ملکہ کی تصویر ایک عجوبۂ روزگار تھی۔ سب لوگ تصویر کو آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اب اُن کے دماغ میں یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ تصویر ہی اصل مجرم تھی! یہی تصویر تھی جس کی بدولت موٹھو مولٹس کے قبیلے کو یہ بدبختی کے دن دیکھنے پڑے۔

وہ پھر چیخنے چلانے لگے۔ اپنے نیزے گھماتے ہوئے وہ گھر کے اندر گھس گئے یہ تو ہمیں نہیں معلوم کہ آخر انجام کیا ہوا لیکن ممکن ہے کہ انگلستان کی ملکہ کی تصویر پانے کے بعد اُن لوگوں کو اطمینان ہوگیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے پھر کسی ایسی چیز پر اپنا غصہ اُتارا ہو جو انہوں نے کبھی دیکھی نہ ہو مثلاً پادری کی رات کو پہننے کی سلیپریں، یا کوئی چینی کی قہوہ کی کیتلی جس پہ گلابی رنگ کے گلاب بنے ہوں یا دیوار پر لگی ہوئی گھڑی جس کا گولہ نہایت نحوست کے ساتھ ہر وقت ہلتا رہتا تھا!

بہرحال تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس قصہ کو بیان کرنے سے ہمارا مطلب اور مقصد صرف یہ ہے کہ جو لوگ قدرت کے قوانین کو نہیں سمجھتے وہ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنے میں کیا کیا ٹٹول کرتے ہیں اور کیسی کیسی ٹکریں کھاتے ہیں۔ انسانوں کو تجربہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں تمام باتوں کا آپس میں ایک دوسرے سے تعلق ہے لیکن صحیح تعلق نہ جاننے کی وجہ سے وہ یہ ایمان لے

آتے ہیں کہ بعض چیزیں دوسری چیزوں پر طلسمی اور غیر قدرتی طاقت کی وجہ سے حاوی ہیں
فرانس کا ایک سائنس داں جس کا نام لیوی برول تھا اور جس نے افریقہ کی سیاحت
بھی کی تھی، لکھتا ہے "لوانگو میں سمندر کے کنارے رہنے والے لوگ جب کسی بادبانی کشتی
کے پھڑپھڑاتے ہوئے بادبان کو دیکھ لیتے تھے تو ان میں ہلچل مچ جایا کرتی تھی یا اگر کوئی ایسا
جہاز آجائے جس میں سے معمول سے زیادہ دھواں نکل رہا ہو تب بھی کھلبلی سی مچ جاتی
تھی یہی نہیں بلکہ اگر کہیں کوئی برساتی کوٹ، یا عجیب سی ٹوپی یا جھولنے والی کرسی
یا کوئی نیا اوزار دکھائی دے جاتا تو تمامی لوگوں کو بڑا شبہ پیدا ہو جاتا تھا مطلب یہ ہے
کہ کوئی نئی چیز خواہ کچھ بھی ہو ان لوگوں کی نظر میں جادو کا ذریعہ ہوتی تھی۔ اسی طرح
جادو سے بچنے کے لئے لوگوں کو تعویذ پہننے ہوتے تھے، مگرمچھ کے دانتوں کا بنا ہوا ہار،
یا ہاتھی کی دُم کے بالوں کا دست بند وغیرہ۔ یہ گویا تعویذ پہننے والے کو بلا سے محفوظ
رکھتے تھے۔

قدیم انسانوں کو بھی دنیا کا علم ان لوانگو کے وحشیوں سے کچھ زیادہ نہ تھا اور کھدائی
وغیرہ میں جو طلسمات، تعویذ اور جادو کی تصویریں غاروں کی گہرائیوں سے نکالی گئی ہیں
ان سے یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جادو اور ٹونے ٹوٹکے پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔

دُنیا کے متعلق ہمارے آباو اجداد کا کیا خیال تھا

اگر کوئی دُنیا کے قوانین سے واقف نہ ہو تو اُس کے لئے دُنیا میں زندگی بسر کرنا
مشکل ہو جاتا ہے اور وہ نامعلوم اور پوشیدہ طاقتوں کے ڈر کے مارے مجبور اور پریشان
ہو جاتے تو اس کے خیال کے مطابق ہر چیز کوئی طلسم ہو سکتی ہے ہر شخص جادوگر بن سکتا ہے ہر
پہ جنگل میں مرے ہوئے لوگوں کی روحیں بدلہ لینے کو بیقرار پھرتی ہوں، اور نہ معلوم کس وقت
زندوں کو دبوچ بیٹھیں۔ شکار میں مارا ہوا ہر جانور اپنی موت کا بدلہ لینے کو آدھمکے۔ اس

خطرہ سے بچنے کے لئے وہ لوگ دعائیں مانگتے، منتیں مانتے اور ہر وقت نیاز نذر دے دے کر ان روحوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ خوف اور ڈر ہمیشہ لاعلمی اور جہالت سے پیدا ہوتا ہے۔

اور چونکہ انسان کو علم حاصل نہیں تھا لہذا وہ دنیا کا حاکم اور مالک بن کر رہنے کے بجائے ایک ڈرا ہوا حقیر اور شکستہ حال غلام بنا ہوا تھا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ ابھی وہ وقت بھی نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو قدرت کا حاکم کہہ سکے۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقتور ہو چکا تھا کیونکہ اس نے سمجھ پر قابو پالیا تھا لیکن قدرت کی اور طاقتوں کے مقابلہ میں وہ ابھی ایک کمزور ہستی تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان طاقتوں کو کس طرح ڈھالے اگر شکار میں ایک مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی تو ہفتوں بھوکا مرنا پڑتا تھا۔ ایک برفانی طوفان آجاتا تھا تو اس کی شکارگاہیں برف کے نیچے دب کر رہ جاتی تھیں وہ کونسی چیز تھی جس نے انسان کو قدرت کے خلاف لڑنے اور رفتہ رفتہ قدم بقدم اس پر قابو اور فتح پانے کی طاقت عطا کی؟

انسان اکیلا نہ تھا۔ یہی حقیقت تھی جس نے اسے یہ طاقت اور اقتدار بخشا لوگ جتھے اور گروہ بنا بنا کر قدرت کی ان مخالف طاقتوں سے جد و جہد کرتے رہے۔ جتھے ہی بنا کر انہوں نے کام کرنا شروع کیا اور اسی طرح اکٹھا ہو کر سب نے علم اور تجربہ حاصل کیا۔

یہ سچ ہے کہ انہیں اس بات کا احساس نہ تھا یا اپنی طور پر ادا بھی ہو، لیکن انسانی سماج کی کوئی تشکیل ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ پھر بھی انہیں اپنے اتحاد اور یکجہتی کا خیال ضرور تھا اور کسی ایک جتھے کی صورت ایسی ہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا کنبہ یا بقول وال انسان ہو۔ ان کی اس یکجہتی کی بنیاد کیا تھی؟ برادری یا

کیونکہ وہ لوگ قبیلوں کی صورت میں رہتے تھے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ رہتے تھے اور اُن کے بچے پھر اپنی جگہ اپنے بہن بھائیوں، چچا پھوپھیوں خالاؤں ماموں کے ساتھ رہتے تھے اور ساتھ ہی ان کی دادیاں نانیاں بھی ہوتی تھیں۔

اور اس طرح قبیلوں کی نبیاد پڑی۔

قدیم زمانے کے شکاری، نسان کے لئے وہی قبیلہ پوری سوسائٹی تھی جو آباؤاجداد کے زمانے سے چلا آرہا تھا اور اس طرح یہ لوگ آپس میں اُن آباؤاجداد کی وجہ سے متحد تھے۔ ان کے آبا نے ان کو شکار کھیلنا اور اوزار بنانا سکھایا تھا' اُن کے آبا ہی نے ان کو رہنے گھر اور جلانے کے لئے آگ دی تھی۔

اس طرح کام کرنا، ور شکار کھیلنا گویا آبا کی مرضی پر چلنا اور ان کی روایات کو قائم رکھنا تھا اور ہر شخص جو آبا کے حکم پر چلتا تھا گویا بلاؤں اور خطرے سے محفوظ رہتا تھا اس طرح ان کے آبا مرنے کے بعد بھی اپنی نسلوں پر چھائے رہتے تھے وہ پوشیدہ طور پر ان کے شکار اور گھر یلو زندگی میں شریک رہتے تھے وہ ہر بات جانتے اور ہر حرکت دیکھتے تھے بُزدل کو سزا اور اچھوں کو جزا دیتے تھے۔

اس طرح قدیم انسان کے ذہن میں مشترک خاندے کے لئے مشترک کام مشترک آباؤاجداد کی خوشنودی اور فرمانبرداری بن گیا۔

اور کام کے متعلق بھی قدیم انسان کا وہ خیال نہ تھا جو ہمارا ہے۔ ہمارے خیال میں شکار کے ذریعہ شکاری کو بھینسے کا گوشت حاصل ہوتا ہے لیکن قدیم شکاری کا خیال تھا کہ بھینسا اُس کا پیٹ بھرتا ہے ہم جب گائے کی اجازت حاصل کئے بغیر اُس کا دودھ دوہ لیتے ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں کہ گائے ہمیں دودھ دیتی ہے تو یہ بھی اُسی زمانے کی ایک یادگار ہے۔ قدیم شکاری بھینسے یا مینڈھ یا ہرن کو اپنا مربی اور مہربان سمجھتا تھا اس کے خیال کے مطابق شکاری جانور کو نہیں مارتا تھا بلکہ جانور ازراہ

مہربانی شکاری کو اپنا گوشت اور اپنی کھال وغیرہ عطا کرتا تھا۔ انڈین لوگ ابھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جانور کی مرضی کے بغیر اُسے کوئی نہیں مار سکتا اگر کوئی بھینسا مار ڈالا جاتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو شکاری کے نذر کر دیا اور اپنی مرضی سے مار ڈالا جانا قبول کیا اور اس طرح بھینسا گویا سارے قبیلے کا مربی بن جاتا ہے۔

اس طرح قدیم لوگوں کے ذہن میں جنہیں ابھی تک اپنے اطراف کی دُنیا کا بہت مبہم سا اندازہ تھا، یہ دونوں خیالات ایکجا ہو جاتے تھے: ایک اُن کا سلف جو ان کا محافظ تھا اور ایک وہ بھینسا جو سارے قبیلے کی خوراک کا ذریعہ تھا اور چنانچہ وہ کہنے لگتے "ہم بھینسے کے بچے ہیں وہ ہمارا مائی باپ ہے" اور پھر سچے دل سے اس بات پر ایمان لے آتے تھے کہ ان کا سلف ضرور بھینسا ہی رہا ہوگا۔ جب کوئی قدیم مصوّر بھینسے کی تصویر کھینچ کر اس پر دو چار جھونپڑیاں بنا دیتا تھا تو اس کے یہ معنی ہوتے تھے کہ "یہ بھینسے کی اولاد کا کیمپ ہے"

کام کے سلسلہ میں بھی انسان اور جنگلی جانور کا ساتھ تھا اور چونکہ انسان سوائے پیدائشی رشتہ داری کے اور کسی رشتہ کا تصور نہیں کر سکتا تھا اس لئے جب کبھی وہ کسی جنگلی جانور کا شکار کرتا تھا تو اس سے معافی مانگتا تھا اور اُسے اپنا بڑا بھائی کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ جانور کی کھال اوڑھ لیتا تھا اور اس کے حرکات وسکنات کی نقل کرتا تھا۔

ہنوز انسان نے اپنے آپ کو "میں" کہنا نہیں سیکھا تھا وہ اپنے آپ کو پورے قبیلے کا ایک آلہ اور حصہ سمجھتا تھا اور ہر قبیلے کا نام کسی جانور پر ہوا کرتا تھا جو اس قبیلے کا مربی اور سلف سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً کسی قبیلے کا نام "بھینسے" پر ہے تو کسی کا "ریچھ" پر تو کسی کا "ہرن" پر وغیرہ۔ ان قبیلوں کے رسم ورواج وغیرہ بھی گویا ان جانوروں کے احکام تھے اور ان کا احکام ہی ان قبیلے والوں کے لئے قانون تھا۔

اپنے آباواجداد سے ملاقات

آئیے ہم قدیم انسان کے غار میں پھر چلیں اور آگ کے نزدیک اُس کے پاس بیٹھکر اُس سے اُس کے عقائد اور رواج کے متعلق ذرا بات چیت کریں اور اُس سے پوچھیں کہ ہم نے اُس کے رسم ورواج وغیرہ کے متعلق جو اندازہ لگایا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور اُس نے غاروں کی دیواروں پر جو تصویریں کھینچی تھیں، ہڈیاں اور سینگوں کے تعویذ اور ٹوٹکے وغیرہ جو گویا ہمارے لئے ہی چھوڑے تھے، ان کو ہم ٹھیک طور پر سمجھ بھی سکے؟

لیکن غار کے اِس مالک سے ہم یہ باتیں کرواتیں گے کس طرح؟

عرصہ گذر چکا ہے کہ ہوائیں اُس کے چولھے کی راکھ کو اُڑا کر بکھیر چکی ہیں اور اِس اُس کے پاس جو لوگ کام کرتے تھے، سینگ اور چقماق کے اوزار بناتے تھے، چمڑے کے لباس سیتے تھے اُن کی ہڈیاں بھی کب کی گل چکی ہیں۔ ہم بھی کبھی صرف ایک سوکھی ہوئی زرد کھوپڑی زمین کھود کر حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اب ہم کیا کریں کہ یہ کھوپڑی بولنے لگے؟

جب ہم غاروں میں سراغ لگا رہے تھے تو ہمیں اوزاروں کے کچھ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ملے تھے جن کو جوڑ جوڑ کر ہم نے اِن کو مکمل کر لیا تھا اور یہ سمجھ سکے تھے کہ انسان ان کو کیسے استعمال کرتا ہوگا۔

لیکن اُن کی اُس قدیم زبان کے بچے کھچے حصے اور ٹکڑے ہمیں کہاں ملیں گے؟

آج جو زبانیں بولی جاتی ہیں اُن ہی کے اندر ہمیں ان کی تلاش کرنی ہوگی۔

اِس کھدائی کے لئے ہمیں کدال وغیرہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمیں زمین نہیں بلکہ لغات کو کھودنا اور کریدنا ہوگا۔ ہر زبان کا ایک ایک مروجہ لفظ ماضی کی ایک قیمتی

یادگار ہے اس کے علاوہ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ زبان ہی کے ذریعہ سے یہ ہزاروں لاکھوں نسلوں سے گذر کر ہم تک پہنچا ہے۔ یوں تو کسی زبان کو پڑھنا اور اس میں تحقیقات کرنا ایک آسان سی بات معلوم ہوتی ہے: گویا آپ کو بس صرف یہی کرنا ہے کہ میز لگا کر بیٹھ گئے اور لگے ڈکشنری کو کھنگھولنے!

لیکن یہ کام اس طرح نہیں ہوتا۔

قدیم الفاظ کی تلاش میں محققوں کو ساری دُنیا کا سفر کرنا پڑتا ہے، پہاڑ چڑھنے پڑتے ہیں، سمندر پار کرنے پڑتے ہیں۔ بعض وقت کسی ایسی قوم کی زبان میں، جو چاروں طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی کسی وادی میں رہتی ہو، آپ کو ایسے الفاظ ملیں گے جو اور زبانوں سے معدوم ہو چکے ہوں۔ انسانیت کی اس طویل راہ پر ہر زبان بجائے خود ایک منزل ہے آسٹریلیا، افریقہ اور امریکہ کے شکاری قبیلوں کی زبانیں گویا ایسے کیمپ ہیں جن سے ہم عرصہ سے واقف ہیں۔ لہذا ابحاث کو دور پولینیشیا میں کہیں جا کر ان معنی اور الفاظ و محاورات کو تلاش کرنا ہوتا ہے جن کو ہم لوگ بھول چکے۔ الفاظ کی تلاش میں یہ سیاح اگر جنوب کے صحراؤں کو جاتے ہیں تو شمال کے ٹنڈرا میں بھی پہنچتے ہیں۔

دُور شمال کی طرف مختلف قوموں میں اب بھی ایسی زبانیں ہیں جن میں ہنوز اُس زمانے کے الفاظ موجود ہیں جب انسان کو اپنی ذات کا اور اپنی خودی کا احساس نہ تھا، جب لوگ اس قسم کی ترکیبوں، جیسے "میرا گھر" یا "میرا اوزار" سے واقف نہ تھے۔

اور یہی وہ زبانیں ہیں جنہیں ہمیں قدیم زبان کی یادگاریں اور باقیات ڈھونڈنے کے لئے اسی طرح کھودنا ہوگا جیسے ماہرین آثار قدیمہ پُرانی آبادیوں میں گھروں اور اوزاروں کا نشان پانے کے لئے کھودتے ہیں

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص ڈکشنری کو تحقیق کرنے اور کریدنے والا نہیں ہوسکتا۔

سائنس کی معلومات اور طویل اور کافی تیاری کے بغیر آپ کہیں نہ پہنچ سکیں گے کیونکہ کسی زبان میں قدیم لفظ اس طرح تو رکھے نہیں رہتے جیسے عجائب گھر میں چیزیں ہوتی ہیں وہ ایک زبان سے دوسری میں پہنچے ہیں اور ان کے نقب اور عقب بدل جاتے ہیں۔ بعض وقت کسی لفظ کا صرف مادہ رہ جاتا ہے جیسے کوئی درخت جل جائے اور صرف اُس کا کھنٹھ کھڑا رہ جائے اور اسی ٹھنٹھ کے ذریعہ ہمیں کسی نہ کسی طرح پتہ چلانا ہوگا کہ یہ لفظ آیا کہاں سے۔

ہزار ہا سال کے عرصہ میں الفاظ کی نہ صرف شکل بدل گئی ہے بلکہ اُن کے معنی بھی بدل گئے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی پرانے لفظ کے معنی بالکل نئے ہو گئے۔

آج بھی یہی حال ہے جب کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو ہم ہمیشہ اُس کا کوئی نیا ہی نام نہیں سوچتے بلکہ کوئی پرانا لفظ لیتے اور لیبل کی طرح اُسے اس نئی چیز پر چپکا دیتے ہیں۔

مثلاً ہم لوگ قلم کے لئے "کلک" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اب کلک کے لفظی معنی ہیں "پر" کیونکہ پرانے زمانے میں قلم کے لئے پر ہی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح مسودہ کے معنی ہیں ہاتھ سے لکھی ہوئی چیز حالانکہ موجودہ زمانے میں اکثر مسودے مشین یا ٹائپ رائٹر سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ٹائپ رائٹر جب ایجاد ہوا تو اس کو لکھنے کی مشین کہنے لگے حالانکہ وہ الفاظ کو لکھتی نہیں بلکہ چھاپتی تھی۔

اب ہم نے اس طرح کلک وغیرہ کے قسم سے اور بھی بہت سے پرانے الفاظ لے لئے اور ان کو نئی چیزوں پر جڑ دیا۔ یہ سب چونکہ ہمارے موجودہ زمانے میں ہوا ہے اور ہماری زبان کے سب سے اوپری پرت میں پایا جاتا ہے لہٰذا اس قسم کے الفاظ کے سابق معنی معلوم کرنا ہمارے لئے آسان ہے لیکن اگر آپ اور گہرے جائیں گے تو الفاظ مشکل تو ہوتے جائیں گے کسی لفظ کے معدوم معنی کو دریافت کرنے کے

لئے انسان کو زبانوں کا بہت بڑا ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔ ایسے ایک ماہر کا نام، مار تھا۔ قدیم اور جدید قوموں کی بہت سی زبانوں کی تحقیق کر کے اُس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے بہت سے الفاظ پہلے بالکل ہی مختلف معنی رکھتے تھے۔ اُس نے دریافت کیا ہے کہ بہت سی زبانوں میں لفظ "گھوڑے" کے معنی "بارہ سنگھا" اور "کتا" تھے کیونکہ گھوڑے کی سواری سیکھنے سے پہلے لوگ بارہ سنگھے اور کتے ہی کی سواری کیا کرتے تھے اسی طرح اس نے یہ معلوم کیا کہ کچھ زبانوں میں "گیہوں" کا لفظ شاہ بلوط کے پھلوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ جب لوگوں نے اناج بونا نہیں سیکھا تھا تو وہ شاہ بلوط کے پھل کھایا کرتے تھے۔ بہت سی ایسی زبانیں بھی ہیں جن میں شیر کے لئے "بڑا کتا" اور لومڑی کے لئے "چھوٹا کتا" استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ "کتا" لفظ "شیر" یا "لومڑی" سے پہلے موجود تھا۔

قدیم زبان کے ٹکڑے

زبان کے سیاحوں نے زبانوں میں تحقیق کر کے قدیم ترین زبانوں کے بچے کھچے ٹکڑے دریافت کئے ہیں۔ میچانینو نے اپنی ایک کتاب میں ان باقیات کے متعلق لکھا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے کہ یوکاگری زبان میں ایک لفظ ہے جس کا اگر ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی کچھ اس طرح کے ہوں گے "آدمی بارہ سنگھا مارا"۔ اب اتنے لمبے لفظ کا ادا کرنا ہی ایک مصیبت ہے اور پھر معنی سمجھنا تو اور بھی دشوار ہے۔ انسان کو پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ کس نے کس کو مارا: آدمی نے بارہ سنگھے کو، یا بارہ سنگھے نے آدمی کو، یا بارہ سنگھے اور آدمی نے مل کر کسی تیسرے شخص کو مارا، یا کسی تیسرے شخص نے آدمی اور بارہ سنگھے دونوں کو مارا؟

لیکن کوئی یوکاگر ہو گا تو فوراً اس لفظ کو سمجھ جائے گا کہ "آدمی نے بارہ سنگھے

کو مارا"

اچھا تو انہوں نے ایسا عجیب و غریب لفظ بھلا کیسے بنایا؟

یہ لفظ اُس وقت وجود میں آیا جب ابھی انسان اپنے آپ کو "میں" نہیں کہتا تھا جب اُسے شدت سے اِس بات کا احساس نہ تھا کہ یہ "میں" ہی تو تھا جس نے محنت کی، شکار کیا اور نیزہ چلا کر کے بارہ سنگھے کو ہلاک کیا۔

اُس کا خیال تھا کہ یہ وہ خود یا اس کا قبیلہ نہیں تھا جس نے بارہ سنگھے کو مارا بلکہ کسی طلسماتی پوشیدہ طاقت کی وجہ سے ایسا ہوا۔ انسان ابھی تک قدرت کے مقابلے میں بہت کمزور اور مجبور تھا۔ قدرت اس کی محکوم نہیں تھی اگر آج وہ کسی پوشیدہ طاقت کی مدد سے بارہ سنگھے کو بہت کامیابی کے ساتھ مار سکتا تھا تو کون جانے کل شکار ناکامیاب رہے اور خالی ہاتھ گھر واپس لوٹنا پڑے!

اِس جملے "آدمی۔ بارہ سنگھا، مارا" میں کہیں فاعل نظر نہیں آتا اور سچ تو یہ ہے قدیم انسان کو معلوم بھی کہاں تھا کہ فاعل کون ہے؟ وہ خود یا بارہ سنگھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اُس کا خیال یہ تھا کہ اُسے کسی پوشیدہ مربّی اور مددگار کے ذریعہ یہ بارہ سنگھا حاصل ہوا ہے۔ کوئی ایسا مددگار جو بارہ سنگھے کا اور اُس کا خود کا دونوں کا سلف ہے۔

جیسے ہم نے زمین کی کھدائی کی تھی، اُسی طرح ہم بولی اور زبان کی بھی نچلی پرتوں سے بڑھتے ہوئے اوپر کی پرتوں تک پہنچتے ہیں جو زمانۂ حال سے زیادہ قریب ہیں اور اس جگہ بھی اُس بولی کے نشانات ملتے ہیں جو اُس زمانے میں بولی جاتی تھی جب انسان اپنے آپ کو پوشیدہ طاقتوں کا آلۂ کار سمجھتا تھا۔

مثلاً چکوٹی کی زبان کا یہ جملہ دیکھیے۔

"انسان سے گوشت دیا گیا کتا" اب یہ جملہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ جملہ زبان

کی اُس پرت سے کھود کر نکالا گیا ہے جو بہت ہی پرانی ہے اور جب انسان ہم موجودہ لوگوں سے بالکل مختلف طریقے پر سوچتا تھا۔

یہ کہنے کی بجائے کہ "انسان کتے کو گوشت دیتا ہے" وہ لوگ کہتے تھے "انسان سے گوشت دیا گیا کتا"۔

تو پھر وہ کون تھا جو انسان سے کتے کو گوشت دلواتا تھا؟

وہ کوئی پر اسرار طاقت ہے جو انسان کو آلۂ کار بنا کر اس سے اپنا کام کرواتی ہے۔

ڈاکوٹا کے انڈین جو "میں وہ ہیں بنتا ہوں" کے بجائے کہتے ہیں "مجھ سے بنائی ہوتی ہے" گویا انسان سلائیوں سے کام کرنے والا نہیں بلکہ خود سلائی ہے!

یورپ کی زبانوں میں بھی قدیم بولی کے باقیات موجود ہیں۔ فرانسیسی لوگ "سردی ہے" کے لئے "اِل فیت فرد نید" بولتے ہیں لیکن اس جملے کے لغوی معنی ہیں "اُس نے سردی پیدا کی ہے" گویا پھر کسی ایسی "ہستی" کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کے تمام کاموں کی نگرانی کرتی ہے۔

اور وہ پر اسرار لفظ "اِٹ" جو انگریزی زبان میں موجود ہے اور جس سے اس قسم کی ترکیبیں بنتی ہیں اِٹ از رینِنگ (پانی برس رہا ہے کی جگہ "یہ" برس رہا ہے) اِٹ از فریزنگ (برف پڑ رہی ہے کی جگہ "یہ" برف جما رہا ہے) وغیرہ۔

بیشک اب ہم لوگ ان پر اسرار طاقتوں پر بھروسہ اور ایمان نہیں رکھتے (یا رکھتے ہیں؟) لیکن ہم نے اپنی زبان میں ان قدیم لوگوں کی بولی کے حصوں کو بھی تک قائم رکھا ہے جو ان طاقتوں پر ایمان رکھتے تھے۔

مثلاً ہم کہتے ہیں "گھڑی مل گئی" گویا گھڑی کو ہم نے نہیں ڈھونڈ نکالا بلکہ کسی پر اسرار طریقہ پر گھڑی ملی ہے۔

اس طرح بولیوں کو پرت در پرت کھولنے سے ہمیں نہ صرف الفاظ ہی ملتے

ہیں بلکہ قدیم زمانے کے لوگوں کے خیالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم انسان ایک عجیب پُراسرار دُنیا میں رہتا تھا جہاں گویا کام کرنے اور شکار کھیلنے والا وہ خود نہ تھا بلکہ اُس کے ذریعہ کوئی اور کام کرتا تھا، اس کے ذریعہ کوئی اور بارہ سنگھے کا شکار کرتا تھا۔ ایک ایسی دنیا جس میں سب کام کسی پُراسرار طاقت کے تحت ہوا کرتے تھے۔

لیکن وقت گذر گیا۔ انسان جیسے جیسے زیادہ طاقتور ہوتا گیا وہ دُنیا کو اور دُنیا میں اپنے مقام کو سمجھنے لگا۔ زبانوں میں لفظ "میں" داخل ہو گیا۔ یوں سمجھئے انسان داخل ہو گیا۔ انسان جو کام کرتا ہے، جد وجہد کرتا ہے اور اشیا اور قدرت کو اپنی مرضی کے مطابق جھکا لیتا ہے۔ اب ہم یہ نہیں کہتے کہ "اس نے بارہ سنگھے کو آدمی سے مروایا۔" اب ہم صاف صاف کہتے ہیں "آدمی نے بارہ سنگھے کو مارا"

پھر بھی ہماری زبان میں یہاں وہاں، کہیں کہیں ماضی کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ ہم اب تک کہتے ہیں "یہ منحوس بات ہے" یا "قسمت میں یوں ہی تھا" یا "ایسا ہو کر رہے گا"

قسمت کو کس نے بنایا ہے؟ "ایسا" کرنے پر کون قادر ہے؟ نحوست کیسی؟

قسمت! تقدیر! یہ قسمت اور تقدیر کچھ ایسی ہی چیزیں ہیں جیسے وہ پُراسرار ہستی تھی جس سے قدیم انسان ڈرا کرتا تھا۔ ابھی تک تو لفظ "قسمت" ہماری زبان میں موجود ہے لیکن وہ دن دُور نہیں جب یہ لفظ بھی معدوم ہو جائے گا۔

آج کسان جب اپنے کھیت بوتا ہے تو اُسے اپنے اوپر زیادہ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے فصل کا ہونا نہ ہونا خود اس کی ذات پر منحصر ہے۔ اس کے پاس ایسی مشینیں ہیں جو بنجر زمین کو زرخیز بنا سکتی ہیں اور پودے اُگانے کے لئے سائنس اس کی مددگار ہے۔ جب ملاح سمندر پر نکلتا تو وہ پہلے سے بہت زیادہ جرأت اور اعتماد کے ساتھ نکلتا ہے کیونکہ اُسے سمندر کی تہہ کی مٹی تک دکھائی دیتی

ہے اور اُسے پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ طوفان کب آئیگا۔

"قسمت ہی میں لکھا تھا" "پیدائشی ہی ایسا ہے" وغیرہ جملے اب کم سننے میں آتے ہیں۔ لاعلمی سے انسان کو خوف اور ڈر پیدا ہوتا ہے اور علم طاقت ہے۔

جب تک لوگ قوانین قدرت کو نہیں سمجھتے تھے اور اس کی طاقت کو اپنی خواہش کے مطابق نہیں ڈھال سکتے تھے اس وقت تک وہ اپنے آپ کو قدرت کا محکوم اور کسی پُراسرار پوشیدہ طاقت کا غلام سمجھتے تھے لیکن جب اُنہوں نے قدرت کے قوانین کو اور اپنی زندگی کے قواعد کو معلوم کرلیا تو پھر وہ اپنی قسمت کے آپ مالک اور رفتہ رفتہ آزاد تر ہوتے گئے۔

تیسرا باب

زبردست موسم بہار

برفانی میدان پھر واپس لوٹنے لگے

ہر سال جب برف گھلنے لگتی ہے تو ہمیں ہر جگہ، جنگلوں میں، میدانوں میں، گاؤں کی گلیوں میں، سڑکوں کی نالیوں میں، چھوٹے چھوٹے چشمے اور ننھے منے دریا اور آبشار سے گِر گِر کر بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ننھے منے شریر بچوں کی طرح جو برسات میں مارے باندھے بھی گھر میں نہیں بیٹھتے، یہ چشمے ٹوٹتی ہوئی برف کی تہوں کے نیچے سے نکل نکل کر بھاگتے ہیں۔ پتھروں پر سے اُچھلتے ہوئے، سڑکوں کے بیچوں بیچ سے گذرتے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں اور فضا اُن کی لطیف روانی کی

آواز سے گونجتی رہتی ہے۔

یہ برف، منور ڈھلوانوں اور کھلے میدانوں سے ہوتی ہوئی کھائیوں اور نالیوں اور باغ کی دیواروں کے سائے میں جا پہنچتی ہے جہاں کبھی کبھی تو یہ مئی کے اوائل تک چھپی بیٹھی رہتی ہے۔

جہاں جہاں نظر جاتی ہے تمام فطرت بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ چند ہی دنوں کے اندر دھوپ نے ننگے ننگے پہاڑوں کو گھاس کا سبز مخملی لباس پہنا دیا، خالی خالی ڈالیوں کو پتوں سے ڈھک دیا۔ ہر سال موسم بہار میں یہی ہوتا ہے جبکہ جاڑوں کی جمی ہوئی برف پگھلنے لگتی ہے۔

لیکن آپ کے خیال میں اس وقت کیا ہوا ہوگا جب برف کا وہ زبردست تودہ جو تمام کرۂ ارض کے سر پر ایک سفید تاج کی طرح رکھا ہوا تھا، پگھلنے لگا۔ ننھے ننھے چشموں اور پانی کی دھاروں کے بجائے بڑے بڑے وسیع اور عمیق دریا اس برفیلے تودے کے نیچے سے بہہ نکلے۔ ان میں سے بہت سے دریا اب بھی بہہ بہہ کر سمندر میں گرتے ہیں اور اپنے ساتھ ان تمام چھوٹے دریاؤں، چشموں اور پہاڑوں کی دراڑوں کا پانی لاتے ہیں، جو بہہ بہہ کر اُن میں گرتا رہتا ہے۔

یہ ایک زبردست موسم بہار تھا جیسے قدرت بہت شان کے ساتھ کسی لمبی نیند سے جاگ پڑی ہو جس نے شمال کی ننگی اور خالی وادیوں کو بڑے بڑے زبردست جنگلوں سے سجا دیا۔

لیکن موسم بہار بھی تو ایک دم سے نہیں آجایا کرتا۔ اپریل کے مہینے میں کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ دن بھر دھوپ اور گرمی رہنے کے بعد یکایک ٹھنڈی ہوائیں آنکلتی ہیں اور دوسرے دن صبح جب آپ سو کر اُٹھتے ہیں تو آپ کے چاروں طرف ہر چیز سفید سفید دکھائی دیتی ہے، چھتوں پر برف پڑی ہوئی ہوتی ہے جیسے

بہار تو کبھی آئی ہی نہ تھی!

اور اسی طرح وہ "بہارِ عظیم" بھی سردی پر ایک دم سے حاوی نہیں ہو گئی تھی۔ برفیلے میدان بڑے سست پن سے واپس لوٹ رہے تھے جیسے اُن کا بالکل دل نہ چاہ رہا ہو کہ جائیں اور اس طرح کھسکتے کھسکتے ان کو کئی سو سال لگے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ تھوڑا سا کھسکنے کے بعد یہ برفیلے میدان کسی جگہ رُک جاتے گویا پھر آگے بڑھنے کے لئے اپنی طاقت اکٹھا کر رہے ہیں اور پھر آگے بڑھنے لگتے۔ ان کے ساتھ ساتھ ٹنڈرا[۱] بھی چلا آرہا تھا اور وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے باوفا رفیق یعنی بارہ سنگھے کو بھی لا رہا تھا۔ وادیوں پر کائی تمام پھیل کر گھاس پر چھا چکی تھی۔ بھینسوں اور گھوڑوں کے گلے جو اِدھر اُدھر چرتے پھرتے تھے جنوب کی طرف چلے گئے تھے۔ سردی اور گرمی کی یہ لڑائی بہت عرصہ تک جاری رہی لیکن آخر کار گرمی کو فتح نصیب ہوئی۔ برفیلے میدانوں کے نیچے گرجتے ہوئے دریا بہہ نکلے۔ دُنیا کی برفیلی ٹوپی نرم پڑ کر سکڑنے لگی۔ برفانی میدانوں کا آخری حصہ شمال کی طرف کھسکا اور اس کے ساتھ ہی ٹنڈرا کی جنوبی حدیں بھی کھسکیں اور اُس مقام پر جہاں کائی ہی کائی تھی اور کہیں کہیں سبز سدا بہار جان چھپائے دبکے ہوئے تھے، اب مضبوط اور تناور دیودار کے گھنے جنگل نظر آنے لگے۔

گرمی دن بدن بڑھتی ہی گئی۔

شاہ بلوط کی سیاہ پھنگیوں کے بیچ بیچ میں سے سفیدے اور بید کے درخت زیادہ تعداد میں جھانکنے لگے اور پھر اُن کے بعد بڑے بڑے پتوں والے شاہ بلوط اور لیمو کے درخت ایک بڑی سی عظیم الشان فوج کی طرح شمال کی طرف بڑھنے لگے۔

"دیودار کا زمانہ" گذر کر "شاہ بلوط کا زمانہ" آیا اور ایک جنگل کے بعد دوسرے

---

[۱] سرد میدان جن میں تھوڑی برف جمی ہوتی ہے۔

جنگل آنے لگے اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے باسیوں کو بھی لانے لگے۔

ان پتے دار جنگلوں اور رسانپ کی جھڑیوں اور بیر کی جھاڑیوں کے ساتھ ان جنگلوں کے عزیز جانور بھی آئے۔ جنگلی سور، وحشی بیل اور چیتل آدھمکے اور شریف النفس ہرن بھی اپنے سینگ ہلاتا آپہنچا۔ بھورے بھورے بھالو جنگلی شہد کی تلاش میں پیڑوں کا عضو عضو توڑتے پھرنے لگے۔ جھڑی ہوئی پتیوں کے ڈھیروں پر سے بھیڑیے خرگوشوں کی بُو سونگھتے پھرتے تھے۔ چپٹی ناک اور چپٹے پنجوں والے اودبلاؤ جنگلی چشموں میں اپنی سرنگیں کھودتے پھرتے تھے۔ چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنے سریلے گانوں سے جنگل میں منگل کرتے رہتے تھے اور جنگل کی جھیلوں پر سے بطوں اور ہنس راجوں کی تائیں تائیں گونجتی رہتی تھی۔

برفیلے قید خانے میں

جب قدرت میں یہ تمام تبدیلیاں ہو رہی تھیں تو انسان ان کا خاموش تماشائی کیسے رہ سکتا تھا۔ اس کے چاروں طرف تمام چیزیں بدل رہی تھیں جیسے ناٹک میں اسٹیج کی سجاوٹ اور تیاری بدلتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ تھیٹر کے بالکل برخلاف، یہاں ایک ایک ایکٹ کئی کئی ہزار سال تک چلتا رہتا تھا اور اسٹیج لاکھوں میل لمبا چوڑا تھا۔ انسان اس ناٹک کا صرف تماشائی نہ تھا بلکہ اُس کا ایک ایکٹر بھی تھا۔ ہر سین بدلنے پر انسان کو اپنا سنگھار، اور اپنا میک اپ سر سے بدل ڈالنا پڑتا تھا اور زندہ رہنے کے لئے اپنی زندگی کے طریقوں کی بالکل کایا پلٹ دینی ہوتی تھی۔

جب ٹنڈرا جنوب کی طرف بڑھنے لگا تھا تو وہ اپنے قیدیوں، بارہ سنگھوں کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا، جیسے کہ یہ جانور اُس کے ساتھ پابہ زنجیر ہوں۔ زنجیر کے اس سرے پر بارہ سنگھا تھا تو دوسرے سرے پر کائی اور چھوٹی جڑیں وغیرہ تھیں۔

بارہ سنگھا اُن سرد، برفیلے جمے ہوئے میدانوں پر جہاں درخت معدوم تھے پھرتا پھرتا تھا اور انسان اُس کے پیچھے ہی لگا چلا آتا تھا۔ ایسے میدانوں میں جہاں برف نہیں جمی ہوتی تھی، انسان بھینسوں اور گھوڑوں کا شکار کرتا تھا۔ ٹنڈرا میں اُسے بارہ سنگھوں کا شکار کرنا پڑا کیونکہ ٹنڈرا میں شکار کرنے کے لئے اور رکھا بھی کیا تھا!

میمتھ ختم ہو چکے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان نے ہزاروں کی تعداد میں ان کو شکار کر کے ختم کر ڈالا تھا اور اپنے شکاری خیموں کے ارد گرد میمتھ کی ہڈیوں کے پہاڑ کے پہاڑ کھڑے کر دیئے تھے۔ گھوڑے بھی بہت حد تک ختم کئے جا چکے تھے اور جو باقی بچ رہے تھے وہ جنوب کی طرف چلے گئے تھے جہاں میدانوں میں کائی وغیرہ کی بجائے گھاس ملتی تھی۔

اب اس ٹنڈرا میں انسان کا ایک و تنہا مددگار اور مربی صرف بارہ سنگھا ہی رہ گیا تھا۔ انسان کی غذا اب بارہ سنگھا تھا۔ وہ اُسی کو کھاتا تھا، اُسی کی کھال سے کپڑے پہنتا تھا اور اسی کے سینگوں کے بھالے اور برچھیاں بناتا تھا۔ لہٰذا انسان کو اپنی زندگی بھی بارہ سنگھے کی زندگی کے مطابق بدلنی پڑی۔

جہاں جہاں بارہ سنگھا گیا وہاں انسان بھی گیا۔ عورتوں نے جلدی جلدی اپنے شکاری خیموں کا سامان چمڑوں میں باندھ لیا کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ اب کسی ایک جگہ مستقل قیام نہ ہو سکیگا۔ جب بارہ سنگھا اور اس کے پیچھے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے چوپائے، بھیڑ کی بھیڑ کسی اور چراگاہ کی تلاش میں نکل جاتے تو ان لوگوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنے کیمپ چھوڑ دیں اور ان کے پیچھے چلیں۔ عورتیں سامان کے ان گٹھروں کو اپنی پیٹھ پر لاد لیتیں اور تھکی سے چور چور ٹنڈرا میں لشتم پشتم چلتی چلی جایا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ مرد ہوتے مگر ... پر کوئی بوجھ

لڑانا ہوتا تھا۔ وہ صرف ہاتھوں میں اپنے نیزے اور برچھیاں لئے رہتے۔ گھرداری کے معاملات کی فکر کرنا مرد کی ذمہ داری نہ تھی!۔

لیکن ٹنڈرا مع اپنے بارہ سنگھوں کے پھر واپس اتر کی طرف لوٹنے لگا تھا اور دلدلی میدانوں کے بجائے شمال میں گھنے جنگل آرہے تھے۔ ایسے جنگل جن میں کوئی گھس ہی نہ سکے۔

تو پھر لوگوں کا کیا حشر ہوا؟

بعض شکاری قبیلے، بارہ سنگھوں کے گلوں کا پیچھا کرتے ہوئے، غیر شعوری طور پر قطب شمالی کی طرف بڑھتے گئے۔ ایسا کرنا بہت آسان تھا کیونکہ جیسا موسم شمال میں تھا اُس کا انسان عادی تھا۔ سردی کا زمانہ پینتیس ہزار سال تک رہ چکا تھا اور اس پینتیس ہزار سال میں انسان نے جنگلی جانوروں کے گرم سمور اور کھالیں کھینچ کر اپنے کو سردی سے محفوظ رکھنا سیکھ لیا تھا۔ جتنی ہی زیادہ سردی باہر پڑتی اتنی ہی زیادہ وہ اپنے زمین دوز، کھائی نما گھر میں، ٹھنڈی ہواؤں سے بالکل محفوظ آگ اور زیادہ جلاتا تھا۔

بے شک قطب شمالی چلا جانا جہاں وہ تھے وہاں ٹھہرنے سے زیادہ آسان تھا۔

مگر یہ کوئی کلیہ نہیں کہ آسان ترین طریقہ ہمیشہ بہترین بھی ہو۔ انسانوں کے اُس حصہ نے جو بارہ سنگھے کے پیچھے پیچھے شمال کی طرف چلا گیا۔ اپنا کافی نقصان کیا۔ ایک تو یہی کہ برفانی دور اُن کے واسطے گویا اور طویل ہوگیا۔ گرین لینڈ کے اسکیمو اب بھی برفیلے میدانوں میں رہتے ہیں اور بے رحم، غیر فیاض قدرت سے اُن کی ایک لامتناہی جنگ جاری رہتی ہے۔

لیکن جو قبیلے رہ گئے اُن پر کچھ اور ہی بیتی۔ شروع شروع میں تو اُن کے لئے یہ بڑی مصیبت تھی کہ جو گھنے جنگل ان کے چاروں طرف اُٹھ کھڑے ہو رہے تھے، ان میں رہ کر زندگی بسر کریں، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ضرور تھا کہ وہ اُس برفیلے قید خانے سے نجات پا گئے تھے جس میں ان کے آباد اجداد ہزارہا سال تک محبوس رہے تھے۔

انسان نے جنگلوں سے جنگ شروع کر دی

جہاں پہلے میدان تھے وہاں اب جنگل اُگ آئے تھے لیکن یہ جنگل ہمارے موجودہ جنگلوں سے بہت زیادہ مختلف تھے۔ وہ تو بیاد شوار گزار جھنڈ تھے جو ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے اور دریاؤں اور جھیلوں کے کناروں تک پہنچے ہوئے تھے بعض مقام پر تو سمندر کے کناروں تک بھی تھے۔

انسان کے لئے اِس اجنبی دنیا میں جس سے وہ بالکل غیر مانوس تھا مرنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔ جنگل اُس کا گلا گھونٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اپنے پنجے دار پنجوں سے اُس کا ٹینٹوا اب دبا یا اور نہ ہی اس گھنے ہمسائے میں انسان کے لئے رہنے کو جگہ تھی۔ اب اُسے ہر وقت جنگلوں سے زور آزمائی کرنی پڑتی۔ سارا وقت اُن کو کاٹنے اور صاف کرنے میں لگنے لگا۔

ٹنڈرا میں یا کھلے میدانوں میں انسان کو اپنے کیمپ کے لئے آسانی سے جگہ مل جاتی تھی کیونکہ جگہ بہت وافر اور کافی ہوا کرتی تھی لیکن جنگلوں میں تو اُسے اپنے لئے خود جگہ نکالنی تھی کیونکہ زمین کے ایک ایک انچ پر درختوں اور جھاڑیوں کا قبضہ جما ہوا تھا۔ لہٰذا اُسے جنگل سے جنگ کرنی پڑی اور اُس پر باقاعدہ حملہ کرنا پڑا جیسے وہ کسی دشمن کا قلعہ ہو یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جنگ بھلا اسلحوں کے بغیر کیسے لڑی جا سکتی ہے؟ درختوں کو گرانے کے لئے انسان کو ایک نئے اوزار کی ضرورت تھی چنانچہ اُس نے اپنا بھاری پتھر کا ٹکونا اوزار ایک بڑے سے دستے میں باندھا۔

اور گھنے جنگلوں میں، جہاں اب تک صرف کٹھ پھوڑے کی کھٹ کھٹ سُنائی دیتی تھی، وہاں کلہاڑی کی پہلی صدا گونجنے لگی۔ چڑیاں اور وحشی جانور چونکے ہو کر گھبرا اُٹھے۔ پتھر کے تیز اوزار نے درختوں کی لکڑی کو گہری چوٹ پہنچائی زخموں

سے گاڑھا گاڑھا رس ٹپکنے لگا، بڑے بڑے درخت آہیں بھرتے، اڑا اڑا دھوں کر کر کے زمین پر گر پڑے اور لکڑ ہارے کے قدم چومنے لگے۔

دن بدن، استقلال اور صبر کے ساتھ، لوگ درخت کاٹ کاٹ کر جنگل میں اپنے رہنے کے لئے جگہ نکالنے لگے۔ جب درخت کاٹے جا چکے تو ٹھنٹھوں اور جھاڑیوں وغیرہ میں آگ لگا کر ان کو بھی صاف کر دیا گیا۔

تو اس طرح انسان نے جنگل سے جنگ کی اور اس پر فتح حاصل کی لیکن فتح کے باوجود بھی اس نے ہارے ہوئے دشمن کو دم نہ لینے دیا۔ اس نے درختوں کی ڈالیاں کاٹیں اور ان کے ایک سرے کو چھیل کر نوکدار کیا اور اسے نوک کے بل، ایک لکڑی کے موٹے موٹھے سے ٹھونک ٹھونک کر زمین میں گاڑ دیا اس کے پاس ہی اس نے ایک اور بلی گاڑی پھر ایک تیسری، پھر چوتھی۔ اب گویا انہوں نے ایک جنگلہ بنا لیا اور اس میں بہت سی آڑی لکڑیاں بھی پرو دیں اور اس طرح، درختوں کے درمیان، لکڑی اور پھوس کا پہلا جھونپڑا نمودار ہوا۔ یہ جھونپڑا دیکھنے میں جنگل ہی سا لگتا تھا، کیونکہ اس میں ہر طرف ڈالیاں ہی ڈالیاں تھیں۔ البتہ یہ ڈالیاں اینڈی بینڈی نہیں لگی تھیں بلکہ ایک خاص نظم اور ترتیب کے ساتھ لگائی گئی تھیں اور یہ ترتیب انسان کے ہاتھوں کی کاریگری تھی۔ انسان ہی نے انہیں ترتیب دیا تھا۔

اگر انسان کے لئے جنگل میں رہنے کی جگہ ڈھونڈنا دشوار تھا تو غذا ڈھونڈنا اس سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ میدانوں اور گیاہستانوں میں تو گلے کے گلے جانور جمع ہو کر پھرا کرتے تھے اور وہ ان کا شکار کر لیا کرتا تھا۔ ان گلوں کو دور سے دیکھ لینا بھی آسان تھا اور پھر اگر کسی ٹیلے وغیرہ پر کھڑے ہو گئے تو گویا سارا میدان سامنے کھلا نظر آتا تھا۔

لیکن جنگل میں صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ سوچیے تو جنگل کا یہ مکان رہنے

والوں سے بھرا پڑا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ دکھائی کب دیتے تھے۔ جنگل کی ایک ایک منزل اُن کی آواز سے، سرسراہٹ سے، چیخ و پکار اور شور و غل سے گونجتی رہتی تھی لیکن ان کا سراغ لگا کر ان تک پہنچنا "لانا تھا جوئے شیر کا"۔ آپ کے پاؤں کے پاس کوئی سرسراہٹ ہوئی، سر پر سے کوئی چیز اُڑی، اور درختوں کی پتیوں اور ٹہنیوں سے ٹکراتی غائب! اب شکاریوں کے لئے یہ بڑی مشکل درپیش تھی کہ ان طرح طرح کی سرسراہٹوں اور قسم قسم کی بوؤں کے درمیان اپنے شکار کی بُو کیسے سونگھیں اور ان مختلف رنگوں کے درختوں کے تنوں میں اپنا خاص نشانہ کدھر لگائیں۔ جنگل کے ہر جانور اور پرندے کا رنگ بجائے خود اس کے لئے محافظ کا کام کرتا تھا۔ بہت سی چڑیوں کے پَر دل کے رنگ درختوں کے تنوں کے رنگوں سے ملتے جُلتے تھے۔ جنگل کی نیم تاریکی میں، جانوروں کے بھورے سمور اور کھالیں جھڑے ہوئے پتوں کے بھورے پن میں مل کر ایسے ایک ہو جاتے تھے کہ تفریق کرنا مشکل تھا۔ ایسی صورت میں اول تو کسی جانور کا ملنا ہی مشکل تھا اور مل بھی گیا تو اگر پہلے ہی وار میں اُسے مار گرایا تو خیر ورنہ چشم زدن میں وہ کسی جھاڑ جھنکار میں غائب! اس طرح شکاری کو اب اپنی برچھی کی جگہ ہمیشہ تیر استعمال کرنا ہوتا تھا اور وہ بھی تیر بہدف!

اب یہ شکاری، ہاتھ میں کمان لئے، کاندھے پر تیروں بھرا ترکش رکھے، گھنے جنگلوں میں گھس گھس کر جنگلی سوروں کا پیچھا کرتا پھرتا اور شور و غل مچاتی ہوئی جنگلی بطخوں اور ہنس راجوں کو مارا کرتا تھا۔

چار پاؤں والا دوست

ہر شکاری کا ایک بہت رفیق دوست ہوتا ہے۔ اِس دوست کے چار پنجے ہوتے ہیں، بڑے بڑے نرم نرم کان ہوتے ہیں اور ایک سیاہ، عجیب سی

ناک ہوتی ہے۔ اِس چار پاؤں والے دوست کا کام یہ ہے کہ شکار کے وقت، اپنے مالک کو شکار کا سراغ لگانے میں مدد دے۔ پھر کھانے کے وقت وہ اُس کے پاس آبیٹھتا ہے اور اپنی آنکھیں اٹھا کے اپنے مالک کی آنکھوں کی طرف تکتا ہے جیسے پوچھ رہا ہو "میرا حصہ کہاں ہے۔ لائیے" یہ چار پاؤں والا وفادار دوست، کچھ دو چار سال سے نہیں، بلکہ ہزاروں برس سے شکاریوں کی خدمت کر رہا ہے۔

کیونکہ انسان نے کتے کو اس وقت پر چایا تھا جب وہ بارود کی بندوق کی گولی کی جگہ بھکے پھکے تیروں سے اپنا شکار مارا کرتا تھا۔

پُرانے جنگلوں میں جہاں اِنسانوں کے شکاری ڈیروں کے نشانات ملتے ہیں وہاں کتوں کے رہنے کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اِن کے علاوہ ان ڈیروں کے باور چیخانوں کا جو کوڑا کرکٹ ملا ہے اُن میں جنگلی جانوروں کی ایسی ہڈیاں بھی ملی ہیں جن پر کتے کے دانتوں کے نشانات ابھی تک محفوظ ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی کھانے کے وقت کتے شکاری کے پاس بیٹھکر اس سے ہڈیاں طلب کیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر کتا انسان کے لئے مفید اور مددگار نہ ہوتا تو انسان اُسے یقیناً کبھی نہ رکھتا نہ کھلاتا پلاتا۔ جب اِنسان نے کتے کو پالا تھا تو گویا اپنے لئے ایک مددگار حاصل کیا تھا اور اُس نے اُسے جنگلی جانوروں کا پیچھا کرنا اور اس کی بُو سونگھ کر سُراغ لگانا بھی سکھایا تھا۔

اور اِنسان نے بہت صحیح انتخاب کیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ خود کسی جنگلی سؤر کے پاؤں کے نشان معلوم کرے یا ہرن کے پاؤں کی چاپ سُنے، اُس کا دوست کتا چوکنا ہو جاتا تھا اور زمین کو سونگھ سونگھ کر شکار کی بُو پہچان لیا کرتا تھا۔

نتھنوں کے درمیان یہ کیسی بُو ہے؟ اِدھر سے یہ کیا چیز بھاگی؟ ہوا میں، دو چار

دفعہ سونگھ سونگھ کی اور سراغ مل گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر آس پاس کچھ دیکھا نہیں ہے لیکن قوتِ شامہ جو حواسوں میں سب سے زیادہ اہم ہے، کتّے کو جنگل میں ایک خاص راستے پر لئے جا رہی ہے ــــ اور انسان ــــ اُس کا تو بس اب صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔

جب انسان نے کتّے کو پالا تو اُس نے اپنی طاقت پہلے سے بھی زیادہ بڑھا لی کیونکہ اب وہ کتّے کی قوتِ شامہ کو اپنے استعمال میں لا سکتا تھا جو اس کی اپنی قوتِ شامہ سے بہتر تھی۔ اُس نے صرف کتّے کی ناک ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اس کی ٹانگوں سے بھی لیا۔ گھوڑے کو ساز لگنے سے بہت پہلے سے کتّے انسان کو سلیج[1] میں کھینچا کرتے تھے۔

سائبیریا کے کچھ علاقوں میں قدیم زمانے کے کیمپوں اور ڈیروں میں کتّوں کی ہڈیوں کے پاس ان کے ساز کے ٹکڑے بھی پائے گئے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کتّا نہ صرف شکاری کو شکار ڈھونڈنے میں مدد دیتا تھا بلکہ شکاری کو اٹھائے اٹھائے بھی پھرتا تھا۔ اس طرح انسان کی سوانح حیات میں ہم اس کے دوست کتّے سے پہلی مرتبہ متعارف ہوتے ہیں۔

کتّوں کے متعلق کتنی ہی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ ایسے کتّوں کے متعلق جنہوں نے پہاڑوں میں مسافروں کی جانیں بچائیں، اور جو اپنے زخمی مالکوں کو میدانِ جنگ سے نکال لے گئے، جو نہ صرف گھر کی ڈیوڑھی کا پہرہ دیتے ہیں بلکہ ملکوں کی حدود تک کی حفاظت کرتے ہیں کتّا انسان کی ہر جگہ خدمت کرتا ہے، ہر موقعہ پر اس کے کام آتا ہے۔ چاہے وہ شکار میں ہو یا جنگ میں، گھر پر ہو یا سائنس کی لیبوریٹری میں!

---

[1] سلیج، برف پر چلنے والی بغیر پہیوں کی ایک خاص قسم کی گاڑی ہے جسے کتّے کھینچتے ہیں

انسان اور دریا کی جنگ

جیسا ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، انسانوں میں سے سب جنگلوں کو نہیں گئے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو گھنے جنگلوں کو چھوڑ کر دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے جا کر بس گئے۔ دریاؤں اور جنگلوں کے درمیان جو زمین کی ایک پتلی سی پٹی تھی وہاں لوگوں نے اپنے ٹہنیوں اور ڈالیوں کے جھونپڑے بنا لیے اور رہنے لگے۔

یہ بات تو ضرور تھی کہ جنگلوں کے مقابلہ میں دریا کے کنارے رہنے کے لیے جگہ زیادہ تھی لیکن وہاں رہنا کچھ آسان نہ تھا۔ دریا ایک ایسے پڑوسی کے مانند تھا جو ہر وقت مچلتا رہتا ہو۔ برسات کے موسم میں دریا میں باڑھ آتی تھی اور وہ بڑھ کر کنارے سے بھی آگے نکل جایا کرتا تھا۔ واپس جاتے وقت وہ برف کی بہتی ہوتی چادروں اور پانی سے گرے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں اور گدھوں کے ساتھ ساتھ کنارے کے رہنے والوں کے جھونپڑے بھی لیجایا کرتا تھا۔ بچارے باشندے سیلاب سے بچنے کے لئے درختوں پر چڑھ جایا کرتے اور وہاں سے بیٹھے بیٹھے مڑ مڑ کر تکا کرتے کہ کب دریا کا چڑھا ہوا غصہ اترے، اُس کا مزاج نرم پڑے تو ہم نیچے اُتریں! اور جب دریا واپس جا کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا تو وہ لوگ پھر کناروں پر نئے اجڑے ہوئے گھروندے بنانے میں لگ جاتے۔

شروع شروع میں تو ہر سیلاب اُن کو اچانک آ لیتا تھا لیکن جیسے جیسے انہوں نے دریا پر نگاہ رکھی اور اس کے اُتار چڑھاؤ پر غور کیا تو آخر کار وہ اُس سے بازی لے گئے۔ انہوں نے بہت سے درخت کاٹے اور ان کو آپس میں باندھ کر دریا کے کنارے جما دیا۔ گدھوں کی پہلی قطار کے اوپر انہوں نے دوسری قطار جمالی۔ اس طرح تھوڑا تھوڑا کر کے ایک اونچا چبوترہ سا بن گیا اور اس چبوترے پر انہوں نے اپنے جھونپڑے

بنائے رکھ سیلاب انہیں ڈرا نہیں سکتا تھا اگر پانی موجیں مارتا ہوا کنارے کے اوپر بھی آجاتا تھا تب بھی وہ اُن کے گھروں کے پیندے تک نہ چھو سکتا تھا۔

انسان کے لئے یہ بڑی زبردست فتح تھی۔ نیچے کنارے کو اونچا کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔ لکڑیوں کے بنے ہوئے اسی چبوترے سے وہ تمام بند اور پشتے پیدا ہوئے جن سے آج ہم بڑے بڑے دریاؤں کی روک کرتے ہیں۔

دریا کے ساتھ یہ لڑائی لڑنے میں انسان کو بہت طویل اور سخت محنت کرنی پڑی لیکن وہ ٹھیک دریا ہی کے کنارے کیوں رہنا چاہتا تھا؟ وہ کونسی کشش تھی جس نے اُسے پانی کی طرف کھینچا؟ یہ سوال تو کسی مچھیرے سے پوچھئے جو سارے سارے دن کس صبر کے ساتھ پانی میں اپنا کانٹا ڈالے بیٹھا رہتا ہے انسان کے لئے پانی میں یہ کشش تھی کہ اس کے اندر مچھلیاں تھیں! اچھا تو پھر یہ کیسے ہوا کہ شکاری انسان مچھیرا بھی بن گیا؟ مچھلی پکڑنے کے لئے تو بالکل اور ہی قسم کا سامان درکار تھا، بالکل اور ہی قسم کے طریقوں اور ترکیبوں کی ضرورت تھی

جہاں کہیں واقعات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے وہاں ہمیں درمیانی کڑی کی تلاش کرنی ہوتی ہے۔

شکاری لوگ کچھ ایک رات میں مچھیرے نہیں بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ مچھلی کا شکار کرنے سے پہلے انسان کو اُس کی تلاش کرنی پڑی تھی اور انسان نے یہی کیا بھی۔ مچھلی پکڑنے کا پہلا اوزار بھی بہت کچھ برچھی سے ملتا جلتا تھا۔ مچھیرا کمر تک پانی میں چلتا رہتا تھا اور جہاں کہیں اُسے چٹانوں وغیرہ کے درمیان کوئی مچھلی اٹکی ہوئی نظر آتی اُسے اپنی برچھی سے مار ڈالتا۔ پھر اُس نے انہیں دوسری ترکیبوں سے بھی پکڑنا شروع کر دیا جال سے چڑیاں پکڑنا تو وہ سیکھ ہی چکا تھا چنانچہ اس نے پانی میں بھی اس جال کی آزمائش کی۔

اس طرح رفتہ رفتہ انسان نے اپنے آپ کو مچھلی پکڑنے کے اسلحات سے مسلح کرلیا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو جہاں برچھیاں اور بھالے وغیرہ ملے ہیں، وہاں جال دبانے کے پتھر اور ہڈیوں کے بنے ہوئے مچھلی کے کانٹے بھی زمین میں دفن ملے ہیں

ہمارے جہازوں کے جدِ امجد

اب سے ساٹھ سال پیشتر افریقہ میں لڈوگا جھیل کے پاس ہی کچھ مزدور ایک نہر کھود رہے تھے۔ دلدلی کوئلہ اور مٹی کھودتے کھودتے انہیں ایک انسانی کھوپڑی اور کچھ پتھر کے اوزار ملے ساب کیا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ ٹوٹ پڑے اور اس مقام سے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ دلدلی کوئلے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، ان کو طرح طرح کی چیزیں دستیاب ہوئیں جیسے کسی عجائب خانہ سے رکھی رکھائی مل گئی ہوں:۔ ایک پتھر کی کلہاڑی، ایک پتھر کی چھری، ایک مچھلی پکڑنے کا کانٹا، ایک تیر کا سوفار، ایک دندانے دار اوزار، اور ایک چھوٹی سی ہڈی کی وھیل مچھلی جو کسی ثابت ہڈی میں سے تراشی گئی تھی اور طلسماتی حیثیت رکھتی تھی۔ پتھر اور ہڈی کے یہ اوزار نکالنے کے بعد اب جو کھینچتے ہیں تو جناب ایک پوری کی پوری کشتی نکلتی چلی آرہی ہے اور یہ ڈونگی ایسی اچھی حالت میں تھی کہ آپ کا جی چاہتا تو اسی وقت اس میں سوار ہو کر پانی میں چھپا چھپ شروع کر دیتے۔

لیکن یہ ہماری کشتی سے بالکل نہیں ملتی کیونکہ یہ کشتی یا ڈونگی جو ہماری کشتیوں، اسٹیمروں اور تیل کے چلنے والے جہازوں کی جدامجد ہے ایک بڑے سے شاہ بلوط کے گدھے میں سے تراش کر نکالی گئی ہے اگر آپ اس کے اندر جھانکیں تو بچشم خود دیکھ لیں گے کہ پتھر کی کلہاڑی نے کس طرح شاہ بلوط کے کلیجے کو کھایا ہے۔ جہاں کہیں سے کلہاڑی درخت کی رگوں کے ساتھ چلی ہے

وہاں تو حالت اتنی بُری نہیں لیکن جہاں کام رگوں کے خلاف ہوا ہے وہ تو کام کیلئے اچھی خاصی سزا ہے! چاروں طرف سے لکڑی کو اس قدر اور اس طرح کاٹا اور پیٹا گیا گویا ان پتھریلے دانتوں نے جگہ جگہ جھٹکے بھرے ہیں اور بھنبھوڑ بھنبھوڑ ڈالا ہے جہاں جہاں ڈالیاں اور گرہیں ہیں وہاں تو کلہاڑی قطعاً چل ہی نہیں سکی اور انسان کو مجبوراً درخت سے لڑنے کے لئے آگ کو طلب کرنا پڑا۔ تمام کشتی جگہ جگہ سے جھلسی ہوئی ہے اور اس پر کوئلے کی کالی تہہ جمی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں ایسی کشتی کا بنانا بھی آجکل کے ایک پورے جہاز بنانے سے کچھ کم مشکل نہ رہا ہوگا۔

دلدلی کوئلے میں کشتی کے قریب ہی اُن لوگوں کو وہ کلہاڑی بھی ملی جس سے یہ کشتی بنائی گئی تھی۔ کلہاڑی کا سرا تیز اور چمکدار تھا اور کچھ دور ہی پر ایک رندے کا پتھر بھی پڑا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت تک اُن لوگوں کو نہ صرف پتھر کو چھیلنا آگیا تھا بلکہ پالش اور چمک پیدا کرنا بھی سیکھ چکے تھے۔ ہمارے لئے تو یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ ایسی گوٹھل اور کند کلہاڑی سے ایسے مضبوط شاہ بلوط کے سخت درخت کو بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ شاہ بلوط کے کسی مضبوط گدّے کو کشتی کی صورت دینا بھی ایک طویل اور کٹھن کام تھا۔

آخر کار جب یہ کام ختم ہو گیا اور کشتی دریا میں اتار دی گئی تو لوگ اپنی اپنی برچھیاں کلنٹے اور جال وغیرہ لے کر مچھلی کے شکار کو روانہ ہوئے۔ جھیل بڑی تھی مچھلیاں کافی تھیں لیکن پھر بھی وہ کنارے سے زیادہ دور نہ گئے۔ کیونکہ پانی اُن کے لئے ایک اجنبی، ایک غیر مانوس عنصر تھا۔ بھلا وہ اس کی چالیں بدلنا اور اس کے طور طریقے کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ پانی ابھی چُپ چاپ ہے نرم ہے تو ابھی غصہ میں بھر گیا اور لگا چیخنے چلانے اور اونچی اونچی لہریں اچھالنے!

اور شاہ بلوط کا وہ بڑا سا گدّھا جسے زبردست طوفان بھی نہیں ڈبو سکتا کاگ

کی طرح اِدھر اُدھر لہروں پر اُچھلتا، چکر کھانے لگا خوف کے مارے بوکھلا کر انہوں نے کنارے کا رُخ کرکے کھینا شروع کیا۔ آخرکار وہ کنارے پر پہنچ ہی گئے، زمین پر قدم رکھ ہی دیا۔ زمین جو ہلتی ڈولتی نہیں تھی اور نہ ہی بڑی بڑی لہروں کی طرح کروٹ لیتی اور کوبڑ نکالتی تھی، جیسے بچہ اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے اسی طرح انسان اس ماں سے لپٹ گیا جس نے اسے جنم دیا تھا۔ اپنی دھرتی ماتا سے

اب اس دھوکہ باز پانی کی چادر پر جو دور افق تک پھیلی ہوئی تھی، اور آگے جانے کے بجائے، انسان وہیں کنارے پر رہا اور منتظر رہا کہ مچھلیاں کنارے پر آجائیں

آخرکار آہستہ آہستہ ایک ایک قدم کرکے انسان نے پانی کے زبردست پھیلاؤ پر فتح حاصل کرنی شروع کی۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ زمین پر بھی انسان کے لئے حدود قائم تھے اور وہ ان کے اندر قید تھا۔ ہر دیوار اور ہر حد پر لکھا تھا "اندر آنے کی ممانعت ہے" لیکن انسان نے ان غیر مرئی حدود پر فتح حاصل کر ہی لی۔ لیکن ابھی وہ پانی کی دنیا کے کنارے ہی پر کھڑا تھا۔ بہرحال سخت ترین معرکہ سر ہو چکا تھا شروعات ہو گئی تھی۔ وہ وقت قریب آرہا تھا کہ انسان ساحلِ آب سے اپنا دامن چھڑائے گا اور کسی ہلکی پھلکی کشتی میں نہیں بلکہ جہاز میں بیٹھ کر۔ بادبان کھولے، نئے ملکوں کے حدود دریافت کرنے نکلے گا جو کہ اپنے حدود سے بہت دور تھے، اور جہاں اس جیسے ہی انسان آباد تھے۔

پہلے فنکار

اے نوخیز فنکارو۔ تم جنہوں نے ابھی ہاتھوں میں یہ کلہاڑی، چھینی، ہتھوڑا اور پیچ کش پہلی مرتبہ اُٹھایا ہے، تم مستقبل کے کیمیا گر ہو، آہن ساز ہو، معمار اور انجینیر ہو۔ تم مشینیں ڈھالو گے، ہوائی جہاز بناؤ گے، عمارتیں کھڑی کرو گے۔ یہ کتاب تمہارے لئے لکھی گئی ہے کیونکہ تمہیں اپنے اوزاروں اور اپنے فن

سے نسبت ہے۔ تم اُن تمام مشکلات سے واقف ہو جو تمہارے اوزاروں کو ان کچے سامانوں کے ڈھالنے میں پیش آئیں گی لیکن تم اس خوشی کو بھی جانتے ہو جو ان مشکلات کو فتح کر کے تمہیں حاصل ہو گی۔

جب تم اپنے ہاتھ میں لکڑی کا کوئی ٹکڑا اُٹھاتے ہو تو پہلے ہی سے تمہارے ذہن میں اُس چیز کی شکل پھر جاتی ہے جو تم بنانے والے ہو۔ یہ کیسی معمولی اور آسان سی بات معلوم ہوتی ہے۔ تم کو بس صرف یہی کرنا ہے کہ آری سے یہاں کاٹ دو، برمے سے وہاں سوراخ کر دو اور بس کاٹ کر نکال لو لیکن پھر بھی کچا سامان ایسا نرم طبیعت نہیں ہوتا۔ جب چھری کی دھار اس میں داخل کی جاتی ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے ضد اور مقابلہ کرتا ہے۔ پھر تم ایک کے بعد ایک اوزار استعمال کرنے لگتے ہو۔ جب چھری سے کام نہیں چلتا تو کلہاڑی استعمال کرتے ہو، جب کلہاڑی سے بھی کام نہیں بنتا تو درجنوں ننھی ننھی تیز چھریاں جو آری میں دندانے کی صورت میں لگے رہتے ہیں لکڑی میں اپنے دانت گاڑ کر کُترنے لگتی ہیں۔ جلد ہی وہ تمام فاضل مادہ جو اس چیز کے اُوپر چھایا ہوا تھا، چپٹیاں، بھوسا اور ننھے مُنے پرزے بن بن کر اُڑ جائے گا بے شک۔ یہ تمہاری بڑی فتح ہے جو ان تمام زمانوں میں، ان اوزاروں کو ایجاد کرتے اور مکمل کرتے رہے، نئے نئے سامان دریافت کرتے رہے، کام کے نت نئے طریقے معلوم کرتے رہے۔

اس وقت اس کتاب میں ہم اُن پہلے کاریگروں سے متعارف ہو چکے ہیں، ان کاریگروں سے جنہوں نے چھری، کلہاڑی اور ہتھوڑا ایجاد کیا۔ ہم نے انہیں کام کرتے بھی دیکھا۔ وہ کام جو ہمارے اس کام کی مانند مشکل بھی تھا اور دلچسپ بھی۔

اُن اولین بڑھئیوں، معماروں اور کھائی کھودنے والوں کو، جو جنگلی جانوروں کی کھالوں میں ملبوس تھے، ایک چھوٹی سی کشتی بنانے بنانے بھی کئی ماہ لگ جایا کرتے تھے۔ اُن کے لئے ایک مٹی کی ہنڈیا بنانا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا جتنا

آج ہمارے لئے پتھر کا ایک مجسمہ بنانا لیکن وہ معمار، وہ کیمیاگر اور دھات کے ماہرین جو آج دنیا کی کایا پلٹ رہے ہیں وہ انہیں کانبوں، کمہاروں اور کھائی کھودنے والوں کی اولاد ہیں۔

مثلاً زمانۂ قدیم کے کمہار کو لیجئے۔ وہ کمہار جس نے پہلی مرتبہ مٹی سے ایک ایسی چیز تیار کی جو قدرت کے کارخانے میں پہلے سے موجود نہ تھی، یہ دوسری فتح تھی۔ ایک فتح مٹی پر اور دوسری آگ پر۔ یہ سچ ہے کہ لوگ پہلے بھی آگ کو استعمال کرتے تھے۔ اس سے انہیں گرمی پہنچتی تھی، جنگلی جانور ڈر کر بھاگ جایا کرتے تھے، پھر جلا کر جنگل صاف کئے جاتے تھے اور جب انسان کشتی تیار کرتا تھا تو بھی آگ اس کی کلہاڑی کی مدد کو پہنچی تھی۔ انسان نے اس وقت تک آگ بنانا سیکھ لیا تھا۔ بس لکڑی کے ایک ٹکڑے کو دوسرے پر رگڑا اور آگ ہاتھ جوڑے حاضر ہو گئی۔

لیکن اب انسان نے آگ کو ایک اور خدمت پر مامور کیا جو پہلے سے بہت زیادہ پیچیدہ تھی کہ ایک مادّہ کو دوسرے مادّہ میں تبدیل کرے۔ انسان آگ کے اثر سے واقف ہو چکا تھا اور اس نے اسے برتن تپانے، کھانا پکانے، روٹیاں سینکنے اور کچا لوہا گلانے پر بھی لگا دیا۔ آج کوئی ایسی فیکٹری ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی جہاں آگ اس کام میں مصروف نہ ہو اور دھڑا دھڑ ایک مادے کو دوسرے میں تبدیل نہ کر رہی ہو۔ آگ ہی کی مدد سے ہم کچے لوہے سے فولاد، ریت سے شیشہ، لکڑی سے کاغذ حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے کیمیاگر اور دھات کے ماہرین، فیکٹری کی بھٹیوں میں جلنے والی آگ کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ یہ تمام بھٹیاں اس آگ کی اولاد ہیں جو کھلے ہوئے الاؤ اور بھٹیوں میں جلا کرتی تھی اور جہاں قدیم زمانے کے برتن بنانے والے اپنے مٹی کے بھدے، خرطومی شکل کے برتن تپایا کرتے تھے۔

اناج کے ایک دانہ کی کہانی اسی کی زبانی

ماہرین آثار قدیمہ نے ایک شکاری ڈیرہ میں، کئی اور چیزوں کے ساتھ ساتھ، کچھ مٹی کے کونڈے بھی پائے تھے۔ ان کونڈوں پر آڑی آڑی لکیروں کا سادہ نمونہ بھی کھدا ہوا تھا اور اسی نمونے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے برتنوں کو کس طرح بناتے اور کیسے پکاتے ہوں گے

ایک تیلیوں کی بُنی ہوئی ٹوکری میں گیلی مٹی سان کر تھوپ دی جاتی تھی اور پھر اس برتن کو آگ میں تپایا جاتا تھا تیلی کی ٹوکری جل جایا کرتی اور برتن رہ جایا کرتا تھا اور اس طرح ٹوکری کی تیلیوں کا آڑا سیدھا نمونہ کونڈے کے اوپر بن جایا کرتا تھا۔ بعد میں جب لوگ ٹوکری کی مدد کے بغیر بھی برتن بنانے لگے تب بھی کمھار یہ آڑا سیدھا نمونہ اُس پر خود ہی کھینچ دیا کرتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اگر ان کے برتن دیکھنے میں ایسے ہی نہ ہونگے جیسوں میں اُن کی دادیاں اور پردادیاں پکایا کرتی تھیں تو شاید اُن برتنوں میں کھانا ٹھیک سے نہ پک سکے گا۔

اُس زمانے میں کاریگروں کا یہ خیال تھا کہ ہر چیز میں اس کی اپنی ایک پوشیدہ اور خفیہ طاقت ہوتی ہے اور کونڈے کی طاقت ان لکیروں میں پوشیدہ ہے۔ نمونہ بدلا کہ شامت آئی! پھر تو کون جانے کونڈے کی وجہ سے آپ کو کن کن بلاؤں کا سامنا ہو قسمت خراب ہو جائے، غریبی آ جائے، بھوکا رہنا پڑے!

بعض وقت تو کمھار برتن پر کتے کی تصویر بنا دیتا تھا۔ برتن کو نظر بد سے بچانے کے لئے چونکہ کتے کی ذات کا تعلق حفاظت کرنے سے تھا لہذا کتا اس لئے بنا دیا جاتا تھا کہ برتن اور اس میں رکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کرتا رہے۔

اس طرح کے جالدار لکیروں والے کونڈے بہت سے مقامات پر پائے گئے

ہیں ان میں سے ایک جو فرانس میں شہر کمپین کے پاس پایا گیا تھا' خاص طور پر مشہور ہے۔ جب ماہرین آثارِ قدیمہ نے اس کا معائنہ کیا تو اس پر جو نقوش بنے تھے اس میں ان کو ایسے نشانات بھی ملے جو جو کے دانے چپکا کر بنائے گئے تھے۔ اس دریافت سے اُن لوگوں میں بڑی سنسنی اور کھلبلی مچی کیونکہ اس کی یہ اہمیت نہ تھی کہ وہ جو کے دانے تھے بلکہ یہ ایک ثبوت تھا۔ ایک ننھا منا سا ثبوت' کہ انسان کی زندگی میں بڑی اہم تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں اناج کے دانے ہوں گے وہاں کھیتی باڑی ضرور ہوگی اور اسی کے ساتھ ساتھ جس ڈھیر پر سے ان کو یہ جو کے نقوش والا برتن ملا تھا وہاں سے اناج پیسنے کی چکیاں اور پتھر کی کدالیں یا ہل وغیرہ کے قسم کے اوزار بھی ملے جن سے اناج بونے کے لئے زمین کھودی جاتی تھی۔

اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ ہمارے شکاری اور مچھیرے اب کسان بھی بننے شروع ہو گئے۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قبیلے کا ہر فرد شکار کھیلنے یا مچھلیاں پکڑنے میں مشغول نہ تھا' جب مرد شکار کھیلنے نکل جایا کرتے تھے تو عورتیں اور بچے' ٹوکریاں اور گھڑے وغیرہ لے کے ڈھیر کے آس پاس گھوما کرتے تھے اور کھانے کی جو چیز بھی مل جاتی وہ جمع کر لیا کرتے تھے۔ دریا کے کنارے انہیں گھونگھے اور کیکڑے مل جاتے تھے۔ جنگل سے سانپ کی چھتریاں' بیر اور مغزیات وغیرہ جمع کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سیپیاں اور شاہ بلوط کے سخت پھل بھی نہ پھینکتے تھے بلکہ اُن کو جمع کر کے اور پیس کے روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بعض زبانوں میں اناج کے لئے "اکورن" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو دراصل شاہ بلوط کے سخت پھل کا نام ہے۔ خاص خوشی تو ان لوگوں کو اُس وقت ہوتی تھی جب جنگلی مکھیوں

یہ کتاب دو بار پڑھنی چاہیے

Read this Book twi

کا کوئی چھتہ مل جاتا تھا۔ ایک پہاڑی چٹان پر ایک تصویر پائی گئی ہے جس میں ایک عورت شہد اتارتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گئی ہے ایک ہاتھ سے چھتے سے شہد نکال رہی ہے اور دوسرے ہاتھ میں مرتبان پکڑے ہوئے ہے۔ مکھیوں کے دَل کے دَل غصّے میں بھرے اس کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں لیکن وہ اُن کی پرواہ کئے بغیر چھتے میں سے شہد بھرے بھرے کوئے نکال رہی ہے۔

جب کبھی عورتیں اور بچے اس طرح گشت کرنے نکلتے تو شہد اور بیروں، جنگلی سیبوں اور ناشپاتیوں سے لدے ہوئے واپس آتے اور پھر کیا جشن ہوتا! لیکن گھر کے منتظم اپنے اس سامان کی بڑی حفاظت کرتے تھے، بچوں کو کھسکا دیا جاتا تھا اور جتنی چیزیں بھی ممکن ہو سکتیں گھڑوں، مرتبانوں اور ناندوں میں بھر بھر کر بحفاظت رکھ دی جاتی تھیں کہ نہ معلوم کس دن شکار دھوکا دے جائے تو کام آئیں۔

چنانچہ اس طرح جب موسم ذرا ٹھیک پڑ گیا تو لوگ پھر سے ذخیرہ جمع کرنے لگے۔ شاید آپ یہ سوچیں کہ یہ تو ایک قدم پیچھے اٹھایا گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک جست آگے کی طرف تھی! اس طرح ذخیرہ جمع کرتے سے انسان نے اگانا بھی سیکھا اور اُس حد کو پار کر گیا جو ذخیرہ جمع کرنے والے اور اُگانے والے کے درمیان ہوتی ہے۔

بیروں اور دوسرے پھلوں کے ساتھ عورتیں اکثر اناج بھی لے آیا کرتی تھیں جنگلی جو یا جنگلی گیہوں وغیرہ۔ ان بالوں کو مٹکوں اور کونڈوں میں رکھتے وقت کچھ دانے ادھر اُدھر زمین پر بکھر جایا کرتے تھے ان میں سے کچھ کے انکھوے پھوٹ نکلتے تھے، گویا خودبخود اُگ آتے تھے۔

پہلے پہل انسان سے اتفاقاً بیج اُگ آئے تھے۔ وہ بیج جو ان لوگوں کے نزدیک ضائع ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے جان بوجھ کر دانوں کو زمین پر بکھیرنا

شروع کیا۔ اگانے کے لئے۔

بہت سی قوموں میں اب بھی ایسی کہانیاں، روایات اور گیت ہیں جن میں غلے کے دفن ہونے اور پھر سے دنیا میں وارد ہونے کا بیان ہے۔ کچھ روایتوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک دوشیزہ تھی اور ایک گبروجوان تھا جو زندہ ہی مُردوں کی دُنیا کو چلے گئے تھے اور پھر طلسماتی طریقے سے دنیا کو واپس ہوئے۔

اس قدیم زمانے میں جب عورتیں زمین کو کھود کر اس میں اناج بوتی تھیں تو ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ کسی طلسماتی ہستی کو دفن کر رہی ہیں جو کچھ عرصہ بعد سنہرے بال بکھیرے پھر واپس ان کے پاس لوٹ آئے گی۔ خزاں کے موسم میں جب اناج کی بالیں اکٹھی کی جاتی تھیں تو زمین کے نیچے والی دُنیا سے، اُس طلسماتی ہستی کے واپس لوٹ آنے کے جشن منائے جاتے تھے۔ سب سے آخر میں جو بال اکھیڑی جاتی تھی اُسی زمین میں گاڑ کر کھڑا کر دیا جاتا تھا اور لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو کر گاتے اور ناچتے تھے۔ یہ صرف ناچ ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک طلسماتی رسم اور جشن بھی ہوتا تھا۔ عورتیں اناج کی تعریف میں گیت گایا کرتی تھیں اور زمین سے التجا کیا کرتی تھیں کہ ہمیشہ اُن پر مہربان رہے۔

نئے میں پرانے کی جھلک

موجودہ صدی کے اوائل میں بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں فصل کٹنے کے بعد لوگ فصل کٹنے کا جشن منایا کرتے تھے۔ وہ اناج کی آخری بال لے کر زمین میں گاڑ کر کھڑا کرتے، اس کو لہنگا پہناتے اور سر پر رومال باندھتے تھے، پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گرد ناچتے تھے اور اس قدر زور زور سے گاتے تھے کہ پرلے گاؤں میں آواز پہنچتی تھی۔ اُن کا گانا کچھ اِس قسم کا ہوتا تھا۔

آج ہمارے کھیت میں فصل کٹنے کا دِن ہے

تعریف ہو خدا کی
ایک کھیت کٹ چکا
دوسرا بویا جا رہا ہے
تعریف ہو خدا کی۔

اِس گانے کی دقیانوسی اور درد ناک سے ان مسرت بھرے گیتوں سے بالکل مختلف ہوتی تھی جو اب بھی رات گئے دیہات میں سُنے جاتے ہیں اور جنہیں گاؤں کے نوجوان لڑکے لڑکیاں گشت لگاتے وقت گاتے جاتے ہیں یہ فصل کٹنے کا جشن دراصل ایک بہت ہی قدیم رسم ہے جو نسلاً بعد نسلاً کھیتی کرنے والوں میں چلی آ رہی ہے۔

یہاں تک کہ بچوں کے کھیلوں میں اس طرح کی رسومات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بچے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور گاتے جاتے ہیں:۔

جو، مٹر، سیم اور جواری اُگو
جو، مٹر، سیم، اور جواری اُگو

یہ گانے کا کھیل کسی زمانے میں ایک رسم تھی۔ صدیوں تک چلنے کے بعد اب اس کی پُرانی طلسماتی اہمیت اور معنی ختم ہو چکے ہیں اور صرف اس کی مسرت ہی باقی رہ گئی ہے۔

اور کرسمس درخت! کسی زمانے میں کرسمس کے درخت کو متبرک سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس لئے سرو کے درخت کے گرد ناچتے تھے کہ سوئے ہوئے جنگل اور میدان جاگ اٹھیں، سردی جائے اور بہار کا موسم پھر سے واپس آئے۔ لیکن ہمارے بچے جو کسی خوشی سے سرو کے درخت کو کاٹتے چھانٹتے ہیں، اُسے متبرک خیال نہیں کرتے اُن کے لئے یہ درخت صرف اُس مسرت بھرے کرسمس کے جشن کا ایک حصہ ہے

بہت سی قدیم رسوم، ٹونے ٹوٹکے، جھاڑ پھونک، اب بچوں کا کھیل تماشہ بن کر

رہ گئے ہیں اُن بوڑھوں کی مانند جو بچوں کو اپنے چاروں طرف جمع کرنا پسند کرتے ہوں۔ جیسے "گگری ٹوٹی بیل پیاسا، اللہ میاں پانی دے" "یا برسادے اللہ پانی، تیری دُنیا ہے حیرانی" اب بچے جب وقت یہ گیت گاتے ہیں تو وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان گیتوں سے وہ پانی برسالیں گے۔ وہ تو صرف گانے کے لئے گاتے ہیں۔ نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی اکثر ایسے کھیل کھیلنے یا گیت گانے سے نہیں رُکتے، جن کے معنی قدیم زمانے میں کچھ اور ہی تھے۔

اٹلی اور فرانس میں لوگ اب بھی کارنوال کو دفنانے کا میلہ لگاتے ہیں۔ گلیوں میں لوگوں کی بھیڑ جلوس بنا بناکر جمع ہوتی ہے۔ گورکن اپنے کاندھوں پر کارنوال کی لاش لئے رہتے ہیں جو چیتھڑوں میں لپٹی ہوتی ہے۔ یہ لوگ برابر خاموشی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، ہر ایک کے ہاتھ میں ایک بگل اور جیب میں شراب کی بوتل ہوتی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ جلوس رُک جاتا ہے اور گورکن دو چار گھونٹ شراب پی کر اپنی تھکن دور کرتے رہتے ہیں۔ ایک عورت جو گویا کارنوال کی بیوی ہوتی ہے، جلوس کے آگے آگے ہوتی ہے اور جھوٹ مُوٹ روتی اور شدید اظہارِ غم کرتی جاتی ہے۔ جس پر لوگوں کے ہجوم میں خوب خوب قہقہے پڑتے ہیں۔ پھر یہ جلوس صدر بازار یا چوک میں پہنچ جاتا ہے جہاں ایک الاؤ لگا ہوا ہوتا ہے، اور گورکن کارنوال کی لاش کو آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ میت دھڑا دھڑ جلنے لگتی ہے، ڈھول پٹنے لگتے ہیں اور پھر ایک رنگین جشن شروع ہو جاتا ہے۔ گلیوں میں تماشائی اپنے اپنے چہروں پر طرح طرح کے نقاب ڈالے پھرتے رہتے ہیں، ہر پارک کا ایک الگ بینڈ ہوتا ہے اور رنگین جوڑے ادھر ادھر ناچتے رہتے ہیں۔

یہ کارنوال کون ہے جس کے جنازے کی اتنی دھوم دھام ہوتی ہے
اگر آپ اُن سرشار گورکنوں سے، یا کارنوال کی "بیوہ" سے اس کے متعلق سوال

پوچھیں گے تو وہ جواب دیں گے کہ "بس ایک پرانی رسم ہے اور کیا؟" لیکن وہ آپ کو یہ نہیں بتا سکیں گے کہ یہ رسم آئی کہاں سے ہے۔ اس رسم کے اصل معنی لوگ کب کے بھول چکے کیونکہ اس کو شروع ہوئے ہزاروں سال کا عرصہ گذرا۔

اس کے اصل معنی یہ تھے: کار زوال موت کی علامت تھا جو جاڑوں کے زمانے میں کل کائنات کو ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا کرتا تھا۔ اب کون جانے شاید وہ ہمیشہ کے لئے ہی دنیا پر چھا جائے کیونکہ قدیم انسان کو یہ یقین کس طرح آتا کہ سردی کے بعد پھر بہار کا موسم لوٹ آئیگا۔ اسے ابھی قوانین قدرت اور جغرافیہ کی واقفیت تو تھی نہیں ہر موسم بہار اُسے ایک طلسمی کرشمہ نظر آتا تھا۔ قدرت نے انہیں کسی طلسمی طاقت کے تحت موسم بہار پھر سے لوٹا دیا تھا اور انسان ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ طلسمی رسمیں، جادو ٹونے وغیرہ کر کے موسم بہار کو واپس بلائے، جاڑے کو دفنانے اور بہار کو حاصل کرنے کے لئے میدانوں میں پھر سے پھول اور درختوں میں پتیاں اُگانے کے لئے۔ یہ مقصد تھا اس کھیل اور اس ناٹک کا۔ لہذا اس لئے وہ جاڑوں کے موسم کو گویا دفن کرتے تھے۔

اور یہ پرانی رسمیں اور یہ توہمات اب ہمارے لئے دلچسپ اور رنگین جشن بن گئے ہیں اس کے علاوہ وہ اور بھی کئی طرح سے ہم میں موجود ہیں۔ ایسٹر کے زمانے میں، گرجاؤں کی سنجیدہ دعاؤں میں، ہم قدیم زمانے کے طلسمی گیتوں کی گونج سُنتے ہیں قدیم زمانے کے کھیتی کرنے والوں کے گیتوں کی طرح یہ دعائیں بھی ہمیں موت اور پھر دوسری دنیا سے واپس آنے کا حال سُناتی ہیں اگر گرجا کے باہر یہ چیزیں بچوں کے گیتوں میں محفوظ ہیں تو گرجا کے اندر، مذہبی رسوم میں دکھائی دیتی ہیں۔ جب عورتیں زمین کھود کھود کر اناج بونے میں مصروف رہتی تھیں تو مرد اپنا تمام تمام دن شکار کھیلنے میں گذارا کرتے تھے اور شام کو شکار سے لدے پھندے گھر پہنچتے تھے۔ جب بچے اپنے باپوں اور بڑے بھائیوں کو گھر لوٹتے دیکھتے تو جلدی جلدی دوڑتے کر دیکھیں

کو سب سے پہلے معلوم کرتا ہے کہ آج کیا کھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ کبھی کسی جنگلی سوٗر کی خون سے سرخ تھوتھنی، اور اس کے منہ کے دونوں طرف نکلے ہوئے، خم کھائے ہوئے دانت دیکھتے، کبھی ہرن کے بلدار سینگوں کو تکتے لیکن اُن کو سب سے زیادہ خوشی تو اس وقت ہوتی جب یہ شکاری زندہ جانوروں کو اٹھائے ہوئے یا کھینچے ہوئے لاتے۔ ننھے ننھے میمنے یا کوئی بیچارہ بکری کا بچہ جس کے سینگ بھی ہنوز پورے نہ نکلے ہوں۔ شکاری اپنے ان چوپائے قیدیوں کو ایک دم نہیں مار ڈالا کرتے تھے بلکہ ان کو کسی گھیرے میں بند کر دیتے اور ان کو کھلاتے پلاتے کہ بڑھ جائیں۔ اپنے اطراف میمنوں اور گائے کے بچوں کو چلتے پاکر وہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ بھی سمجھتے اور ساتھ ہی یہ بھی اطمینان رہتا کہ اگر کبھی شکار کم ہوا تو بھی انہیں گوشت کی کمی نہ ہوگی اب ان کے پاس ان گھیروں کے اندر ذخیرہ جمع رہتا تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ یہ ذخیرہ ایسا تھا جو ہر وقت بڑھتا رہتا تھا۔

شروع شروع میں انسان نے صرف گوشت اور کھالوں کی خاطر مویشی پالے ان کو فوراً ہی اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ مویشی رکھنے سے کیا کیا فوائد ہیں شکاری تو ان مویشیوں کو شکار ہی سمجھتے تھے اور شکار کو مارنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے ان کے لئے یہ سمجھنا آسان تھا کہ گھوڑے یا بھیڑوں کو اگر زندہ رہنے دیا جائے تو ان کو مارنے سے بھی کہیں زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اگر کھانا ہو تو ایک گائے کو ایک ہی دفعہ کھایا جا سکتا ہے لیکن اُس کا دودھ آپ لگاتار کئی سال تک استعمال کر سکتے ہیں اور اگر آپ اسے مار ہی نہیں، تو آخر میں اس کے ذریعہ گوشت بھی زیادہ حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر گائے ہر سال ایک بچہ دیتی ہے

اور یہی بات بھیڑوں پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کو مار کر کھال کھینچ لینا آسان کام تو ہے مگر ایک کھال سے بھلا کام ہی کیا چل سکتا ہے۔ اس سے تو بہت بہتر یہ

ہے کہ بھیڑ کو اس کی کھال بخش دی جائے اور صرف اُون کاٹ لیا جائے۔ ہر مرتبہ کترنے کے بعد نیا اُون پھر سے نکل آتا ہے اور ایک ہی بھیڑ سے آپ اپنے لئے ایک کے بجائے درجنوں کھالیں فراہم کر سکتے ہیں۔

اِن چوپائے قیدیوں کو مار ڈالنے کے بجائے اُن لوگوں کا زیادہ فائدہ اسی میں تھا کہ ان کی جان چھوڑ دیں اور اِس کے عوض ان سے خراج وصول کر لیا جائے۔ لیکن لوگوں نے اِس بات کو فوراً ہی نہیں سمجھ لیا اور جنگجو شکاری کو پُرامن گڈریا بنتے بنتے بھی کئی پُشت لگے۔

ان تمام باتوں کا مطلب کیا ہوا؟

کہ ان لوگوں نے اناج کو زمین میں دفن کیا تو ایک کے بدلے کئی کئی دانے حاصل کئے۔ انہوں نے اپنے شکار کو زندہ چھوڑ دیا تو وہ تعداد اور ضخامت میں بڑھتا ہی گیا۔

اِنسان آزاد تر ہو گیا اور اسے قدرت کی اتنی محتاجی نہ رہی۔ پہلے اُسے یہ کبھی اطمینان نہ ہوتا تھا کہ آیا وہ کسی جنگلی جانور کا سراغ لگا کر اُسے مار سکے گا یا نہیں، یا اُسے اتنا اناج بھی مِل سکے گا کہ اُس کا دامن بھر جائے۔ کون جانے قدرت کی پُراسرار طاقتیں اُسے غذا عنایت کریں گی یا ہاتھ کھینچ لیں گی؟ لیکن اب اِنسان نے قدرت کو مدد دینا سیکھ لیا تھا۔ اب اُس نے اناج اگانا سیکھ لیا تھا اور شکاریوں کو جنگلوں میں جا جا کر جنگلی جانوروں کا سراغ لگا کر انہیں مار گرانے کی حاجت نہ تھی!

اب ان کے گھروں کے آس پاس، زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر اناج اُگا کرتا تھا، گائیں اور بھیڑیں قریب کے چراگاہوں میں چرتی پھرتی تھیں۔

اِنسان نے ایک طلسماتی گودام دریافت کر لیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اپنی محنت سے بنا لیا تھا۔

اب اسے اپنے کھیتوں اور چراگاہوں کے لئے زمین کی ضرورت تھی اُسے یہ زمین جنگلوں سے چھین کر لینی تھی، اور اس کے لئے اسے زمین کو کھودنا اور اُس میں نالیاں وغیرہ بھی بنانا تھا۔ اُف اس کام کے لئے کس قدر محنت اور جانفشانی کی ضرورت تھی!

انسان نے قدرت سے جو یہ آزادی حاصل کی یہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی کہ آئے اور لیٹ رہے! انسان نے اسے سخت اور شاقہ محنت سے، ہزاروں رکاوٹوں اور دقتوں کو پار کر کے حاصل کیا تھا اس نئے کام کی اپنی خوشیاں بھی تھیں اور پریشانیاں بھی۔ ممکن ہے تیز دھوپ فصل کو جھلس دے، وادیوں اور چراگاہوں کی گھاس کو سکھا دے۔ برسات کا پانی بوئے ہوئے بیجوں کو بہا لیجائے

قدیم شکاری بھیڑیئے یا ریچھ سے التجائیں کرتا تھا کہ وہ اپنا گوشت اُسے عنایت کرے! قدیم کسان زمین سے، آسمان سے، برسات سے التجا کرتا تھا کہ اس کی فصل اسے بخشدے

اور اس طرح انسان اپنے اپنے نئے نئے خدا ایجاد کرتا رہا۔

یہ نئے خدا بھی پرانے خداؤں سے ملتے جلتے ہی ہوا کرتے تھے۔ پرانے عقیدوں اور رسم کے مطابق اُن کے تصور میں، ان خداؤں کی صورتیں جانوروں سے ملتی جلتی تھیں، یا پھر انسان کا دھڑ اور جانوروں کا سر ہوا کرتا تھا۔

لیکن اِن خداؤں کے نئے نئے نام اور نئے نئے کام تھے۔ کسی کا نام آسمان، تو کسی کا زمین، تو کسی کا سورج، اور اُن کا یہ کام تھا کہ روشنی اور اندھیرا، دھوپ اور ہوا بخشتے رہیں۔

ہمارا انسان "دبو" اب بڑا ہو گیا ہے، مضبوط تر ہو گیا ہے مگر ہنوز اپنی طاقت سے خود ہی آشنا نہیں ہے۔ وہ ابھی تک اسی پرانے عقیدے پر قائم ہے کہ اُس کا روزگار رزق اور روزی آسمان سے حاصل ہوتی ہے اُسے اپنے زور بازو سے نہیں۔

چوتھا باب

تین ہزار سال بعد

گھنٹے کی سوئی آگے کھسک گئی

آیئے ہم تاریخ کی گھڑی پر گھنٹے کی سوئی کو تین ہزار سال آگے بڑھا دیں۔ اب اس کا فاصلہ ۱۹۴۷ء سے کوئی چالیس سو سال دور رہیگا۔

چالیس سو سال! اگر آپ کسی ایک شخص کی زندگی، یا کسی قوم ہی کی زندگی کا ذکر کر رہے ہوں تو یہ عرصہ کتنا لمبا ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہم کسی ایک شخص کا ذکر نہیں کر رہے ہیں؛ ہم انسان کا ذکر کر رہے ہیں اور انسان بھی وہ جو بڑے حرفوں سے لکھا جائے۔ یعنی انسانیت۔ کل انسانیت!

بڑے حرفوں والے انسان کی عمر کم از کم دس لاکھ سال ہے اور اس لحاظ سے چالیس سو سال کچھ زیادہ نہیں ہوتے۔

تو پھر جناب۔ چلی گھنٹے کی سوئی۔ کرۂ ارض سورج کے چاروں طرف کئی ہزار چکر لگا چکا اور اس درمیان اس پر کیا گذری؟

پہلی ہی نظر پڑتے ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں خالی مقامات نظر آتے ہیں جیسے بال اڑ گئے ہوں۔ پرانے زمانے میں تو گھنے جنگلوں کے سیاہ سیاہ تودوں میں سے صرف برف کی سفید ٹوپیاں جھانکتی نظر آتی تھیں لیکن اب جنگل چھدرے ہو گئے ہیں۔ خالی زمین کی چوڑی چوڑی زبانوں نے ان کو جگہ جگہ سے چاٹ چاٹ کر صاف کر دیا

ہے۔ یہاں وہاں جنگل کے گھن میں چوڑے چوڑے میدان ہیں جن پر دھوپ چمک رہی ہے، دریاؤں کے ساحل اور جھیلوں کے کنارے پانی سے دور ہٹ گئے ہیں، بیچ بیچ میں چوڑی چوڑی پٹیاں ہیں جن پر جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہے۔

اور وہ دُور کیا نظر آرہا ہے؟ وہ دریا کے موڑ کے قریب والی پہاڑی پر؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دامن پر کسی نے ایک پیلے رنگ کا رومال پھیلا دیا ہے۔

یہ زمین کا ایک ٹکڑا ہے جسے انسان کے ہاتھوں نے بالکل بدل دیا ہے۔ اناج کی بالوں میں عورتوں کی جھکی ہوئی کمریں دکھائی دے رہی ہیں ہنسیاں، تیزی کے ساتھ اناج کی بالوں کو سر سر کاٹتی چلی جا رہی ہیں۔

ہتھوڑے سے ہمارا تعارف ہوئے تو عرصہ گذرا لیکن ہنسیا سے آج یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ یہ موجودہ زمانہ کی ہنسیا سے بالکل مختلف ہے۔ پتھر اور لکڑی کا بنا ہوا۔ پتھر کے دندانے لکڑی کے دستے ہیں!

یہ کھیت ہے۔ دُنیا کے پہلے کھیتوں میں سے ایک۔ قدرت کے اُس وسیع جنگلی پھیلاؤ میں جہاں اب تک اِنسان کا ہاتھ نہیں پہنچا، ایسے پیلے رومال گنے چنے پائے جاتے ہیں۔ اِس قدیم کھیت میں، اناج کے ساتھ ساتھ، بیچ بیچ میں خس و خاشاک بھی اُگ آئے ہیں۔ ابھی تک انسان نے خس و خاشاک کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا نہیں سیکھا ہے لیکن اناج کی بالیں اُن خاشاک سے بلند ہو چکی ہیں اور وہ وقت نزدیک ہے جب تمام دنیا میں ان کا سنہرا سمندر بہے گا!

دور، دریا کے کنارے، ایک سر سبز چراگاہ میں کچھ چھوٹے چھوٹے ہیولے نظر آرہے ہیں، سفید، زرد، چتی دار۔ یہ چھوٹی چھوٹی ہستیاں چل پھر رہی ہیں، کبھی ایک دوسرے سے دور ہٹ جاتی ہیں کبھی مل کر کھڑی رہتی ہیں۔ بعض بڑی ہیں بعض چھوٹی۔ یہ گلے ہیں، گایوں، بکریوں اور بھیڑوں کے گلے! یہ جانور، جن کو انسان کی

ترکیبوں نے تبدیل کیا ہے، تعداد میں کچھ زیادہ نہیں ہیں، لیکن یہ اپنے جنگل میں رہنے والے رفتہ داروں کے بہ نسبت زیادہ جلدی بڑھتی ہیں کیونکہ اُن کو اپنی خبر گیری خود نہیں کرنی پڑتی۔ چند ہزار سال میں جنگلوں کے مقابلہ میں دنیا میں بہت زیادہ گائیں اور بیل ہو جائیں گے۔

کھیت اور ریوڑ — اِس کے معنی یہ ہیں کہ آس پاس کہیں کوئی بستی بھی ضرور ہوگی۔ ٹھیک ہے وہ رہی بستی دریا کے کنارے تراتی میں۔ آپ کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ پُرانے شکاری ڈیروں سے یہ بہت کچھ مختلف ہے۔ مکڑوں اور بُنی ہوئی ڈالیوں کے بجائے یہاں اصل لکڑی کے گھر ہیں جن کی چھتیں دونوں طرف سے ڈھلوان ہیں، دیواریں مٹی سے لپی ہوئی ہیں۔ دروازے پر ایک شہتیر چھت کے نیچے سے نکلا ہوا ہے اور اس پر ایک بیل کا سینگوں دار سر کھدا ہوا ہے۔ یہ بیل گویا ایک دیوتا ہے جو گھر کی حفاظت کر رہا ہے۔ یہ بستی چاروں طرف سے ایک مورچے سے گھری ہوئی ہے جس کو تختوں سے مستحکم کیا گیا ہے۔ اس بستی میں دھوئیں، گوبر اور تازے دودھ کی بو پھیلی ہوئی ہے جیسے ہمارے بچپن کے زمانے کے پُرانے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ گھر کے چاروں طرف بچے کھیل رہے ہیں سوّر اپنے بچوں کا جھول لئے کیچڑ میں لوٹ لگا رہے ہیں۔ گھر کے کھلے ہوئے دروازے میں سے آگ جلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ ایک بوڑھی عورت بیٹھی چولھے پر روٹیاں پکا رہی ہے۔ وہ روٹیوں کو گرم گرم بھوبل پر ڈال دیتی ہے اور پھر اُس پر ایک مٹی کا طباق ڈھک دیتی ہے۔ گویا یہ مٹی کا طباق ہمارے زمانے کے تندور کا کام دیتا ہے۔ پاس ہی ایک الماری پر لکڑی کے پیالے اور گلاس رکھے ہیں جن پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔

آئیے اب آپ گاؤں سے تو ہو لئے ذرا دریا کی طرف چلیں، پانی کے

کنارے ہی پر ایک ڈونگی، جو آدھی پانی سے بھری ہے، ڈبک ڈبک کر رہی ہے۔ اگر ہم دریا سے ہوتے ہوئے اس جھیل تک پہنچ جائیں جہاں سے یہ دریا شروع ہوا ہے تو پھر ہمیں ایک گاؤں اور ملیگا لیکن یہ بالکل اور ہی قسم کا گاؤں ہوگا۔ یہ گاؤں جھیل کے کنارے پر نہیں بلکہ بیچوں بیچ پانی میں جزیرے کی طرح ہے جھیل کے پیندے تک لکڑیوں کا انبار لگایا گیا ہے اس انبار پر بڑے بڑے لکڑی کے شہتیر بچھائے گئے ہیں اور پھر اُن شہتیروں پر تختے بچھا کر فرش بنایا گیا ہے۔ کنارے سے گاؤں تک ایک چھوٹا سا پل ہے۔ گھروں کی دیواروں پر مچھلی پکڑنے کے جال پھیلے ہوئے سوکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جھیل میں مچھلیاں بہت ہونگی مگر اس گاؤں کے رہنے والے صرف مچھلیوں ہی پر گذارا نہیں کرتے۔ گھروں کے بیچ بیچ میں گول خرطومی شکل کے کھلیان بھی ہیں جو ڈالیوں کو آپس میں بُن بُن کر بنائے گئے ہیں۔ اِن میں وہ اپنا اناج کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ کھلیان کے پاس ہی چھپر کے نیچے سے گائے کے چلانے کی آواز آرہی ہے۔

یہ قدیم گاؤں جس کی تصویر ہم اپنے تصور میں کھینچ رہے ہیں کبھی کا غائب ہوچکا ہے۔ جہاں یہ گھر تھے وہاں اب پانی ہی پانی ہے۔ اب ان بستیوں کے نشانات ہم جھیل کے پیندے میں سے کیسے معلوم کریں؟ دیکھنے میں تو یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا وقت بھی آتا ہے جب جھیل زمین چھوڑ کر دور تک ہٹ جایا کرتی ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چیزیں نمایاں کرتی ہے جنہیں اُس نے سینکڑوں برس سے محفوظ چھپا رکھا ہے۔

جھیل کا افسانہ

۱۸۵۳ء میں سوئٹزرلینڈ میں ایک زبردست طوفان آیا تھا اور جھیلیں

اپنے کنارے چھوڑ چھوڑ کر بہت پیچھے ہٹ گئی تھیں ان کا گدلا پیندا بالکل صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ زوریچ جھیل کے کنارے ہے جو شہر آوبرگین ہے اس کے لوگوں نے یہ طے کیا کہ اس طوفان سے فائدہ اٹھایا جائے اور تھوڑی سی خشک زمین جھیل سے چھین لی جائے۔ اس مقصد کے لئے ان کو یہ بھی کرنا تھا کہ جو حصہ جھیل نے چھوڑ دیا تھا اس پر پاڑ (بند) باندھ دیا جائے۔ کام شروع ہو گیا اور انہوں نے جھیل کے اس پیندے پر جو خشک ہو گیا تھا، مٹی حاصل کرنے کے لئے کھدائی کرنی شروع کر دی۔ پہلے جن مقامات پر، اتوار کے دن لوگ، رنگین کپڑے پہن کر، لال اور نیلی کشتیوں میں جھیل کی سیر کیا کرتے تھے، وہاں اب کھدائی کرنے والے مٹی اچھالتے ہوئے اپنے گھوڑوں کو زور زور سے چلّا کر ہانکتے ہوئے سنائی دیتے تھے۔

ایک دن ایک کھودنے والے کی کدال، زمین کے اندر، ایک لکڑی کے ڈھیر میں لگی۔ یہ ڈھیر تقریباً گل سڑ چکا تھا۔ اس ڈھیر کے نیچے ایک دوسرا ڈھیر نکلا پھر ایک تیسرا۔۔۔۔ اب ظاہر تھا کہ ٹھیک اس مقام پر لوگ پہلے بھی کام کر چکے ہیں۔ پھاوڑے بھر مٹی کے ساتھ کبھی پتھر کی کلہاڑیاں نکلتیں کبھی مچھلی پکڑنے کے کانٹے کبھی ٹوٹے پھوٹے برتن۔ اب کیا تھا! ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو تو پہنچنا ہی ہوا! ڈٹ گئے اپنے کام پر اور لگے ایک ایک لکڑی اور جھیل کے پیندے سے نکلی ہوئی ایک ایک چیز کا جائزہ لینے اور آخر کار، ہمارے واسطے کتابوں کے صفحے پر وہ گاؤں بنا ہو گیا جو کسی زمانے میں زوریچ جھیل کے بیچوں بیچ لکڑیوں کے انبار پر بنا ہوا تھا۔

حال ہی میں اس قسم کے کئی دیہات دریافت ہوئے ہیں کیونکہ حال ہی میں ماہرینِ آثار قدیمہ سوئٹزرلینڈ کی ایک اور جھیل میں تفتیش کر رہے تھے جس کا نام نیوشاٹل ہے۔ انہوں نے اس جھیل کے پیندے میں کئی جگہ شگاف دیا اور ہر جگہ یہ معلوم کیا کہ لکڑی کی بہت سی تہیں جمائی گئی ہیں جیسے فرض کیجئے ایک کیک ہے جس میں جابجا

ریت کی تہ دی گئی ہو تو ایک سادہ مرتبہ کی تہیں بآسانی الگ الگ پہچانی جا سکتی ہیں اسی طرح یہاں بھی ہر تہہ دوسری تہہ سے علیحدہ پہچانی جا سکتی تھی۔ سب سے نیچے بالکل پیندے میں ریت تھی پھر ایک تہہ گاد کی تھی جس میں رہائش کے آثار پائے جاتے تھے اور اسلحہ اوزار اور برتن پائے گئے جو ان بستیوں کے رہنے والوں کے تھے پھر ریت تھی۔ یہ صورت کئی بار دہرائی گئی تھی۔ صرف ایک مقام پر ریت کی دو تہوں کے درمیان کوئلے کی ایک موٹی تہہ بھی تھی

یہ پرت کس نے جمائے تھے؟

ریت تو خیر پانی سے بھی جم سکتی تھی مگر کوئلہ کہاں سے آیا؟

ظاہر ہے کہ یہاں آگ نے اپنی کارگزاری کی تھی!

ان پرتوں اور تہوں کا معائنہ کرنے کے بعد سائنس دانوں نے جھیل کی مکمل تاریخ معلوم کر لی۔ بہت پرانے بہت ہی پرانے زمانے میں لوگ کبھی اس جھیل پر آئے ہوں گے اور اس کے کناروں پر اپنی بستیاں بسائی ہوں گی۔ بعد میں جھیل میں سیلاب آیا ہوگا اور جھیل نے بستی کے کناروں کو ڈھانپ لیا ہوگا۔ لوگ اپنے ڈوبے ہوئے گاؤں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مکانات گل سڑ کر پانی میں گر پڑے۔ جن چھتوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں میٹھے گیت گایا کرتی تھیں ان کے اوپر اب ننھی منی مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں جھیل کی رہنے والی تیز دانتوں والی مچھلیاں، مزے مزے میں اپنے سفنے ہلاتی چوپٹ کھلے ہوئے دروازوں سے بہہ بہہ کر نکلتی تھیں، چولھے کے پاس الماری میں کیکڑے اپنے ڈنک پھیلا پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

لیکن جھیل ایک جگہ بھلا کب ٹھہرتی تھی۔ آہستہ آہستہ پانی کنارے سے ہٹنے لگا اور پیندا خالی نظر آنے لگا زمین کا وہ ٹکڑا جس پر کبھی گاؤں آباد تھا، اب جو خالی ہو کر خشک ہو گیا لیکن گاؤں کا کہیں پتہ نہ تھا کیونکہ اس کے کھنڈر ریت کی تہہ

کے اندر گہرے دفن ہو چکے تھے۔

لوگ پھر جھیل پر پہنچے۔ کلہاڑیوں کی صدا فضا میں گونجنے لگی۔ سفید سفید چھپٹیاں زرد زرد مٹی پر ادھر اُدھر بکھر گئیں۔ جھیل کے کنارے نئے نئے مضبوط مکان، ایک ایک کر کے پھر سر اٹھانے لگے۔

اس طرح انسان اور جھیل کی جنگ باری باری سے ہوتی رہی۔ لوگ بناتے رہے جھیل بگاڑتی رہی۔

آخر کار لوگ اس جدوجہد سے عاجز آ گئے۔ انہوں نے کنارے پر مکان بنانے چھوڑ دئے اور جھیل کے بیچ سے ہیں بَلیاں گاڑ گاڑ کر، پانی کے بیچوں بیچ اپنے مکان بنانے لگے۔ اپنے مکانوں کے فرش کی درازوں میں سے وہ گہرے پانی کو اپنے پاؤں تلے دیکھ سکتے تھے، مگر اب یہ پانی ان کے لئے خوفناک نہ تھا۔ اس کا جتنا جی چاہے بڑھے، مگر اب تو وہ ان کے فرش تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا!۔

لیکن پانی کے علاوہ انسان کا ایک اور دشمن بھی تھا، آگ! پرانے زمانے میں جب لوگ غاروں میں رہتے تھے تو آگ سے اُن کو خطرہ نہ تھا۔ غار کی پتھریلی دیواریں جل کر خاک نہیں ہو سکتی تھیں لیکن لکڑی کے گھروں کے ساتھ پہلی مرتبہ آتش زدگی بھی وجود میں آئی۔

آگ کے سُرخ درندے نے جو ہزارہا سال سے انسان کا حلقہ بگوش تھا یکایک اپنے خوفناک پنجے نکال لے! چنانچہ بنوشاٹل جھیل میں جو کوئلے کی تہہ پائی گئی ہے وہ قدیم زمانہ کی آتش زدگی کی یادگار ہے۔

پھر تو جھیل پر بڑی کھلبلی اور بوکھلاہٹ مچی۔ لوگ اپنے اپنے بچوں کو کلیجے سے لگا کر جھم جھم پانی میں کودنے لگے۔ مجبور اور معذور مویشی اپنے چھپروں میں بند، دہاں سے ڈکرانے لگے۔ لیکن لوگوں کو اتنے حواس کہاں تھے کہ ان کی خبر لیں۔ لکڑی

کی بنی ہوئی یہ بستی دھڑا دھڑ جلنے لگی جیسے کوئی مہیب الاؤ لگ گیا ہو۔ چنگاریاں فضا میں بکھرنے لگیں۔ گاؤں کے رہنے والوں کے لئے یہ آتش زدگی ایک زبردست مصیبت اور آفت تھی لیکن وہی آگ جس نے ان کے گھر جلائے، اُس نے ہمارے اور ہمارے عجائب خانوں کے لئے انمول اور بے بہا اشیاء محفوظ کر دیں۔ لکڑی کے برتن، مچھلیوں کے جال یہاں تک کہ اناج کے دانے بھی لیکن وہ کون سی طلسماتی طاقت تھی کہ آگ کے ذریعہ وہ چیزیں محفوظ رہ گئیں جو اُس سے بآسانی جل سکتی تھیں کیونکہ آگ تو بہر حال جلا کر خاک سیاہ کر دینے والی چیز ہے۔

اس سوال کی تشریح یہ ہے! چیزوں میں آگ لگی اور وہ اسی حالت میں پانی میں گرتی گئیں، پانی نے ان کی سلگتی ہوئی آگ کو بجھا کر انہیں بچا لیا اور یہ چیزیں صحیح سلامت جھیل کے پیندے میں پہنچ گئیں۔ اگرچہ وہاں بھی اُن کے لئے ایک اور خطرہ کا سامنا تھا کہ سڑ نہ جائیں لیکن وہ صرف اس وجہ سے بچ گئیں کہ چونکہ آگ میں جل چکی تھیں اس لئے ان پر کوئلے کی ایک تہہ جم گئی تھی اور اسی کوئلے نے انہیں سڑنے سے محفوظ رکھا۔ اگر تنہا آگ ہوتی، یا صرف پانی ہوتا تو اُن کا نیست و نابود ہو جانا یقینی تھا لیکن ساتھ مل کر ان دونوں نے ہمارے لئے ایسی ایسی برباد ہو جانے والی چیزیں بھی محفوظ کر دیں جیسے سوتی کپڑے کا ایک ٹکڑا جو آج سے ہزارہا سال پیشتر بنا گیا تھا۔

پہلا سوتی کپڑا

شروع شروع میں سوت کی بُنائی بجلی کے کارخانوں میں نہیں ہوتی تھی بلکہ ہاتھ سے سوت گوندھا گیا تھا۔ اسکیمو لوگ اب بھی بُننے کی بجائے گوندھتے ہیں وہ لمبے لمبے سوت کے تاروں کو ایک فریم پر پھیلا دیتے ہیں، تانے کی صورت میں اور پھر چھوٹے چھوٹے تارے کر بلنے کی طرح ان لمبے تاروں میں پرونے جاتے ہیں اور

نیچے، اوپر نیچے۔ اس کام کے لئے وہ کوئی شٹل یا چرخی یا تکلی استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ تمام کام صرف ہاتھوں ہی سے انجام پاتا ہے۔

اس فریم کے اندر جس میں تانے بانے پھیلے ہیں، اگر ہم اپنی بجلی کی سوتی مشینوں کی جھلک دیکھنا چاہیں تو بھلا کہاں دکھائی دے سکتی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہماری یہ بجلی کی مشینیں دراصل اسی لکڑی کے چوکھونٹے فریم سے نکلی ہیں۔

جھیل کے باشندے سے جو ہمیں وہ جھلسا ہوا سیاہ کپڑے کا ٹکڑا ملا تھا، وہ انسان کی زندگی کے ایک بہت اہم واقعہ کی داستان ہے۔ انسان، جو پہلے جانوروں کی کھالیں پہنا کرتا تھا اب صرف جانوروں کی کھال پہننے کے بجائے کپڑے کے ٹکڑے بھی تیار کرنے لگا تھا۔

سَن کے ان نیلے نیلے پھولوں والے کھیتوں نے، عورت کی زندگی اور اس کے کاموں میں کتنی محنت اور مشقت کا اضافہ کیا تھا!!

ہنوز ان کے ہاتھوں نے ہنسیے چلانے کی محنت سے آرام نہ لیا تھا کہ اُن پر سَن کا کام بھی آپڑا! پودوں کو جڑ سمیت زمین سے اکھاڑیں، سکھائیں، دھوئیں اور پھر سکھائیں!! اور اس پر بھی بس نہیں، سوکھے سَن کو کوٹیں اور پھر اُس کے تاروں کو کھینچ کر نکالیں، نکلے پر بٹ بٹ کر اُس کا تاگہ بنائیں اور پھر آخر میں جب اس طرح یہ تاگا تیار ہو تو پھر اس کو بُننے بیٹھیں!

کپڑے بنانے میں عورتوں کو اتنا ہی محنت کرنی پڑتی تھی، لیکن اس کے عوض میں انہیں رنگین رومال، دوپٹے اور لہنگے بھی تو ملتے تھے جن میں رنگ برنگی جھالر اور خوشنما رنگین گوٹ لگی ہوتی تھی۔

کان کن اور دھات کے اولین ماہر

آج ہر گھر میں آپ کو کتنی ہی ایسی چیزیں ملیں گی جو مصنوعی مادّوں سے بنی

ہیں۔ ایسے مصنوعی مادّے جو کارخانۂ قدرت میں بنے بنائے نہیں ملتے۔

آپ کو کہیں قدرتی بنی ہوئی اینٹ یا فولاد یا کاغذ نہ ملے گا۔ فولاد بنانے کے لئے انسان قدرتی مادّوں کو کچھ اس طرح بدلتا ہے کہ یہ پہچانے بھی نہیں جاتے۔ فولاد کو دیکھئے تو اس میں کچے دھات کی قطعی مشابہت نہیں ہوتی۔ بھلا اس چینی کے نیم شفاف نازک پیالے میں کسی کو کبھی وہ مٹی بھی دکھائی دے سکتی جس کا یہ جزو تھا۔ ایسی ہی چیزیں کنکریٹ، کچکڑا، پلاسٹر، نقلی ریشم، نقلی ربر وغیرہ بھی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کسی پہاڑ کی چوٹی کنکریٹ کی دیکھی ہے، اور لکڑی سے ریشم بنانے والے کیڑے کا پتہ معلوم ہو تو بتا دیجئے؟

مادّے پر فتح حاصل کرنے کے لئے انسان کو کارخانۂ قدرت میں بہت ہی گہرا جانا پڑا۔ سب سے پہلے اس نے ایک پتھر کو دوسرے پر رگڑ کر شروعات کی اور اب وہ ایسے باریک ذرات تک پہنچ چکا ہے جو صرف خوردبین کے ذریعہ دکھائی دے سکتے ہیں۔ یہ کام آج سے بہت ہی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مادّے پر قابو پانے کا یہ عمل کیمیا سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ انسان کو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کر کیا رہا ہے کہ اس نے ٹٹولتے ٹٹولتے آخر مادّوں کو بدلنا سیکھ ہی لیا۔

جب دنیا کے پہلے کمہار مٹی کو آگ میں تپا رہے تھے تو اس وقت بھی وہ مادّے پر قابو پا رہے تھے حالانکہ انہیں اس کا احساس نہ تھا لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پتھر کی طرح آپ مادّے کو اپنے ہاتھوں سے کوئی صورت نہیں دے سکتے تھے، مادّے کے باریک ذرات ہاتھوں سے بدل نہیں کئے جا سکتے تھے۔ مادّے کی ایک صورت کو دوسرے میں بدلنے کے لئے ہاتھوں کی نہیں بلکہ کسی اور ہی طاقت کی ضرورت تھی اور انسان نے یہ طاقت اس وقت دریافت کی جب اس نے آگ کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا۔ آگ نے اس کے لئے مٹی کو پکا کر چکنا کیا، آگ نے اس کے لئے آٹے کو روٹیوں کی شکل

دی، اور آگ ہی لے اُس کے لئے تانبے کو پگھلایا!

یہ کیسے ہوا کہ انسان، جو ہزارہا سال تک اپنے لئے پتھر کے اوزار بناتا رہا تھا، ایکا ایکی دھات کے اوزار بنانے لگا؟ اور اُسے دھات ملا کہاں سے؟ جب ہم جنگلوں اور میدانوں میں سیر کے لئے نکلتے ہیں تو ہمیں خالص تانبے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تو نظر نہیں آتے! خالص تانبے کی اینٹ آجکل ملنی بڑی دشوار ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ آج سے چند ہزار سال پہلے تانبے کی اتنی کمیابی نہیں تھی جتنی اب ہے۔ بہت سا تانبہ اِدھر اُدھر پڑا رہتا تھا لیکن لوگ اِس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ تو اپنے اوزار چقماق پتھر کے بنایا کرتے تھے اور انہوں نے تانبے کی طرف صرف اُس وقت توجہ دی جب چقماق اُن کی اپنی بے پروائی کی وجہ سے کمیاب ہونے لگا۔ جب وہ لوگ کام کرتے اور چیزیں بناتے تھے تو بیکار چیپیوں اور پُرزوں کے ڈھیر لگ جایا کرتے تھے جو کسی مصرف میں نہ آسکتے تھے۔ جیسے آجکل کسی بڑھئی کا امتحان اس کی دکان کے کوڑے سے کیا جاتا ہے، ہزارہا سال گذرنے کے بعد چقماق کی فراہمی میں کھلم کھلا کمی ہونے لگی اگر آج ہمارے دماغ میں یہ بات سما جائے کہ آؤ اپنے اوزار چقماق کے بنائیں تو ہمیں کافی چقماق نہ مل سکے گا کیونکہ ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے چھوڑا ہی نہیں تو کہاں سے ملے؟

اُس وقت دنیا میں اس طرح چقماق کی کمی ہونا ایک بڑی آفت کا سامنا تھا بھلا سوچئے تو سہی کہ اگر لوہے کی کمی ہو جائے تو ہماری ملوں اور فیکٹریوں کا کیا حشر ہو؟ ہمیں کچا دھات حاصل کرنے کے لئے زمین میں گھسنا پڑے گا۔ گہرائی تک، بہت ہی زیادہ گہرائی تک! اور یہی اُس قدیم زمانے کے لوگوں نے بھی کیا۔

انہوں نے کانیں کھودنی شروع کر دیں۔ دنیا کی پہلی کانیں! دنیا کے جن حصوں میں چاک پائی جاتی ہے وہاں اب بھی قدیم زمانے کی کانیں سے

ے کر ساٹھ فٹ تک گہری کانیں پائی جاتی ہیں کیونکہ چاک اور چقماق عموماً ایک ہی جگہ ملتے ہیں

اُس زمانے میں لوگوں کے لئے زمین کے نیچے جا کر کام کرنا بہت ہی خطرناک تھا۔ وہ لوگ یا تو رسی پکڑ کر یا کسی گرہ دار بانس کے ذریعہ اترتے تھے نیچے بہت اندھیرا اور دھواں ہوتا تھا اور وہ لوگ تیل کے چراغ یا چقماق کی مشعل سے کام کرتے تھے آج کل کانوں کی دیواروں کو بڑی بڑی چوبی شہتیروں سے سہارا جاتا ہے تاکہ وہ مضبوط رہیں اور گر نہ پڑیں لیکن اُس زمانے میں انسان کو کانوں کی دیواریں اور زمین دوز راستوں کی محرابیں سہارنا نہیں آتا تھا اکثر ایسا ہوتا تھا کہ زمین بیٹھ جایا کرتی تھی اور لوگ اس میں دفن ہو جاتے تھے کہیں کہیں چقماق کی کانوں میں چاک کے ڈھیر کے نیچے دبے ہوئے کان کھودنے والوں کے پنجر بھی پائے گئے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہی اُن کے اوزار بھی پڑے ملے ہیں۔ ہرن کے سینگوں کے بنے ہوئے کدال وغیرہ۔ ایک جگہ تو لوگوں کو دو پنجر ایک ساتھ ملے ایک بچے کا تھا اور دوسرا پورے آدمی کا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باپ اپنے بچے کو بھی کام کروانے کے لئے ساتھ لے گیا تھا مگر موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ پھر اُسے لے کر واپس لوٹتا۔

ہر صدی گذرنے پر چقماق کمیاب تر ہوتا گیا اور اُسے حاصل کرنا مشکل تر لیکن انسان کو تو چقماق کی ضرورت تھی، اُسے چقماق ملنا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ اُس سے اپنی کلہاڑیاں چھریاں اور پھاوڑے جو بناتا تھا۔

یا پھر اُس کی جگہ، اس کی عوض میں کوئی اور چیز ہونی چاہئے تھی اور تانبہ یہاں مدد کو پہنچا۔ لوگوں نے اس کا معائنہ کرنا شروع کر دیا یہ سبز پتھر کس قسم کا تھا، کیا یہ کسی کام آسکتا تھا؟

انہوں نے تانبے کا ایک ٹکڑا لیا اور اسے ہتھوڑے سے توڑنے کی کوشش کرنے لگے کیونکہ ان کا خیال تو یہ تھا کہ یہ کسی قسم کا پتھر ہے اور وہ اس پر بھی اُسی طرح مشق کرنے

لگے جیسے پتھر پہ کیا کرتے تھے۔ جتنا ہی وہ زیادہ ہتھوڑے مارتے گئے، تانبہ اور سخت ہوتا گیا یہاں تک کہ جب بہت ہی سخت چوٹیں پڑنے لگیں تو ذرے ذرے ہو کر بکھر گیا۔ یہ طریقہ تھا جس سے پہلے پہل انسان نے دھات کو گرم کرنا اور اُس پر کام کرنا شروع کیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ ٹھنڈی ڈھلائی اور گڑھائی ہوتی تھی لیکن ٹھنڈی ڈھلائی کے بعد گرم ڈھلائی کو سیکھنے میں بس ایک ہی قدم کا فرق تھا۔

کوئی تانبے کی اینٹ یا شاید کچے تانبے کا کوئی ٹکڑا آگ میں گر پڑا یا ممکن ہے انسان نے ارادتاً اسے مٹی کی طرح تانبے کو آگ پر پگھلایا ہو۔ جب آگ بجھ گئی تو گلے ہوئے تانبے کی ایک ٹکیہ جو پتھر کے بھوبھل میں سے چھپی جھانک رہی تھی۔

لوگوں نے حیران ہو کر اس معجزہ کو دیکھا جو خود اُن کے ہی ہاتھوں کے اعجاز سے ہوا تھا۔ وہ سمجھے یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی نہیں، بلکہ آگ کے دیوتا کی کرامات تھی کہ بھری بھل، نیلا پتھر سُرخ دمکتا ہوا تانبہ بن کر نکلا۔

انہوں نے تانبے کی اس ٹکیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اُن ٹکڑوں کو پتھر کی کلہاڑی مار مار کر سڈول کیا اور پھر ان سے اپنے لئے کدالیں اور چھریاں بنائیں۔

تو اس طرح اس طلسماتی گودام سے انسان نے ایک چمکتا ہوا مضبوط دھات حاصل کیا۔ اس نے آگ میں کچا تانبہ ڈالا اور وہ سچا تانبہ بن کر اسے واپس ملا۔

اور یہ معجزہ انسان کی کارگزاری سے ہوا۔

تقویم محنت

ہم لوگوں کو عادت ہے کہ وقت کا حساب سالوں، صدیوں اور ہزار سالوں سے لگایا کرتے ہیں لیکن جو شخص قدیم انسان کی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہو اُسے ایک اور ہی قسم کا کیلنڈر استعمال کرنا چاہیے۔ ایک اور ہی طریقے سے وقت اور مدت کو ناپنا چاہیئے۔

اتنے سال، اتنے ہزار سال پہلے کی بات ہے کہنے کے بجائے ہمیں یہ کہنا ہوتا ہے "پرانے زمانے میں پتھر کے دور میں" یا "کانسے کے دور میں" وغیرہ۔ یہ سالوں کا کیلنڈر (تقویم) نہیں ہے۔ بلکہ محنت کا کیلنڈر ہے۔ اس تقویم کے ذریعہ آپ فوراً معلوم کر سکتے ہیں کہ انسان اپنے سفر میں اب کس منزل پر پہنچا۔ معمولی سالانہ تقویم میں وقت ناپنے کے چھوٹے اور بڑے دونوں پیمانے ہوتے ہیں، صدی، سال، مہینہ، دن گھنٹے وغیرہ۔

تقویم محنت میں بھی ایسے بڑے اور چھوٹے پیمانے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں "پتھر کا وہ دور جب کہ گاڑیاں کھینچتے تھے" یا "پتھر کا وہ دور جب انسان نے پتھر کو چمکانا سیکھ لیا تھا"

تقویم سالانہ اور تقویم محنت کا ہمیشہ ایک دوسرے سے میل کھا جانا ضروری نہیں ہے۔ اب بھی دنیا میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں لوگ پتھر کے اوزاروں سے کام کرتے ہیں۔ پولینیشیا میں اب بھی پانی کے اندر، لکڑی کی تھوں پر بستیاں اور گاؤں بسے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سب لوگوں نے اپنے کام میں برابر کی رفتار سے ترقی نہیں کی ہے۔ آسٹریلیا، جو باقی ماندہ دنیا سے بالکل الگ تھا، پچھڑ گیا اور وہ اس لئے کہ وہ تجربات انسانی کے مرکزی دھارے سے دور تھا۔

یورپ کے لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ وہاں اگر کسی خطے پر بھی مٹی کے برتن یا تانبے کی کلہاڑی وغیرہ بنتی تو ذرا ہی ایک قبیلے سے دوسرے تک پہنچ جاتے۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر، دریا میں چھپا چھپ کرتے، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو پہنچ جاتے، تانبہ دے کر عنبر لے آتے، چمڑا دے کر سن حاصل کرتے۔ کسی قبیلے کا چقماق عمدہ ہوتا تھا، تو کسی کی مچھلیاں، تو کسی تیسرے کے مٹی کے برتن چنانچہ

جھیلوں میں لکڑی کے انبار پر بسنے والے لوگوں کے یہاں برتن وغیرہ آیا کرتے اور نہ صرف سامان بلکہ سامان کے ساتھ وہ تبادلۂ تجربات بھی کرتے، کام کرنے کے نئے نئے طریقے ایک دوسرے سے سیکھتے۔

اس طرح مختلف قبائل کی زبانیں آپس میں مِل جُل گئیں اور ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر ہو گئیں۔ الفاظ کے ساتھ خیالات کا بھی تبادلہ ہوا کیونکہ خیالات کو الفاظ سے بھلا کیسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہر قبیلے میں، اُس کے اپنے دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ، باہری دیوتاؤں نے بھی اپنا آسن جمایا۔ مختلف عقائد میں سے چھنتے چھنتے ایک خاص عقیدہ قائم ہو گیا جو آگے چل کر پوری پوری قوموں پر چھا گیا۔

خدا یا دیوتا اِدھر سے اُدھر آنے جانے لگے نئے مقامات پر ان کے نئے نام تو ضرور رکھے مگر انہیں بخوبی پہچانا جا سکتا تھا۔ قدیم لوگوں کے مذاہب کے مطالعہ سے ہم فوراً پہچان لیتے ہیں کہ بابل و نینوا کے تاموز، مصر کے اوسائرس اور یونان کے اڈونس کے بھیس میں وہی ایک خدا ہے۔ وہی کھیتی کرنے والوں کا پرانا دیوتا جو مرجاتا ہے اور پھر زندہ ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ہم دُنیا کے نقشہ پر راستہ بنا سکتے ہیں کہ خداؤں نے کیسے سفر کیا۔ مثلاً اڈونس کو لیجئے یہ شامیوں کے ملک شام سے یونان پہنچا۔ اُس کے نام اڈونس ہی سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کیونکہ یہ شامی لفظ ہے شامی زبان میں اِس کے معنی ہیں "مسٹر" اور یونانیوں نے معنی جانے بغیر ہی یہی اس کا نام رکھ دیا۔

چنانچہ اِس طرح چیزوں کا، الفاظ کا اور عقائد کا تبادلہ چلتا رہا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تبادلہ ہمیشہ لڑائی کے بغیر، امن و صلح کے ساتھ ہوتا تھا۔ اگر "مہمان" لوگوں کا بس چلتا تھا تو تانبہ یا کپڑا یا اناج جو ہاتھ لگ جاتا لے بھاگتے ہیں ذرا پس و پیش نہ کرتے تھے۔ "تجارت" جو اِس حرکت کے بغیر یوں بھی ایک قسم کا دھوکہ

تھا، لبعض وقت کھلی کھلی چوری کی صورت اختیار کر لیتی تھی" مہمان" اور میزبان" اپنے اپنے اسلحات تان لیتے تھے اور فوراً باقاعدہ لڑائی لڑ کر معاملہ طے ہوتا تھا۔

ایسی صورت میں اگر دیہات، قلعوں کی طرح لگنے لگے تو تعجب کیا؟ دیہات کے رہنے والوں نے اپنی بستیوں کو فصیلیں اور تختے اور بند وغیرہ لگا کر محفوظ کرنا شروع کر دیا کہ بن بلائے مہمان اندر نہ گھسنے پائیں۔ ایک قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلوں کے لوگوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ کسی اجنبی کو مار ڈالنا یا لوٹ لینا کوئی گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہر قبیلہ اپنے لوگوں کو تو ایک قوم سمجھتا تھا مگر دوسروں کو اپنے برابر ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے کو تو "سورج کی اولاد" "آسمان کی اولاد" وغیرہ کہتے مگر اجنبیوں کو ایسے حقیر لقب عطا کرتے جو اکثر باقی رہ جاتے اور پھر اُن ہی ناموں پر ان قبیلوں کا نام پڑ جاتا۔ انڈین لوگوں کا ایک قبیلہ ہے جس کا نام ہے "مٹی بھری ناک والے" ایک دوسرا ہے جس کو "ٹیڑھے لوگ" کہتے ہیں۔ یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ان قبیلوں نے خود ہی اپنے لئے ایسے ذلیل نام تجویز کئے ہوں گے۔

اجنبی لوگوں سے اس قدیم دشمنی کے باقیات اب بھی، آج بھی، دکھائی دیتے ہیں اور یہ ایک نہایت ہی ذلیل اور خطرناک بات ہے۔ لوہے کے اس دور میں، بلکہ یوں کہیے کہ المونیم اور بجلی کے اس دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اجنبیوں کے خلاف دشمنی کا پرچار کرتے اور قوموں میں ایک دوسرے سے نفرت پھیلاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو تو ایک مہذب قوم اور باقی سب کو انسان ہی نہیں سمجھتے اور اپنے سے ذلیل اور کمتر سمجھتے ہیں۔

کسی اجنبی یا "غیر" شخص سے، یا کسی دوسری قوم کے آدمی سے دشمنی ایک دقیانوسی اور فرسودہ بات ہے جو قدیم خیالات اور توہمات کی بنا پر ہے۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ دنیا میں نہ کوئی قوم برتر ہے نہ کمتر۔ ہاں ترقی یافتہ قومیں ضرور ہیں اور

ایسی قومیں بھی ہیں جو ترقی اور تہذیب کی راہ پر پیچھے رہ گئی ہیں۔ تقویم محنت کے مطابق یک ایک ہی دور کے رہنے والے بھی صحیح معنوں میں ہم عصر نہیں ہیں۔ یا ایک ہی دور کے نہیں کہے جا سکتے۔ تمام قومیں برابر کی ترقی یافتہ نہیں ہیں بعض مشین کے دور تک پہنچ گئی ہیں بعض ابھی تک لکڑی کے پرانے ہل سے کھیتی کرتی اور لکڑی کے فرسودہ چرخے سے کپڑا بن رہی ہیں بعض ایسی بھی ہیں جو ابھی تک اپنے اوزار اور اسلحات ہڈیوں سے بناتی ہیں۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ لوہا بھی کوئی شے ہے۔

ترقی یافتہ قوموں کو چاہئے کہ وہ پچھڑی ہوئی قوموں کی مدد کریں پچھلے چالیس سال میں وسطی ایشیا اور سائبیریا اور شمال بعید کی قومیں ایک صدی آگے بڑھ گئی ہیں۔ پچھڑے ہوئے لوگ آگے والوں کے نزدیک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یورپ کے سیاحوں اور نئے ملک بسانے والوں نے جب آسٹریلیا دریافت کیا اور وہاں "پتھر کے دور" کے لوگوں کو بسا ہوا پایا تو یہ بات اُن کی عقل میں نہیں آئی کہ پولینیشیا کا حال اور یورپ کا ماضی ایک ہی تھا۔

پانچواں باب

دو دنیاؤں میں جنگ

دو قانونوں کی ٹکر

اپنے جہازوں میں بیٹھ کر سمندر کا سفر کرتے ہوئے لوگوں نے نہ صرف نئے ملک ہی دریافت کئے ہیں بلکہ اکثر گذرے ہوئے زمانے کو بھی پایا ہے۔

جب یورپ کے سیاحوں نے آسٹریلیا دریافت کیا تو ان کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ پورے کا پورا خطہ انہوں نے دریافت بھی کیا اور اس پر قبضہ بھی کر بیٹھے لیکن آسٹریلیا کے رہنے والوں کے لئے یہ ایک زبردست بلائے ناگہانی تھی۔ تقویم محنت کے مطابق آسٹریلیا والے ابھی ایک بالکل اور ہی دور میں رہ رہے تھے اور وہ فرنگی طریقے کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو قطعی تیار نہ تھے۔ اس گناہ پر یورپ والوں نے انہیں چن چن کر جنگلی جانوروں کی طرح موت کے گھاٹ اتار دیا۔

آسٹریلیا کے لوگ ابھی تک جھونپڑوں میں رہتے تھے یورپ میں بڑے بڑے شہروں میں فلک بوس عمارتیں کھڑی تھیں۔ آسٹریلیا کے لوگ ذاتی جائداد کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے، لیکن یورپ میں کسی دوسرے کے جنگل کا ہرن بھی مار دینے پر جیل کی ہوا کھانی پڑتی تھی۔

آسٹریلیا کے کسی باشندے کے لئے جو بات قانونی تھی وہ یورپ والے کے لئے غیر قانونی تھی اور جرم کی حیثیت رکھتی تھی۔ آسٹریلیا کے شکاریوں کا کوئی جتھا جب کہیں بھیڑوں کا کوئی گلہ دیکھتا تو وہ لوگ اسے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے گھیر لیتے تھے، اور اپنے برچھیاں اور نیزے ہلاتے ہوئے چہار طرف سے ان خونزہ جانوروں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

یورپ کے جو لوگ مویشی پالتے تھے اُن کے لئے بھیڑیں ذاتی جائداد تھیں لیکن آسٹریلیا کے قدیم شکاریوں کے لئے یہ ایک خوش قسمتی سے پایا ہوا شکار تھا۔

"بھیڑ اس کی ہے جس نے اُسے خریدا یا پالا ہے" یہ یورپین قانون تھا۔

"جنگلی جانور اُس شخص کا ہے جس نے اُسے ڈھونڈا اور مارا" یہ آسٹریلیا کا قانون تھا۔

اور یورپ کے لوگوں نے بغیر سمجھے بوجھے آسٹریلیا کے لوگوں کو مارنا شروع

کیا گویا وہ بھیڑیے تھے جو بھیڑوں کے ریوڑ میں گھس آئے تھے، صرف اس قصور پر کہ وہ اپنے دور کے قانون کے مطابق چل رہے تھے۔

اسی طرح جب وہاں کی مقامی عورتوں نے آلو کا کھیت دیکھا تب بھی اِن دو قانونوں میں ٹکر ہو گئی۔ انہوں نے آلو کا کھیت دیکھا اور بلا پس و پیش اُن عمدہ پودوں کو اپنی لکڑیوں سے کھودنا شروع کر دیا۔ اتنے بہت سے آلو کھانے کے لائق تیار، اور وہ بھی سب ایک جگہ ملنا بڑی بات تھی۔ جتنا وہ ایک ماہ میں ڈھونڈ سکتی تھیں، اُتنا ان کو یہاں ایک گھنٹے میں مل سکتا تھا لیکن اُن کی یہ خوش قسمتی اُن کے لئے بہت منحوس ثابت ہوئی۔ بندوقوں کی گرج سنائی دینے لگی اور وہ عورتیں اپنی آلوؤں کی گٹھری سمیت زمین پر گر پڑیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کس نے اُن کو مارا اور کیوں مارا۔

جب امریکہ دریافت کیا گیا تب بھی دو دنیاؤں میں اسی قسم کی کشمکش ہوئی۔

امریکہ کا دریافت ہونا

جب یورپ کے لوگوں نے امریکہ دریافت کیا تو ان کا خیال تھا کہ انہوں نے ایک نئی دنیا دریافت کی ہے۔ کولمبس کو ایک زرہ بکتر عنایت کیا گیا جس پر کھدا ہوا تھا۔ "کولمبس کو نئی دنیا دریافت کرنے کے صلے میں"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نئی دنیا ایک پُرانی دُنیا تھی۔ یورپ کے لوگوں نے غیر شعوری طور پر بغیر جانے بوجھے امریکہ میں اپنے اُس ماضی کو دریافت کر لیا تھا جسے وہ خود بھلا چکے تھے۔ سمندر پار کے اِن نو واردوں کے لئے انڈین قوم کی رسمیں وحشیانہ اور ناقابل فہم تھیں۔ اُن کے مکان یورپ کے لوگوں جیسے نہ تھے، اُن کے کپڑے ان کے جیسے نہ تھے، طور طریقے ان کی طرح نہ تھے۔

شمال کے رہنے والے یہ انڈین اپنے موٹے پتھروں کے اور سونا رہڈیوں کے بنایا کرتے تھے لوہے کا انہوں نے کبھی نام بھی نہ سنا تھا البتہ وہ کھیتی باڑی سے ضرور واقف تھے۔ مکا بوتے تھے، کدو اور سیم اور تمباکو، چھوٹے چھوٹے باغ نما کھیتوں میں اُگاتے تھے لیکن اُن کا خاص کام شکار کرنا تھا۔ وہ لکڑی کے گھروں میں رہتے تھے اور اپنے گاؤں کے چاروں طرف لکڑی کے تختوں کی فصیل لگاتے تھے۔ ذرا اور جنوب کی طرف ہٹ کر میکسیکو میں انڈین لوگوں کے پاس تانبے اور سونے کے زیورات بھی تھے۔ اُن کے بڑے بڑے گھر کچی اینٹوں کے بنے ہوتے تھے اور اوپر سے کھریا مٹی سے پُتے رہتے تھے۔

امریکہ کے سب سے پرانے فاتحوں اور نو آبادیاں بسانے والوں نے اپنی ڈائریوں میں اِن باتوں کے متعلق بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن مقبوضات سے متعلق بیان کرنا آسان ہے اور رسوم و طور طریقوں کے متعلق بیان کرنا مشکل ہے امریکہ میں رسوم اور طور طریقے ایسے عجیب و غریب تھے کہ یورپ کے لوگ اُن کو قطعی نہیں سمجھ سکے اور انہوں نے بہت گنجلک اور مبہم طریقے سے اُن کو بیان کیا ہے۔

نئی دُنیا کے اِن بڑے بڑے خطوں میں نہ روپیہ پیسہ تھا، نہ بیوپاری تھے نہ امیر غریب کا فرق تھا انڈین لوگوں میں ایسے قبیلے ضرور تھے جو سونے سے واقف تھے مگر اس کی قیمت سے ناآشنا تھے۔

کولمبس کے ساتھیوں نے جن چند انڈین لوگوں کو پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی ناکوں اور گلوں میں سونے کے زیورات اور ہار تھے، لیکن انہوں نے بڑی خوشی سے ان زیورات کو شیشے کے منکوں، کپڑے کے ٹکڑوں اور چھوٹی موٹی چیزوں کے بدلے میں دے دیا۔

سمندر پار سے آنے والے اِن نو واردوں کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں

تھا کہ تمام دنیا آقا اور مالک، زمیندار اور رعایا میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن انڈین لوگ جب کسی دشمن کو گرفتار کرتے تھے تو اس کو نوکر یا غلام نہیں بناتے تھے۔ وہ یا تو اس کو مار ڈالتے تھے یا پھر گود لے لیتے تھے۔ یہاں نہ ذاتی محل تھے نہ ذاتی جائداد بن تھیں۔ مثلاً اروکی قبیلے کے لوگ مشترک گھروں میں رہتے تھے جن کو وہ "طویل گھرانے" کہتے تھے بہت سے خاندان ایک ساتھ رہتے اور ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ زمین کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ پوری جمعیت کی ہوا کرتی تھی۔ یہاں کوئی مزدور یا نوکر نہیں ہوتے تھے جو دوسروں کی زمینوں پر کام کریں بلکہ سب آزاد تھے اور یہ سب فرنگی لوگوں کو انگشت بدنداں کر دینے کے لئے کافی تھا کیونکہ اُس زمانہ میں ان کے یہاں تو جاگیرداری دور تھا، حاکم اور محکوم تھے۔

یہی نہیں، یورپ میں ہر شخص جانتا تھا کہ اگر وہ کسی کے مال پر قبضہ کرے تو پولیس، کانسٹبل اس کی گردن میں ہاتھ دے کر سیدھا جیل خانے لے جائے گا اور یہاں نہ پولیس تھی نہ جیل تھے لیکن پھر بھی ایک عام معاشی نظم تھا لوگ اُس نظم کو قائم رکھتے تھے لیکن یورپ کی طرح نہیں۔ یہاں امریکہ میں ہر شخص کی حفاظت اُس کا پورا قبیلہ اور قبیلے کے لوگ کیا کرتے تھے اگر کوئی شخص قتل کر دیا جاتا تو سارا کا سارا قبیلہ اس کے خون کا بدلہ لینے پر تیار ہو جاتا تھا اور ایسے بھی مواقع ہوتے تھے کہ اس قسم کے واقعات کا پر امن فیصلہ ہو جاتا تھا۔ قاتل کے رشتہ دار اور اس کی جماعت والے، مقتول کے رشتہ داروں اور جماعت سے معافی مانگ لیتے تھے اور کچھ دے دلا کر خوں بہا ادا کرتے تھے۔

یورپ میں بڑے بڑے شہنشاہ تھے، بادشاہ تھے، شہزادے تھے۔ امریکہ میں بادشاہ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ قبیلوں کے معاملات، پورے قبیلے کی موجودگی میں، چند سرداروں کی ایک جماعت یا پنچایت طے کر دیا کرتی تھی۔ سرداروں کا انتخاب

قبیلے کی خدمت کی بنا پر ہوتا تھا اور اگر وہ اپنا فرض بخوبی انجام نہ دیتے تھے تو نکال باہر کر دئے جاتے تھے۔ سردار اپنے ساتھی قبیلے والوں کا حاکم نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے قبیلوں کی زبان میں اب بھی لفظ "لیڈر" کے معنی "مقرر" کے لئے جاتے ہیں۔

پُرانی دنیا میں بادشاہ حکومت کا سردار تھا، باپ پورے خاندان کا سردار تھا سماج کی سب سے بڑی تنظیم حکومت تھی اور سب سے چھوٹی تنظیم خاندان تھا بادشاہ تخت انصاف پر بیٹھ کر اپنی رعایا کو سزا دے سکتا تھا۔ بادشاہ کے بعد ملک اُس کے لڑکے کے حوالے ہو جاتا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد جائداد بیٹے کو ملتی تھی لیکن یہاں اس نئی دنیا میں کچھ اور ہی قاعدے تھے۔ کسی کسی قبیلے میں باپ کو بچوں پر قطعی اختیار نہ ہوتا تھا۔ بچوں پر ماں کا حق ہوتا تھا۔ بڑے گھرانوں میں عورتیں ہی حکم چلایا کرتی تھیں۔ یورپ میں خاندان کے لڑکے گھر کے گھر ہی میں رہ جاتے تھے اور لڑکیاں "چگتی، چرتی، اور پھر سے اڑ جایا کرتی تھیں" لیکن یہاں شوہر بیوی کو بیاہ کر گھر نہیں لاتا تھا بلکہ بیوی شوہر کو اپنے یہاں لے آتی تھی عورتیں گھر کی مالک و مختار تھیں۔

اِس نئی دنیا کے ایک سیاح کے بیان میں ہمیں حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں "یہاں ہر گھر میں عورتوں کا حکم چلتا ہے اور اس وجہ سے تمام عورتیں آپس میں خوب گٹھ بنائے رہتی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کے ذخیروں میں بے شک سب کا برابر کا حصہ ہوتا ہے اور سب کو اس پر حق ہوتا ہے مگر اُس کمبخت شوہر کی گت کیا پوچھیے جو سامان جمع کرنے میں کم مدد دیتا ہے اور کافی مال غنیمت حاصل نہیں کرتا گھر میں چاہے اس کی کتنی ہی اولاد ہو یا کتنا ہی سامان ہو لیکن کسی وقت بھی اس کو یہ حکم مل سکتا تھا کہ میاں بوریا بستر باندھئے اور تشریف لے جائیے۔ اعدولِ حکمی سے قطعی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ گھر میں اس کا زندہ رہنا دوبھر ہو جائیگا۔ اب یا تو کوئی خالہ یا نانی وغیرہ

لہ یعنی ایسے گھرانے جن میں کئی کئی کنبے مل کر رہتے ہیں۔

کے قسم کی عورت اس کی طرفداری اور سفارش کرے ورنہ اس کے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں ہے کہ یا تو اپنے قبیلے کو واپس چلا جائے یا کسی اور قبیلے میں شادی کر کے بیٹھے۔ عورتوں کو یہاں بہت اقتدار حاصل ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ کسی "سردار کے بھی سینگ کاٹنے سے نہیں چوکتیں" مطلب یہ کہ اُسے سرداری سے علیحدہ کر کے معمولی سپاہی بنا دیتی ہیں۔ سردار کا انتخاب کرنا بالکل اُن ہی پر منحصر ہے"

پُرانی دنیا میں عورتیں مردوں کی تابع تھیں لیکن انڈین لوگوں میں عورتیں کنبے کی اور بعض قبیلے تک کی سردار ہوا کرتی تھیں۔ پُشکن نے، جو ایک روسی مصنف ہے ایک کہانی لکھی ہے جس میں لکھا ہے کہ کس طرح ایک امریکی جان ٹیز انڈین قبائل میں جا کر گھل مل گیا تھا اور پھر اُسے ایک عورت نے جس کا نام نیٹ نوکوا تھا، جو اٹاوہ قبیلے کی سردار تھی، گود لے لیا تھا۔ اس کی کشتی میں ایک خاص جھنڈا لگا رہتا تھا اور جب نیٹ نوکوا کسی انگریزی بندرگاہ پہ پہنچتی تھی تو توپوں سے اس کو سلامی دی جاتی تھی۔ انڈین قوم کے علاوہ سفید قوموں میں بھی اس کی بڑی عزت و حرمت تھی۔

اب ایسی صورت میں اگر لوگ اپنی نسل اور نسب ماں کی طرف سے لگایا کرتے تھے تو تعجب ہی کیا۔ یورپ میں بچے اپنے باپ کا نام لیتے تھے اور یہاں اپنی ماں کے قبیلے کا نام لیتے تھے اگر باپ کے قبیلے کا نام "ہرن" اور ماں کے قبیلے کا نام "ریچھ" ہوتا تھا تو بچے ریچھ قبیلے کے کہلاتے تھے۔ ہر قبیلہ عورتوں، اُن کے بچوں، نواسیوں اور پرنواسیوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔

یورپ کے لوگ اس بات کو قطعی سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ انڈین قوم کو وحشی اور ان کے رسوم کو وحشیانہ پن سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ تیر اور کمان کے دور میں، پہلی ڈونگیوں اور پہلے کدالوں کے زمانہ میں، اُن کی خود بھی یہی حالت تھی۔

امریکہ کے متعلق اپنی یادداشتوں میں، شروع شروع کے فاتحوں نے قبیلے کے سرداروں سے بادشاہ اور شہزادے اور اُمرا تصور کیا ہے۔ اُن کے خیال میں "سردار" ایک لقب ہے اور ان کے قبیلے کے نشان کو اُن کا عَلم یا پھریرا سمجھا۔ انہوں نے سرداروں کی پنچایت کو "سینیٹ" تصور کیا اور سب سے بڑے سردار کو بادشاہ، جیسے ہم آجکل کسی فوجی افسر کو بادشاہ سمجھنے لگیں۔ کئی سو سال تک امریکہ کے سفید فام باشندے وہاں کی اصل آبادی کے طور طریقوں کو سمجھ نہ سکے اور یہی حال اس وقت تک رہا جب علم الانسان کے ایک ماہر نے جس کا نام مورگن تھا اپنی کتاب "قدیم سماج" میں گویا امریکہ کو پھر نئے سرے سے دریافت کیا۔ مورگن وہ شخص تھا جس نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ ازدکس اور آزٹکس کی قبیلی تنظیم ایک ایسا دور ہے جو یورپ میں بہت پہلے گذر چکا ہے۔ لیکن مورگن نے اپنی کتاب ۱۸۷۷ء میں لکھی اور ہم امریکہ کے اولین فاتحوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

الغرض نہ سفید فام انسانوں نے انڈین لوگوں کو سمجھا اور نہ انڈین لوگوں نے سفید فاموں کو۔ انڈین لوگوں کی سمجھ میں یہ آتا ہی نہ تھا کہ یہ سفید فام لوگ، ایک مٹھی سونے کے لئے، ایک دوسرے کے ٹکڑے کیوں کئے ڈالتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ سفید فام امریکہ آئے ہی کیوں اور کسی دوسرے ملک کو فتح کرنے کا مطلب کیا ہے۔

قدیم لوگوں کے عقائد کے مطابق زمین پورے قبیلے کی ہوا کرتی تھی، اور ہر قبیلے کی روحیں ہوتی تھیں جو اُس کی حفاظت کرتی تھیں۔ اگر کوئی کسی دوسرے کی زمین پر زبردستی چھین لے تو اُس دوسرے قبیلے یا جماعت کے خداؤں کا غضب اُس کے سر پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ یہ لوگ لڑتے ضرور تھے لیکن جب کسی آس پاس کے قبیلے پر فتح حاصل کرتے تو نہ تو اُن کو غلام بناتے، نہ اپنے طور طریقے اُن پر زبردستی

عائد کرتے اور نہ ہی ان کے سردار کو نکالتے بلکہ مفتوح قبیلے کو ایک خاص رقم تاوان دے کر اپنے سردار کو چھڑانا ہوتا تھا۔ کسی سردار کو صرف اُس کا اپنا کنبہ یا قبیلہ ہی چھڑا سکتا تھا۔

چنانچہ ان دو دنیاؤں میں، اور زندگی کی دو تنظیموں میں ٹکر ہو گئی اور تکبیر فتح ہونے کی داستان، دو دنیاؤں کی باہمی جنگ کا قصہ ہے۔ اس قسم کی جدوجہد کی ایک بہت اچھی مثال ہسپانیوں کے ہاتھوں میکسیکو کا فتح ہونا بھی ہے

غلطیوں کی ایک زنجیر

۱۵۱۹ء میں میکسیکو کے کنارے جہازوں کا ایک دستہ نظر آیا جس میں تین بادبانوں والے گیارہ جہاز تھے۔ بادبانوں میں ہوا بھرنے سے ایسا لگتا تھا کہ جہازوں کے پیٹ چاروں طرف سے پھول کر کپا ہو رہے ہیں، پانی پر اُن کی چوٹیاں اور مستول اونچے دکھائی دے رہے تھے۔ مربع کھڑکیوں میں سے توپ کے دہانے دکھائی دے رہے تھے۔ فوجی بندوقیں اور سنگینیں جہاز کے عرشہ پر جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔

پھر بڑے والے جہاز کے اگلے حصے پر ایک ریش دار آدمی کھڑا تھا جس کے کندھے چوڑے تھے اور وہ اپنی ٹوپی کو آنکھوں پر جھکائے ہوئے تھا اس کی تیز تیز نگاہیں قریب ہوتے ہوئے ساحل اور نیم برہنہ انڈین لوگوں کے غول کا، جو کنارے پہ جمع ہو گئے تھے، جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر بڑے والے جہاز پر کھڑے ہوئے اس آدمی کا نام ہرنانڈو کورٹز تھا اور وہ اُس مہم کا رہنما اور سردار تھا جو میکسیکو فتح کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے جیب میں ایک فرمان تھا جس کی رُو سے ہسپانوی حکومت نے اُسے سرداری اور سپہ سالاری

علیحدہ کر دیا تھا مگر کورٹز ایسے منچلے سیاح کے لئے یہ موقوفی کیا حقیقت رکھتی تھی اُس کے اور ہسپانیہ کے درمیان پانی کا ایک لامتناہی فاصلہ تھا، اور یہاں، اِن جہازوں کی دنیا میں وہ اپنے تئیں شہنشاہ محسوس کر رہا تھا

آخر جہازوں نے لنگر ڈالے۔ کورٹز نے راستے میں مختلف ساحلوں سے جو انڈین پکڑ کر غلام بنائے تھے، انہوں نے بھاری توپ، بندوقوں کے تھیلے اور سنگینوں کے گٹھے اُتار اُتار کر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں لادنے شروع کئے۔ پھر انہوں نے خوف سے بدکتے ہوئے گھوڑوں کو اُتار کر کشتیوں پر سوار کیا۔ ان کو کشتیوں سے اُتار کر کنارے پر لانا بھی ایک امرِ عظیم تھا۔

انڈین لوگ حیرت سے مُنہ کھولے اُن بہتے ہوئے گھروں اور اُن سفید چمڑے والے لوگوں کو دیکھ رہے تھے جو سَر سے پاؤں تک کپڑے پہنے ہوئے تھے اور انوکھے اسلحات لئے ہوئے تھے لیکن ان کو سب سے زیادہ تعجب اِن ہنہناتے ہوئے دیو ہیکل جانوروں کو دیکھ کر ہُوا جن کے ایال اور دُمیں ہوا میں اُٹھی ہوئی پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ انہوں نے پہلے کبھی ایسے مہیب جانور نہ دیکھے تھے۔ سفید فام لوگوں کے آنے کی خبر آناً فاناً کنارے سے لے کر اندر بستیوں اور پہاڑوں تک پہنچ گئی۔ بستی کے اندر ہی اندر، پہاڑوں کی دیوار سے گھری ہوئی ایک وادی میں ازٹک قبیلے کے لوگ اپنے پانی میں بنے ہوئے شہروں میں رہتے تھے۔ اُن شہروں میں تنوچٹلن کا شہر سب سے بڑا تھا۔ وہ ایک جھیل کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور پُلوں کے ذریعہ کنارے سے متعلق تھا اس کے گھروں کی سفید چمکتی ہوئی دیواریں اور اس کے مندروں کی طلائی چھتیں دُور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ اِن میں سے سب سے بڑے گھر میں ازٹک قبیلے کا فوجی سردار مونٹی زوما، اپنے کنبے سمیت رہتا تھا۔

جب مونٹی زوما نے اِن سفید فاموں کی آمد کی خبر سُنی تو اُس نے سرداروں

کی ایک میٹنگ کی انہوں نے دیر تک اِس مسئلہ پر سوچ بچار کیا کہ اب کیا کیا جائے سب سے اہم بات یہ معلوم کرنا تھی کہ یہ سفید فام آئے کیوں اور کیا چاہتے ہیں ؟ دوسری جگہوں سے جو افواہیں اُن تک پہنچی تھیں اُن سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ سفید فام لوگ سونا بہت پسند کرتے ہیں۔ لہذا پوری مجلس نے یہ طے کیا کہ ان کو سونے کے بہت سے قیمتی تحائف دے دیے جائیں اور درخواست کی جائے کہ اپنے ملک کو واپس چلے جائیں۔

یہ ایک ایسی غلطی تھی جس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ سونا دیکھ کر تو سفید فاموں کی لالچ اور بڑھتی تھی لیکن ازتکوں کو یہ خیال کیسے آسکتا تھا وہ اور ہی دَور میں رہ رہے تھے، سفید فام اور ہی دَور میں۔

قاصد اپنے راستے پر روانہ کیے گئے۔ ان کے ساتھ سونے کے اتنے بڑے بڑے چکر تھے جیسے گاڑی کے پہیے۔ سونے کے زیورات تھے، انسانوں اور جانوروں کی مورتیں تھیں جو خالص سونے کی بنی ہوئی تھیں، مگر وہ اِس تمام خزانے کو زمین میں دفنا دیتے تو کتنی عقلمندی کرتے اور کیسا اچھا ہوتا!!

جب کورتز اور اس کے ساتھیوں نے اتنا بہت سا سونا دیکھا تو ازتکوں کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ قاصدوں نے بہتیری منت سماجت کی کہ وہ سمندر کے اُس پار چلے جائیں لیکن سب بے سود! انہوں نے اپنے بن بلائے مہمانوں کو پہاڑوں کی سخت زندگی اور خطرات سے آگاہ کر کے کتنا ہی ڈرایا مگر سب بے کار! اب تک تو ہسپانوی لوگوں نے میکسیکو کے سونے کے متعلق صرف سنا ہی تھا لیکن اب تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ ان کے مُنہ میں پانی بھر آیا، آنکھیں سونے سے چمکنے لگیں۔ وہ داستانیں آخر صحیح نکلیں۔ قاصدوں اور ایلچیوں کی درخواست ان کے لیے مضحکہ خیز تھی۔ بھلا جب سونا ان کے اتنے نزدیک تھا تو

وہ سمندر پار چلے جاتے! یہ تو بالکل پاگل پن ہوتا! انہوں نے راستے میں کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں، سوکھے ٹکڑے چبا چبا کر ان کے دانت دکھنے لگے تھے، گھٹے ہوئے تہہ خانوں میں سخت بچھانوں پر سو سو کر اُن کی کمریں دکھ گئی تھیں، جہاز کی موٹی موٹی رسیاں کھینچنے میں کس قدر محنت کرنی پڑی تھی، طوفان اور ہواؤں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور انہوں نے یہ سب تکلیفیں اُس دولت کے لئے جھیلی تھیں جس کا خواب وہ سوتے میں دیکھا کرتے تھے۔

کورٹز نے حکم دیا کہ ڈیرہ اُٹھایا جائے اور سب آگے روانہ ہوں۔ اس کے آدمیوں نے کھانے پینے کا سامان اور اسلحات غلاموں کی پیٹھ پر لادا۔ غلام جو بجائے انسان کے لدو جانور معلوم ہو رہے تھے، اپنے بوجھ کے نیچے کراہتے، ہانپتے کانپتے، گھسٹم گھسٹم چلے جا رہے تھے، اُن کو چلنا ہی پڑتا تھا، اگر کوئی پیچھے ٹھٹک جاتا تو ہسپانوی لوگ انہیں اپنی تلواریں چبھو کر اور اگر کوئی چلنے سے انکار کرتا تو اس کی کھوپڑی چکنا چور کر دیتے اُس زمانے کی ایک تصویر ابھی تک محفوظ ہے جس میں خود ازٹکوں نے اس مہم کی تصویر کھینچی ہے۔ اِس تصویر میں لوگ سر پر سامانوں کے بوجھے لادے تین سڑکوں پر برابر چلے جا رہے ہیں۔ ایک کی پیٹھ پر توپ کا پہیہ ہے، دوسرے کی پیٹھ پر بندوقوں کا گٹھر ہے اور تیسرے کی پیٹھ پر کھانے پینے کے سامان کا ایک بکس ہے۔ ایک ہسپانوی سپاہی ایک انڈین کے سر پر ڈنڈا تانے ہے۔ اُس نے اس انڈین کو بالوں سے پکڑ رکھا ہے اور لاتیں اور ٹھوکریں مارے جا رہا ہے۔ پاس ہی ایک چٹان پر صلیب کا نشان بنا ہے۔ یہ فاتح اپنے آپ کو ایماندار عیسائی سمجھتے تھے جبھی تو جب کبھی کسی ملک پر حملہ کرنے جاتے تھے تو صلیب کا نشان ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اس تصویر میں ادھر اُدھر زمین پر کٹے ہوئے سر اور ہاتھ وغیرہ بکھرے نظر آتے ہیں۔

تو اس طرح دھیرے دھیرے یہ ہسپانوی لوگ آگے بڑھتے گئے اور

آخر کار ایک پہاڑ کے درّہ میں سے انہوں نے جھیل کو اور اس پر بسے ہوئے شہروں کو دیکھا۔ ازٹکوں نے قطعی مدافعت نہیں کی "مہمان" شہر میں داخل ہو گئے اور پہلی ہی حرکت جو انہوں نے کی وہ نرمی اور محبت سے قطعی بعید تھی۔ انہوں نے اس شخص کو جسے وہ شہر کا بادشاہ سمجھے تھے گرفتار کر لیا یعنی مانٹی زوما کو۔ کارٹز کے حکم سے مانٹی زوما کو زنجیریں پہنا دی گئیں اور حکم دیا گیا کہ ہسپانوی بادشاہ کی اطاعت قبول کرے۔ قیدی نے فرمانبرداری کے ساتھ، جو کچھ وہ کہتے گئے، دوہرا دیا لیکن اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ "بادشاہ" سے اُن کا مطلب کیا تھا اور "قسم" کیا بلا ہوتی ہے

کورٹز نے سمجھا کہ چلو جیت ہو گئی میکسیکو کے قوم کے بادشاہ کو گرفتار کر لیا اور اس نے اپنی حکومت بھی ہسپانوی بادشاہ کے تحت میں دے دی۔ غرض یہ کہ سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

یہ تو کورٹز نے سوچا لیکن اُس نے اپنے میزبان کی رائے تو لی نہیں تھی اور وہ میکسیکو کے رسم و رواج سے اتنا ہی ناواقف تھا جتنا مونٹی زوما ہسپانوی رسم و رواج سے۔ اُس کے خیال میں مونٹی زوما بادشاہ تھا لیکن مونٹی زوما تو صرف فوجی سردار تھا اور اُسے قطعی یہ اختیار نہ تھا کہ اپنا ملک کسی اور کے حوالے کر دے۔

ازٹکوں نے ایک ایسی حرکت کی جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نیا سردار انتخاب کر لیا جو مونٹی زوما ہی کا بھائی تھا۔ نئے سردار نے قبیلے کے تمام جنگجوؤں کو اکٹھا کیا کہ اُس بڑے مکان پر حملہ کر دیں جس میں ہسپانوی ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہسپانیوں نے اپنی توپیں اور بندوقیں چھوڑنی شروع کر دیں۔ ازٹکوں نے پتھر پھینکے اور اپنی کمانیں کھینچ کر تیر چلانے لگے۔ شک نہیں کہ توپ کے گولے اور بندوق کی گولیاں پتھروں اور تیروں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں لیکن ازٹک اپنی آزادی

کے لئے لڑ رہے تھے اور ان کو کوئی چیز روک نہیں سکتی تھی اگر درجن بھر گرتے تو سو ان کی جگہ آ پہنچتے۔ بھائی اپنے بھائیوں کا اور قبیلے والے اپنے قبیلے کا بدلہ لینے کو سینہ سپر تھے۔

جب کورٹز نے دیکھا کہ معاملہ نازک ہے تو اُس نے ازٹکوں سے صلح کرنے کی سوچی۔ اُس نے سوچا کہ سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ مونٹی زوما کو بیچ میں ڈالا جائے کیونکہ وہ ان کا بادشاہ ہے۔ وہ ان کو حکم دے کہ ہتھیار ڈال دیں۔ انہوں نے مانٹی زوما کی زنجیریں کھول دیں اور اسے مکان کی چھت پر چڑھایا گیا۔ لوگ تو اُسے پہلے ہی بزدل اور غدار سمجھ بیٹھے تھے۔ ہر طرف سے صدائیں آنے لگیں "نکمے، بزدل! تو سپاہی نہیں ہے، عورت ہے، چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ، چرخا لے کر سوت کات، جا نہیں کتوں کی نیند میں رہ، بزدل" وغیرہ۔

مونٹی زوما بُری طرح زخمی ہو کر گر پڑا۔ کورٹز کے آدھے سپاہی مارے گئے اور وہ بھی بڑی مشکلوں سے، سر پہ پاؤں رکھ کے، محاصرین کی صفوں سے نکل کر بھاگا۔ خوش قسمتی سے ازٹکوں نے اُس کا پیچھا نہیں کیا ورنہ جان بھی سلامت نہ بچتی لیکن اس طرح کورٹز کو نکل جانے دینا ازٹکوں کی دوسری اور بہت بڑی غلطی تھی۔ اُس نے ایک اور فوج جمع کی اور واپس آ کر پھر شہر تنوچٹلن کا محاصرہ کیا۔ چند مہینے تک تو ازٹک مدافعت کرتے رہے لیکن توپوں اور بندوقوں کے آگے بھلا تیر اور کمان کب تک چلتے۔ تنوچٹلن فتح کر کے برباد کر دیا گیا۔ لوہے کے دور والوں نے کانسی کے دور والوں پر فتح پائی۔ اِک نئے نظام کے تحت میں قبیلوں کے نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ کورٹز کی طرف سے تاریخ خود لڑ رہی تھی۔ اب پہاڑوں کے اُن آزاد سپاہیوں کی نسل کے لوگ اپنے وطن کو فتح کرنے والوں کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔

چھٹا باب

زندہ اوزار

جادُو کے جوتے

پچھلی صدی کے ایک مصنف نے اپنی ایک کہانی میں ہمیں یہ قصہ سنایا ہے کہ ایک تھا آدمی اور وہ جو جوتے خریدنے گیا تو معمولی جوتوں کے بجائے جادو کے جُوتے لے آیا جس کو پہن کر ایک قدم میں کئی میل جا سکتے ہیں۔ اب وہ آدمی جو تھا وہ ذرا کھویا کھویا سا رہا کرتا تھا اور اُسے فوراً اپنی یہ غلطی معلوم نہ ہو سکی وہ گھر سے نکلا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا بازار چل دیا کہ یکایک اُسے بڑے زور کی سردی لگنے لگی۔ اب گھوم کر جو دیکھتا ہے تو چاروں طرف برف ہی برف اور افق پر ایک مدہم سا سُرخ سورج نظر آ رہا ہے! تو معلوم ہُوا آپ کو! اُن حضرت کو پتہ بھی نہ چلا اور وہ جو جادو کے جُوتے تھے وہ انہیں لے کر قطب شمالی پہنچ گئے!! اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنی اِس خوش نصیبی سے کیا کچھ فائدہ نہ اُٹھاتا لیکن اِس کہانی کے ہیرو کو روپیہ کی تو قطعی پرواہ نہ تھی۔ اس کو تو بس سائنس سے دلچسپی تھی بے حد، چنانچہ اُس نے یہ طے کیا کہ اپنی اِس خوش بختی کے صدقے سے وہ تمام دُنیا کی سیر کرے گا اور پوری دُنیا کا اچھی طرح مطالعہ کرے گا چنانچہ جناب اُس نے اپنے وہ جادُو کے جوتے ڈاٹ لئے اور چلا دُنیا کی سیر کو ــــــ اُتر سے دکھن، دکھن سے اُتر! اور سائبیریا کے برفیلے میدانوں میں سردی زیادہ لگتی تو بھاگ کر افریقہ کے صحراؤں کو چل دیتا، رات ہوتی

تو دُنیا کے پوربی حصے سے پچھمی کو بھاگ جانا غرض کیا بیان کریں ایک پھٹا پرانا سا کالا کوٹ پہنے، بغل میں چندے کا بکس دبائے، کبھی آسٹریلیا سے ایشیا، کبھی ایشیا سے امریکہ۔ راستہ میں جو جزیرے پڑتے ان پر پاؤں رکھ رکھ کر تو پھلانگتا تھا بیچارہ۔ پہاڑوں کی کبھی اس چوٹی پر پاؤں رکھتا کبھی اس پر کبھی کسی آگ اگلتے ہوئے جوالا مکھی کو پھلانگتا تو کبھی برفانی چوٹیوں کو جگہ جگہ کی گھاس اس نے جمع کی، دھات اس نے سمیٹی پرانے مندروں اور غاروں میں وہ گھسا۔ غرض کہ تمام دُنیا اور اس کی چیزوں کو اچھی طرح گھنگھول ڈالا۔

ناظرین! انسان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم کو بھی ایسے ہی جادو کے جوتے پہننے پڑے تھے۔ اس کتاب کے صفحوں پر ہم ایک خطے سے دوسرے خطے، ایک دور سے دوسرے پر برابر پھلانگتے رہے۔ کبھی کبھی فاصلے اور وقت کی وسعت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ ہمارا سر چکرانے لگتا تھا مگر ہم کہیں نہیں رُکے۔ ان لوگوں کی طرح جو معمولی جوتے پہنے ہوتے ہیں، ہم جگہ جگہ رک کر تفصیل کے ساتھ مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ ویسے تو ہم کو ایک صدی پھلانگتے وقت دو چار چیزوں پر نظر ضرور ڈالنی ہی تھی لیکن اگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے یہ جادو کے جوتے اتار، معمولی طور پر ایک قدم بھی بڑھاتے تو تفصیل کے ڈھیر میں ایسا اُلجھتے کہ نکلنا دشوار ہو جاتا۔ اگر آپ جنگل کے ایک ایک پیڑ کو دیکھنے لگیں تو خطرہ ہے کہ آپ خود جنگل کو نہ دیکھ سکیں گے۔ اِن جادو کے جوتوں کو پہن کر ہم نہ صرف ایک دور سے دوسرے دور میں چلے گئے بلکہ ایک سائنس اور ایک علم سے دوسری سائنس اور دوسرے علم پر بھی پہنچ سکے۔ ہم پودوں اور جانوروں کے علم سے، زبانوں کے علم تک پہنچے، وہاں سے اوزاروں کی تاریخ پر گئے، وہاں سے مذہب کی تاریخ کو پکڑا، اور وہاں سے مختلف قوموں کی تاریخ تک ہماری رسائی ہوئی

ظاہر ہے کہ معمولاً یہ کوئی آسان بات نہ تھی لیکن ہمارے لئے سوائے اِس کے

کوئی چارہ نہ تھا۔ تمام علوم انسان نے پیدا کئے ہیں اور انسان کے لئے پیدا کئے ہیں اور جب ہم صرف کسی ننھے مُنے پھول کی پنکھڑیوں یا کانسہ کے دَور کی مختلف قسم کی کلہاڑیوں ہی کے متعلق بات نہیں کرتے بلکہ انسان اور دُنیا اُس کے مقام اور رتبہ کی بات بھی کرتے ہیں، تو یہ تمام علوم اشد ضروری ہیں۔ ہم ابھی کورٹز کے زمانے میں امریکہ جا چکے ہیں آیئے اب اپنے ہی زمانے کے دَور کی تیسری چوتھی صدی کے یورپ کی سیر کریں۔ وہاں ہمیں وہی قبیلوں والا نظام ملے گا جو لدو قبیول اور ازٹکوں کے زمانے میں تھا۔ ہمیں ویسے "بڑے گھرانے" مشترک ملیں گے جن میں عورتوں کی حکومت ہے۔ سب لوگ گھر میں عورت ہی کے دست نگر ہیں کیونکہ وہ کنبہ کی سردار بھی ہے اور گھر کی بزرگ اور سنبھالنے والی بھی ہے۔ وہ جاڑے دن بھر ذخیرے کی دیکھ بھال کرتی ہے، اناج لاکر کھلیانوں میں بھرتی ہے اور بیج بونے کے لئے زمین تیار کرتی ہے۔ وہ مرد سے زیادہ کام کرتی ہے اور اسی لئے اُس کو زیادہ معزز خیال کیا جاتا ہے ان دنوں آپ کو ہر گاؤں میں، ہر گھر میں، عورت کا ماں کا ایک مجسمہ ملتا تھا جو ہڈی کا پتھر سے تراش کر بنایا جاتا تھا۔ یہ گویا وہ سب سے پہلی ماں تھی جس کا کل قبیلہ اولاد تھا۔ اس کی روح گھر کی حفاظت کرتی تھی وہ اُس کے سامنے دعائیں مانگتے تھے کہ انہیں رزق عطا کرے اور ان کے گھروں کو دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ کچھ عرصے بعد گھر کی یہ ماں محافظ بن گئی اور دیوی کی شکل میں، ہاتھ میں نیزہ لئے، شہر کی حفاظت کے لئے بناکر کھڑی کی گئی۔ اب اُس کا مجسمہ چھوٹا سا نہیں تھا اور آج تک بھی شہر ایتھنس کے، جو اس کے نام پر رکھا گیا تھا، دروازے پر اُس کا ایک عظیم الشان مجسمہ کھڑا شہر کی حفاظت کر رہا ہے۔

پُرانے نظام میں دراڑ پڑ گئی

ہماری زبان میں اب بھی قبیلے والے نظام کے کچھ باقیات موجود ہیں لیکن ہم

ان کے اصل مطلب کو بھول چکے ہیں۔ لوگ آپس میں باتیں کرتے وقت ایک دوسرے کو دوست کے عیوض بھائی کہتے ہیں اور کسی اجنبی بچے سے بات کرتے وقت ہم اسے بیٹا کہتے ہیں۔ جرمن زبان میں لفظ nephew کے معنی ہیں بہن کے بچے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبیلے کے زمانے میں بہن کے بچے اپنے رشتہ دار سمجھے جاتے تھے اسی قبیلے میں رہتے تھے اور بھائی کے بچے دوسرے قبیلے یعنی بھاوج کے قبیلے کے سمجھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم اب بھی اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں تو یہ قبیلوں کا نظام کتنا کچھ زبردست نہ رہا ہوگا تو پھر یہ ختم کیسے ہوا ؟

امریکہ میں یورپ کے لوگوں کے آنے کی وجہ سے یہ نظام ٹوٹا اور یورپ میں، امریکہ دریافت ہونے سے ہزار ہا سال پیشتر، یہ نظام خود بخود ختم ہوگیا جیسے اُسے دیمک لگ گئی ہو اور اس کا خاتمہ ایسے ہوا کہ دھیرے دھیرے مردوں نے گھر کا بار اپنے کندھوں پر لے لیا قدیم زمانے میں عورتیں کھیت کھودنے وغیرہ کا کام کرتی تھیں اور مرد مویشی چرایا کرتے تھے۔ جب مویشیوں کی تعداد کم تھی تو عورت کا کام، کھیتی باڑی ہی سب سے اہم کام تھا۔ وہ لوگ گوشت کبھی کبھی کھاتے تھے اور دودھ بھی سب کے لئے کافی نہیں ہو سکتا تھا اگر عورتیں کھیتی کرکے اناج جمع نہ کرتیں تو گھر میں کھانے کو بھی نہ ملتا۔ اس زمانہ میں کھانے کے وقت یا تو مٹھی بھر اناج ہوتا تھا یا ایک بڑی سی روٹی اور بس! اس کے ساتھ وہ لوگ جنگلی شہد اور پھل بھی ملا لیا کرتے تھے جو عورتیں جمع کرکے لایا کرتی تھیں۔ چونکہ عورتیں گھر کی مالک ہوا کرتی تھیں اس لئے ہر بات کی ذمہ دار بھی وہی تھیں لیکن ایسا ہمیشہ اور ہر جگہ نہیں ہوا کرتا تھا سخت میدانوں پر اناج اچھی طرح نہیں ہوتا تھا اور گیاہستانوں میں لمبی گھاس، اناج کے پودوں پر چھا جاتی تھی۔ گھاس کی سخت جڑیں زمین میں گہری دھنسی ہوئی تھیں اور جب لوگ انہیں اکھیڑنے کی کوشش کرتے تو معلوم ہوتا کہ بھربھری مٹی کے بجائے وہ ایسی

مٹی ہے۔ اب اس میں کھیتی کیسے ہو؟

دو دو تین تین عورتیں ایک ایک کدال کو لپٹ جاتیں مگر پھر بھی سطح ہی کھرچ کر رہ جاتی۔ پھر ان نالیوں میں جو اناج ڈالے جاتے انہیں دھوپ سُکھا دیتی یا چڑیاں چُگ جاتیں۔ اگر اناج اُگتا بھی تو خال خال اور وہ بھی بالکل مُردہ! کبھی اناج خشک ہو جاتا، گھاس ویسی کی ویسی ہی کھڑی رہ جاتی۔ فصل کٹنے کا وقت آتا تو کاٹیں کیا؟ گھاس پھوس میں اناج کی بالیں دکھائی ہی کب دیتی تھیں۔ ہاں گیاہستان کی جنگلی گھاس البتہ ہوا میں جھومتی رہتی تھی جیسے کوئی مخالف سپاہ دشمن کو بھگا کر پھر واپس آ گئی ہو۔ اناج کی جگہ جنگلی گھاس! تو پھر اتنی محنت سے کیا فائدہ۔ اسی لئے تو محنت نہیں کی گئی تھی!

لیکن مویشیوں کے لئے جنگلی گھاس وہی حکم رکھتی تھی جو اناج انسان کے لئے۔ گیاہستانوں میں مویشی اور بھیڑیں وغیرہ بڑے مزے میں رہتے تھے۔ ہر جگہ خوب چراگاہیں ملتی تھیں اور ہر سال ریوڑ بڑھتا جاتا تھا۔ مرد کمر میں چھری کھونسے ریوڑ کے پیچھے پیچھے ہوتا تھا۔ گڈریوں کا وفادار دوست کتا، اس کو بھیڑوں کی رکھوالی میں مدد دیا کرتا تھا کہ گیاہستانوں میں اِدھر اُدھر بھٹک نہ جائیں۔ جیسے جیسے ریوڑ بڑھتا جاتا تھا زیادہ دودھ، مکھن اور اُون حاصل ہوتا تھا۔ گھر میں اناج کی کمی ضرور ہوتی تھی لیکن بھیڑ کی پنیر خوب ہوتی تھی اور بکری کا لذیذ گوشت ہنڈیوں میں اُبلتا رہتا تھا۔

مرد کا کام مویشی پالنا، اب میدانی علاقوں میں سب سے اہم کام تھا۔ سوئٹزرلینڈ میں ایک چٹان پر ایک بہت قدیم تصویر کھینچی ہوئی جس میں ایک ہلواہا دکھایا گیا ہے جو ہل چلا رہا ہے۔ یہ تصویر کچھ ایسی ہے جیسے بچے آدمی کی تصویر بناتے ہیں ٹیڑھی میڑھی بھدی سی لیکن ہم کو اس سے مطلب نہیں کہ یہ تصویر اچھی کھینچی ہے کہ نہیں کیونکہ ہمارے لئے تو یہ تصویر کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک ثبوت ہے، ایک گواہی ہے اور وہ اپنا

یہ مقصد بخوبی پورا کر دیتی ہے۔ اِس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہلوا ہا ایک لکڑی کے ہل کے پیچھے چلا جا رہا ہے اور اِس ہل کو دو بیل کھینچ رہے ہیں۔

بنی نوع انسان کی تاریخ میں یہ پہلا ہل ہے اور یہ بہت کچھ کھرپی سے ملتا جلتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس میں ایک لمبا سا بانس بھی لگا ہوا ہے جیسے گاڑی کے پہیے کا دُھرا اور اس ہل کو انسان نہیں بلکہ بیل کھینچ رہے ہیں۔

تو گویا انسان نے پہلی موٹر دریافت کرلی! کیونکہ ہل میں جُتا ہوا بیل ایک زندہ موٹر ہے۔ ہمارے موجودہ دھات اور بجلی کے ٹریکٹر کا زندہ جد امجد! جب انسان نے بیل کی گردن پر جُوا رکھا تو اُس نے اپنے کام کا بار بھی بیل کے کندھے پر ڈال دیا۔ مویشی جو پہلے انسان کو صرف اپنا گوشت، دودھ اور چمڑا دیا کرتے تھے، اب اپنی محنت کی طاقت بھی دینے لگے۔

بیل اپنی گردنوں پر جوا رکھے کھیتوں کو جانے لگے، اور ہل کو اپنے پیچھے پیچھے کھینچے جانے لگے۔ ہل زمین میں، کھرپی سے کہیں زیادہ گہرا دھنسنے لگا۔ جوتی ہوئی زمین ایسی دکھائی دینے لگی جیسے کوئی سیاہ لمبا سا فیتہ!

یہ ہلوا ہا اپنی پوری طاقت سے ہل کے ہتھوں کو دبائے رکھتا تھا اور پھر وہ بیل کو اپنے کام پر ہانک دیتا تھا۔ بیل سے ہی وہ جُتائی کرتا تھا اور اناج کو گاہتا تھا اور پھر لادا کرلاتا تھا۔ گاہنے کے وقت بیل کو گاہنے کی جگہ چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کے پاؤں سے کچل کچل کر تمام اناج بالوں میں سے نکل آتا تھا۔ پھر وہ اُسے ایک بھاری بغیر پہیوں والی گاڑی میں جوت دیتا تھا اور کھیتوں سے اناج کے بورے لالا کر گھر میں ڈالتا تھا۔

مویشی پالنے سے کھیتی باڑی میں بھی ترقی ہوئی۔ گڈریا مرد اب کھیتی کرنے والا بھی بن گیا تھا اور اِس سے اُسے گھر میں اور بھی اقتدار حاصل ہوا بے شک ابھی تک

عورت کے لئے بھی گھر میں کام کی بہتات تھی۔ اُسے کاتنا اور بُننا پڑتا تھا، فصل کاٹنی پڑتی تھی، بچوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی لیکن اب وہ پہلے کی طرح گھر کی حاکم اور سردار نہ رہی تھی۔ اب گھر اور کھیت دونوں جگہوں میں اوّل مقام مرد کو حاصل ہو چکا تھا۔ اب گھر میں مردوں پر ڈانٹ نہیں پڑتی تھی بلکہ اُلٹا وہی ڈانٹنے لگے تھے۔ اب وہ مدافعت کرنے والوں کی بجائے حملہ آور بن چکے تھے۔ پہلے ساسوں یا خالاؤں یا نانیوں کے لئے کسی مرد کو گھر سے نکال باہر کر دینا کوئی بات نہ تھی لیکن اب تو وہ اُس کی خوشامد کیا کرتی تھیں کیونکہ باہری قبیلے کا آیا ہُوا یہ مرد گھر بھر کے لئے محنت کرتا اور انہیں کھلاتا تھا چنانچہ قبیلے اپنے اپنے مردوں کو عزیز رکھنے لگے اور ان کو باہر بھیجنے سے کترانے لگے اور اس طرح پُرانے نظام کا شیرازہ بکھرنے لگا جیسے کسی سوسال پُرانے شاہ بلوط کو گھن لگ جائے۔ لوگوں نے پُرانی رسمیں زیادہ توڑنی شروع کر دیں۔ پہلے بیوی اپنے میاں کو اپنے گھر لے آتی تھی لیکن اب میاں اپنی بیوی کو اپنے گھر لانے لگا۔ یہ پُرانی رسم کی خلاف ورزی تھی لہٰذا ایسے کرنے والے مرد کو ڈاکو کے برابر سمجھا جانے لگا اب دولھا اپنی دلہن کو یوں ہی ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا بلکہ اُسے چُرا کر لانا پڑتا تھا، دھوکے سے اور زبردستی حاصل کرنا پڑتا تھا۔

رات کے اندھیرے میں دولھا اور اس کے رشتہ دار تیروں اور خنجروں سے مسلح ہو کر، دبے پاؤں چپکے سے دلہن کے گھر کی طرف جاتے، دلہن کا انتخاب دولھا والے پہلے ہی سے کر لیتے تھے، کتوں کے بھونکنے سے گھر کے سب لوگ جاگ پڑتے۔ قبیلے کے تمام لوگ، سفید مو داداؤں سے لے کر دلہن کے کمسن بھائیوں تک جن کی ہنوز داڑھی مونچھ بھی نہ نکلی تھی، سب اپنے اسلحات سنبھال لیتے، مردوں کی غیظ و غضب بھری آوازیں عورتوں کے رونے پیٹنے میں ڈوب جاتیں، لیکن آخر کار، کامیاب ہو کر دولھا میاں اپنی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی دلہن کو دبوچے، اپنے قبیلے کی حفاظت میں اپنے گھر واپس آجاتے۔

اس طرح سالہا سال گذر گئے، پہلے جو بات رسم کی خلاف ورزی تھی اب وہ بجائے خود رسم بن گئی۔ دولہا والوں اور دلہن والوں کی آپس کی لڑائی ایک ریت بن کر رہ گئی۔ اب خونریز لڑائیوں کے بجائے تحفے تحائف بانٹے جانے لگے۔ دلہن کی ماں بہنوں کا رونا پیٹنا اب ان شادیوں کا ایک جزو بن گیا ہے جو دعوت اور خاطر مدارات پر ختم ہوتی ہیں وہ پرانے درد بھرے گیت، جن میں دلہن اپنی قسمت کا گلہ کرتی ہے کہ اُسے دوسرے قبیلے میں جانا پڑا، اب بھی گائے جاتے ہیں اور واقعی اُس غریب دلہن کی قسمت بھی ایسی ہی ہو گئی تھی کہ اُس پر کسی کو رشک نہ آئے۔ اپنے گھر میں عورت اب مرد کی کنیز اور محکوم تھی۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ ہمدردی کی توقع رکھ سکتی کیونکہ ساس، سُسر اور شوہر کے دوسرے رشتہ دار سب شوہر ہی کی طرفداری کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں دلہن کی حیثیت گھر میں ایک زائد نوکرانی اور خادمہ کی سی تھی اور سب اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ حرام کے ٹکڑے نہ توڑے اور اِدھر اُدھر نالتو نہ بیٹھی رہے مادرانہ نظام اب پدرانہ نظام میں تبدیل ہو چکا تھا۔

بچے اپنی ماؤں کے نہیں بلکہ باپوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اب نسل کا حساب بھی ماں کے بجائے باپ کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ اپنے ذاتی اور اپنے قبیلے کے نام کے علاوہ اب ہر شخص کے نام کے ساتھ ایک اور دُم چھلا لگا رہتا تھا "ابن فلاں" اس وقت کی ایک رسم اب تک چلی آتی ہے کہ لوگوں کو اپنے باپ کے نام سے پکارا جاتا ہے مثلاً "پیٹر رابرٹ سن"، یا جیسے پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا "پیٹر ابن رابرٹ" کوئی شخص اب کسی کو اس کی ماں کے نام سے مثلاً "پیٹر ہیلن سن" نہ کہے گا۔

پہلے خانہ بدوش

انسان نے جو طلسمی گودام دریافت کیا تھا وہ بہ اس کے لیے ہر وقت کھانے

پینے کی چیزیں فراہم کرتا رہتا تھا۔ میدانوں اور گیاہستانوں میں ہزاروں بھیڑیں چرتی پھرتی تھیں، کھیتوں میں ہل چلانے والے اپنے بیلوں کو چیخ چیخ کر ہانکتے اور زرخیز سیاہ مٹی میں ان کو برابر چلاتے رہتے تھے۔ سرسبز وادیوں میں پہلے باغات اور انگوروں کے باغ پھول لا لا کر پھل دے رہے تھے۔ شام کے وقت انجیر کے درختوں کے نیچے لوگ جمع ہو کر جشن منایا کرتے تھے۔

کام کرنے سے انسان کو برابر زیادہ غذا حاصل ہوتی رہی لیکن اسی مناسبت سے اس کو کام بھی زیادہ کرنا پڑتا تھا۔ انگور کے ہر خوشے گیہوں کی ہر بال میں انسان کا پسینہ ایسا رسا ہوا تھا۔ جیسے رگوں میں خون۔

مثلاً انگوروں ہی کو لیجئے ان میں کتنی محنت کرنی پڑتی تھی۔ بھاری بھاری خوشے توڑ کر لائے جاتے تھے، پھر ان کو ایک پتھر کی چکی میں ڈال کر دبایا جاتا تھا۔ سرخ خون ایسا رس ٹپک ٹپک کر ایک بکری کے چمڑے کی بنی ہوئی بڑی سی کپی میں جمع ہوتا تھا۔ لوگ شراب کی تعریف میں گیت گاتے تھے، ان گیتوں میں یہ بیان کیا جاتا تھا کہ شراب ایک حسین دیوتا ہے، بکری کے چمڑے کا لباس پہنتا ہے اور اس نے شدید تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ دریا کی ترائیوں میں جہاں ہر برسات میں سیلاب آیا کرتا تھا وہاں کے اناج کو اس گاد سے بہت تقویت پہنچتی تھی جو دریا کے بہاؤ کے ساتھ آجاتا تھا۔ گویا اس جگہ قدرت خود انسان کی فصل کی حفاظت کیا کرتی تھی لیکن یہاں بھی کسان کے ہاتھوں کے لئے آرام کہاں؟ کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لئے وہ نہریں کھودتا تھا اور جہاں پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی وہاں پانی لے جانے کے لئے سینڈ بنا بنا کر نالیاں بناتا تھا۔

لوگ دریا کے آگے دعائیں مانگتے کہ ان کی زمینوں کو زرخیزی عطا کرے انہیں یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ ان کے اپنے ہاتھوں کی محنت کے بغیر دریا زمین

پر، گھاس پھونس کے سوا کچھ نہ اُگا سکتا تھا۔

کسان کا کام دن بدن مشکل ہوتا جاتا تھا مگر گڈریے کا وقت بھی کچھ آسانی سے نہ کٹتا تھا۔ سرسبز اور زرخیز گیاہستانوں میں ریوڑ زمانے کی ذرا سی بڑھ جایا کرتے تھے لیکن جتنا ہی ریوڑ بڑھتا تھا اتنا ہی کام بھی بڑھتا تھا۔ ایک دو درجن بھیڑوں کی رکھوالی کرنا اور بات ہے اور ہزاروں کی دیکھ بھال کرنا اور ہی بات ہے۔ پھر بڑے بڑے ریوڑ جلدی سے چراگاہوں کا صفایا کر دیتے تھے اور لوگوں کو ان کو دوسری چراگاہوں میں لیجانا پڑتا تھا۔ دُور دُور۔ گھر سے بہت ہی دُور۔

آخر کار ایسا ہُوا کہ پورے کا پورا گاؤں اپنا بوریا بستر باندھ لیتا اور ریوڑ کے پیچھے چل نکلتا۔ اپنے خیموں کو وہ اونٹوں پر لاد دیتے، اور اپنے گلوں ریوڑوں کو آگے آگے ہانکتے چلتے۔ بنجر میدان جن میں گھاس پھوس اُگا ہوتا تھا پیچھے چھوٹتے جاتے لیکن اب انہیں میدانوں کی اتنی فکر نہ تھی کیونکہ خشک میدان پر یوں بھی اناج کی پیداوار بہت کم ہوتی تھی۔

اس طرح پہلی مرتبہ نہ صرف انسانوں کے بلکہ قبائل کے درمیان تقسیم محنت کا سلسلہ شروع ہُوا۔ میدانوں میں رہنے والے گڈریے مویشی پالتے تھے اور ان کا تبادلہ اناج سے کرتے تھے۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ جگہ جگہ ایک چراگاہ سے دوسری اور دوسری سے تیسری کو پھرتے رہتے تھے ان خانہ بدوشوں کی زندگی آزادانہ وحشیانہ تھی۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے خیمے نصب کر لیتے تھے جہاں نہ درختوں کی روک ہوتی تھی نہ مکانوں کی آڑ۔ پورا میدانی علاقہ اُن کا گھر تھا۔ لمبے لمبے سفروں پر اونٹ کی ہلتی ہوئی پیٹھ، ان کے بچوں کے لئے پالنے کا کام دیتی تھی۔

زندہ اوزار

ان خانہ بدوش قبائل کی زندگی پُرسکون اور پرامن نہ تھی۔ جب وہ اپنے راستے میں کھیتوں یا ریوڑوں کو دیکھتے تو اکثر ایسی چیزیں لوٹ لیتے تھے جن پر ان کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ کاٹتے جو انہوں نے بویا نہ تھا۔ پہاڑی ڈھلوان راستوں سے دریاؤں کی ترائی میں اترتے وقت، یا میدانوں سے گذرتے ہوئے جنگلوں کے کنارے، وہ دیہات کو لوٹ لیتے، اُگتے ہوئے اناج کو روندڈالتے اور مویشیوں اور لوگوں کو اٹھالے جاتے۔ سب سے زیادہ انہیں آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی کہ اپنے ریوڑوں کو چرانے کے لئے رکھ سکیں۔ قبیلے میں کام کرنے والوں کی ہمیشہ کمی رہتی تھی اگر ایک آدمی کے دس بیٹے ہوں تب بھی کم پڑتے تھے۔ ریوڑ اور گلے اس تیزی سے بڑھتے تھے کہ ان کے لئے کبھی کافی تعداد میں گڈریے مہیا نہ ہو سکتے تھے لہذا ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو پکڑتا تھا اور غلام بنا ڈالتا تھا۔ یہ تو خانہ بدوش گڈریے قبیلوں کی حرکت تھی لیکن کھیتی کرنے والے بھی ان سے کم نہ تھے اور نہ ہی کوئی خاص پُرامن تھے۔ فصل کٹنے کے بعد وہ اپنے پڑوسیوں پر حملہ کرنے سے نہ چُوکتے تھے اور غلہ، کپڑا، زیورات، اسلحات جو کچھ اُن کے ذخیرہ میں ملتا لوٹ لیتے لیکن جس مالِ غنیمت کی یہ سب سے زیادہ قدر کرتے تھے وہ دوسرے قبیلے کے لوگ تھے کیونکہ کھیتی کرنے والوں کے یہاں بھی محنت کشوں کی کمی تھی، ان کو نہریں کھودنے، بینڈ باندھنے، ہل چلانے اور بیل ہانکنے کے لئے آدمیوں کی بہت ضرورت تھی۔

قدیم زمانے میں وہ اپنے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا کرتے تھے کیونکہ اس میں کوئی عقلمندی نہ تھی۔ اگر ایک آدمی زیادہ ہو جاتا تھا تو آمدنی کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی۔ وہ

کام تو بے شک کرتا تھا مگر جتنا پیدا کرتا اتنا ہی کھا بھی لیتا تھا لیکن جب قبیلوں کے پاس بڑے بڑے ریوڑ اور زرخیز کھیت ہونے لگے تو صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ ایک آدمی کی محنت سے اتنا غلّہ اور گوشت اور اون پیدا ہونے لگا جتنا اُس اکیلے پر ہرگز صرف نہ ہو سکتا تھا۔ اب ایک غلام کی محنت سے اتنا پیدا ہونے لگا کہ آقا بھی کھائے اور خود غلام بھی۔ صرف آقا کو اتنا خیال ضرور رکھنا پڑتا تھا کہ اُس کا غلام کام زیادہ کرے اور کھائے کم۔

تو اس طرح انسان نے ہم جنسوں کو اپنے لئے زندہ اوزار بنایا۔ انسان نے انسان کو ذلیل کیا، بیل کی طرح انسان کے کندھوں پر جُوا رکھا۔ قدرت کو زیر کرتے کرتے اور خود کو آزاد کرتے کرتے انسان اپنے ہم جنس انسان کا غلام بن گیا پہلے زمین اُن سب کی مشترکہ جائداد سمجھی جاتی تھی جو اُس پر کام کریں اور محنت لگائیں لیکن اب غلام ایک ایسی زمین پر محنت کر رہا تھا جس پر اُسے کوئی حق نہ پہنچتا تھا۔ جو بیل وہ ہانکتا تھا وہ اس کا نہ تھا جو فصل وہ کاٹتا تھا وہ اس کی نہ تھی۔

قدیم زمانے میں مصر کا ایک غلام بیلوں کو ہانکتے وقت یہ گیت گایا کرتا تھا۔

"بیلو! اناج کی بالوں کو کچلتے جاؤ (اناج نکالنے کے لئے)
اناج کی بالوں کو کچلتے جاؤ
کیونکہ اناج مالک کا ہے"

یادیں اور یادگاریں

ابھی تک ہمارا ماضی کا سفر مشکلات سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی ہم غاروں کے کھنڈروں میں کھوئے گئے تو کبھی کھدے ہوئے گڑھوں اور کھائیوں میں جا پڑے۔ جو چیز بھی ہمیں ملی وہ ایک معمہ تھی۔ جس کا حل ہمیں دریافت کرنا پڑا۔ سفر میں نہ ہمیں راستہ

بتلانے کے کوئی نشانات ملے نہ ایسے ستون یا کھمبے ہی ملے جن پر ہماری رہنمائی کے لئے کچھ لکھا یا کھدا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ پتھر کے دور کے لوگ ہمارے لئے کوئی لکھی ہوئی چیز کیسے چھوڑ سکتے تھے جبکہ ان کو لکھنا آتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آخر کار اب ہم ایک سڑک پر پہنچ گئے ہیں جس پر راستہ میں تمام نشانات لگے ہیں۔ مقبروں اور مندروں کی دیواروں پر ہمیں پہلے کتبے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ ان طلسماتی تصویروں کی طرح بالکل نہیں ہیں جو مختلف روحوں یا دیوتاؤں کے سلسلہ میں بنائی گئی تھیں۔ وہ تو تصویروں کے ذریعہ پوری کہانی کی کہانی ہے — ایسی کہانیاں جو عام لوگوں نے عام لوگوں کے لئے لکھی ہیں۔ پھر بھی وہ ہمارے حروف سے قطعی مشابہ نہیں ہیں۔ اگر "بیل" لکھنا ہوا ہے تو بیل کی تصویر کھینچی گئی "پیڑ" لکھنا ہو تو پیڑ معہ اپنی ڈالیوں وغیرہ کے موجود ہے۔ لکھنے کی تاریخ تصویروں والی لکھائی سے شروع ہوتی ہے۔ ان تصویروں کو باقاعدہ اشارات بنتے بنتے کافی عرصہ لگا۔

جب ہم اپنے ابجد کے الفاظ کو دیکھتے ہیں تو ہمارے لئے یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ حروف کن تصویروں سے آئے ہوں گے۔ اب بھلا یہ کون سمجھ سکتا ہے کہ انگریزی ابجد کا پہلا حرف "اے" کے معنی ہیں۔ بیل کا سر۔ لیکن اگر آپ حرف "اے" کو الٹ کر دیکھیں تو آپ کو ایک سر پر دو سینگ سے نظر آئیں گے۔ قدیم ساموں کے لفظ ابجد میں اس سینگوں والے سر کے معنی "اے" کے تھے جو "الف" کا پہلا حرف تھا اور اس لفظ کے معنی بیل کے تھے۔ اردو زبان کا بھی پہلا الف ہے جو حرف پہلے ہی کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان نے اور بھی کئی حروف کی قدامت اور اصلیت معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً "او" کے معنی ہیں آنکھ "آر" کے معنی ہیں لمبی گردن پر رکھا ہوا سر۔

لیکن ہمارے جادو کے جوتے تو ہمیں بہت دور لے گئے۔ اپنی اصل کہانی میں تو ہم صرف وہاں تک آئے تھے کہ پہلی مرتبہ تصویروں کے ذریعہ لکھائی شروع ہوئی۔

اِنسان نے ٹٹول ٹٹول کر دھیرے دھیرے لکھنا سیکھا

جب تک لوگوں کی معلومات زیادہ نہ تھیں تو چند باتوں کو ذہن میں یاد رکھنا آسان تھا۔ روایتیں، قصے، داستانیں وغیرہ سینہ بسینہ، سنی سنائی یاد رہتی تھیں۔ ہر بوڑھا انسان بجائے خود ایک زندہ کتاب تھا۔ لوگ قصوں، داستانوں اور صحیح زندگی بسر کرنے کے اصولوں اور ریتوں رسموں کو لفظ بلفظ یاد رکھتے تھے۔ اور ایک قیمتی سرمایہ اور ورثہ کی طرح اپنے بچوں تک پہنچا دیتے تھے اور وہ لوگ پھر اپنے بچوں تک۔ لیکن اب کتبے وغیرہ ذہن انسانی کی مدد کو پہنچنے لگے ہیں۔ زبان کی لکھائی نے تجرباتِ انسانی کے سلسلہ میں زبان کی بولی کی مدد کرنی شروع کر دی ہے۔ ایک سردار کے مقبرہ پر لوگوں نے اس کے کارنامے تصویروں کی شکل میں ثبت کر دئے ہیں کہ مستقبل میں آنے والی نسلیں بھی اس کے کارناموں سے واقف ہو جائیں۔ جب لوگ پاس پڑوس کے قبیلوں کو ایلچی اور قاصد بھیجا کرتے تھے تو درخت کی چھال کے ایک ٹکڑے یا کسی برتن کے ایک ٹوٹن پر کچھ لکھ دیا کرتے تھے تاکہ اسے یاد رہے۔

دُنیا کی سب سے پہلی کتاب ایک قبر کے کتبے پر لکھی گئی تھی اور پہلا خط درخت کی چھال کے ایک ٹکڑے پر۔

آج ہم اپنے ٹیلیفون اور آواز ریکارڈ کرنے کے آلے اور اپنے ریڈیو پر کتنا اتراتے ہیں کتنا فخر کرتے ہیں! ان کے ذریعہ ہم دوری پر اور وقت پر قابو پا سکتے ہیں۔ ہم نے ریڈیو کے ذریعہ آوازِ انسانی کو سینکڑوں ہزاروں میل دور پہنچانا سیکھ لیا ہے ربن اور ریکارڈ میں ہماری جو آوازیں محفوظ کی گئی ہیں وہ آج سے دسیوں سینکڑوں

سال بعد بھی سُنی جا سکیں گی۔ بے شک یہ ایک بڑی فتح اور کامیابی ہے لیکن ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم نے اِس سلسلہ میں کوئی بڑا تیر مار لیا۔ آج سے پہلے، بہت ہی پہلے جب ہمارے آبا نے درخت کی چھال پر ایک پیغام بھیجا تھا یا کسی کتبے پر کھود کر کچھ لکھا تھا تو انہوں نے پہلی مرتبہ فاصلے اور وقت پر فتح پائی تھی۔

ہمیں ایسے بہت سے کتبے وغیرہ وراثت میں ملے ہیں جو پچھلے دنوں کے کارناموں اور لڑائیوں کا حال نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ پتھروں پر جنگجوؤں اور سپاہیوں کی تصویریں کھچی ہیں جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور نیزے ہیں۔ فاتح فوج گھر واپس آرہی ہے۔ اُن کے پیچھے قیدی ہیں، سر جھکائے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے اور یہاں کان تصویروں میں جو لفظوں کا کام کرتی ہیں ہمیں پہلی زنجیر اور ہتھکڑیاں دکھائی دیتی جو محکومی کی علامت ہیں اور غلامی کی!

یہ نشان ہمیں بنی نوع انسان کی تاریخ کے ایک نئے باب کا حال بتاتا ہے غلامی کی شروعات کا۔ بعد میں مصر کے مندروں میں بھی ہمیں بہت سی ایسی تصویریں ملتی ہیں جو اس بات کی گواہ ہیں۔ اِن میں سے ایک میں غلاموں کی ایک پوری قطار دکھائی گئی ہے جو عمارت بنانے کے لئے اینٹیں ڈھو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کے کندھوں پر اینٹوں کا ایک بکس ہے جیسے وہ دونوں ہاتھوں سے سہارے ہے۔ ایک دوسرا بہنگی پر اینٹیں لا رہا ہے، مستری دیوار بنا رہے ہیں اور رہے جمعدار صاحب تو وہ ایک اینٹ پر مزے سے چڑھے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹیکے ہیں اور ہاتھ میں لکڑی لئے ہیں۔ انہیں کام نہیں کرنا پڑتا۔ اُن کا کام بس یہی ہے کہ دوسروں سے کام لیا کریں! ایک دوسرا جمعدار وہیں بنتی ہوئی عمارت کے پاس کھڑا ہے اور اپنی لاٹھی تان کر ایک غلام کو دھمکا رہا ہے۔ ضرور اس غلام نے کوئی ایسی بات کی ہو گی جو اس کو پسند نہیں آئی۔

غلاموں اور آزاد لوگوں کے متعلق

"کوے کے انڈے سے مور کا بچہ نہیں پیدا ہوتا۔ غلام ماں کے بطن سے آزاد انسان نہیں پیدا ہو سکتا"

ایک یونانی شاعر تھیوگنس نے یہ اشعار اس وقت لکھے تھے جب غلامی کو سماج کے نظام میں مستحکم جگہ مل چکی تھی۔

قدیم زمانے میں غلاموں کو ذلیل قوم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آزاد لوگ اور غلام ایک جگہ رہتے تھے، ایک ساتھ کام کرتے تھے اور ان سب کا مشترک خاندان ہوتا تھا۔ باپ، اس مشترک خاندان کا سردار اور حاکم ہوتا تھا، اس کے بیٹے اور بیٹیوں کی بیبیاں اور بچے اور لونڈیاں، اسی ایک چھت کے نیچے اس کے ساتھ رہتے تھے، اور ہر معاملہ میں اس کے محکوم ہوتے تھے۔ صرف باپ کو یہ حق تھا کہ نافرمان بیٹے یا نافرمان غلام کو چھڑی سے پیٹ سکے! اگر کوئی غلام بہت بوڑھا ہوتا تھا تو وہ اپنے مالک کو صرف "بیٹا" کہتا تھا اور مالک اپنی جگہ اس کو "باپ" کہتا تھا۔ کیونکہ یہ قدیم رسم تھی۔

اگر آپ نے یونان کی وہ مشہور نظم "اوڈیسے" پڑھی ہو یا اس کا قصہ سنا ہو، تو آپ کو وہ غلام ضرور یاد ہوگا جس کا نام یومیس تھا، جو سور چرایا کرتا تھا اور اپنے مالک کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا پیتا جس کا معمول تھا۔ ان عوامی گویوں نے، جنہوں نے "اوڈیسے" لکھی ہے، اس سور چرانے والے کو جگہ جگہ "خدا کے برابر" کہا ہے جیسا وہ اس زمانہ میں قبیلے کے حاکم کو کہا کرتے تھے۔

لیکن یہ نظم حقیقت سے کہیں دور ہے۔ بچارا سور چرانے والا یومیس تو کیا اپنے مالک کے بھی برابر نہ تھا۔ اسے کام کرنا پڑتا تھا لیکن اس کا مالک اپنی مرضی کا مختار تھا۔ دل چاہا کام کیا ورنہ نہیں کیا۔ کنبہ میں خاندان کے فرد کے مقابلہ میں، غلام

سے زیادہ کام کی توقع کی جاتی تھی اور معاوضہ مقابلتہً کم ملتا تھا۔ غلام بجائے خود ایک جائداد تھا اور آقا جائداد کا مالک!

جب آقا مر جاتا تھا تو مویشی اور دوسری چیزوں کے ساتھ غلام بھی اس کے بیٹوں کو وراثت میں ملتا تھا۔

اس مشترکہ خاندانی زندگی میں برابری قطعی معدوم تھی۔ یہاں باپ اپنے بچوں کا حاکم تھا، بیوی اپنے شوہر کی محکوم تھی، بہو اپنے سسر کی محکوم تھی، چھوٹی بہو بڑی بہوؤں کی محکوم تھی لیکن سب سے نیچے اور سب سے آخر میں غلام تھا۔

اب قبیلوں کی برابری اور خاندانوں کی برابری بھی قائم نہ رہ گئی تھی۔ بعض کے پاس بہت مویشی تھے، بعض کے پاس کم تھے، اور مویشی قیمتی چیز تھے، ان کو دے کر کپڑے اور اسلحات کا تبادلہ ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے سکے جو بنائے گئے وہ بیل کی پھیلی ہوئی کھال کی شکل کے بنائے گئے تھے اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مویشی کی قدر کتنی تھی۔

لیکن غلام مویشی سے بھی بڑھ کر قیمتی اور کارآمد تھا۔ غلام گایوں، بھیڑوں، سوروں کی نگہبانی کرتا تھا۔ شام کے وقت وہ انہیں طویلوں، چھپروں اور بھیڑ خانوں میں بند کرتا جن کے چاروں طرف تختے لگے رہتے تھے۔ غلام اناج لا لا کر کھیان میں بھرتا تھا، غلام انگوروں سے شراب بناتا اور ملائی اور دودھ سے مکھن نکالتا تھا۔ کھدیانوں میں سنہرے اناج کا ذخیرہ جمع ہو جاتا تھا۔ مٹی کے مرتبان خوشبودار میٹھے تیل سے لبالب بھر جاتے تھے۔ غلام انسان آزاد انسان کی ہر طرح مدد کرتا تھا مگر مشکل ترین کام ہمیشہ غلام ہی کے سر پڑتا تھا۔ اس طرح جنگ بھی ایک بڑی فائدہ مند تجارت سی بن گئی کیونکہ جنگ سے غلام حاصل ہوتے تھے اور غلاموں سے دولت ملتی تھی۔ چنانچہ آزاد لوگ لڑائیوں پہ جانے لگے۔ اپنے پیچھے وہ غلاموں کو گھر پر چھوڑ جاتے تھے کہ

مویشی کی دیکھ بھال کریں اور زمین کو جوتیں بوئیں۔

قلعہ کا محاصرہ

جنگ سے لوگوں کا کام اور بھی بڑھ گیا۔ اب انہیں تلواروں، نیزوں، بھالوں اور جنگی رتھوں کی ضرورت پڑنے لگی۔ جنگی رتھ میں گھوڑے جوتنے کے بعد وہ اڑتے ہوئے میدان جنگ کے بیچوں بیچ آدھمکتے تھے۔ لیکن جنگ میں تو اگر کبھی حملہ کرنا ہے تو کبھی بچاؤ بھی کرنا ہے۔ جنگجو اپنے سروں پر خود پہن لیتے، اور بائیں بازو پر ڈھال لٹکاتے تاکہ دشمن کی تلواروں اور بھالوں سے محفوظ رہیں۔ اپنے کنبے قبیلے کے رہنے کے مقامات کے چاروں طرف انہوں نے پتھر کی مضبوط فصیلیں اور دیواریں بنانی شروع کیں۔ جتنا ہی قبیلہ زیادہ امیر اور زبردست ہوتا تھا اتنا ہی زیادہ مضبوط وہ اپنے بچاؤ کا سامان کرتے تھے کیونکہ ان کے پاس تو ایسی چیزیں ہوتی تھیں جن کا بچانا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ اب اونچے اونچے پہاڑوں پر قلعہ نما عمارتیں کھڑی ہونے لگیں، جن میں درجنوں کمرے اور گودام ہوتے تھے، دیوار میں برجیاں ہوتی تھیں اور مضبوط دروازے ہوتے تھے۔ قلعہ کی دیواروں سے زمین میلوں تک، دور دور دکھائی دیتی تھی۔ جب دور میدانوں میں ریت کے بادل اور نیزوں کی جھلملاہٹ دکھائی دیتی تو لوگ قلعے کے اندر اپنے بچاؤ کی تیاری شروع کر دیتے۔ کھیتی کرنے والے جلدی جلدی اپنے بیلوں کو اندر ہانک لاتے، گڈریا اپنے ریوڑ کو فوراً دیواروں کے اندر لاکر اکٹھا کر دیتا تھا جب آخری آدمی اور جانور بھی اندر آ چکتا تو بھاری دروازے بند کر دیئے جاتے۔ دیواروں پر اور برجیوں پر جنگجو اپنی اپنی جگہ جم جاتے کہ کب دشمن آئے اور ہم لپنے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے تیر اس پر پھینکیں۔

محاصرین قلعے تک آجاتے اور دیواروں کے باہر کیمپ لگا دیتے وہ جانتے تھے

کہ کسی قلعے کو سر کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ان اونچی اونچی دیواروں کو سر بسجود ہونے میں ابھی کتنے ہی مہینے لگیں گے۔ روز صبح کو قلعہ کے چرچراتے ہوئے دروازے کھلتے، مدافعت کرنے والے جنگجویوں کا ایک جتھا بھالوں سے اپنا بچاؤ کرتا ہوا باہر نکلتا ہے کہ کھلے میدان میں جو قبیلہ پڑاؤ ڈالے ہے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دے۔ انہوں نے غیظ و غضب کے ساتھ اپنی تلواریں دشمن کے خودوں پر مارنی شروع کیں اور وہ لڑتے رہے لڑتے رہے یہاں تک کہ تھک کر چور ہو گئے۔ انہوں نے نہ اپنی پرواہ کی نہ دشمن کو دم لینے دیا۔

ایک طرف کے لڑنے والے اس خیال سے جوش میں بھرے تھے کہ وہ اپنے گھروں، اپنی عورتوں اور بچوں کا بچاؤ کر رہے ہیں اور دوسری طرف قیمتی مالِ غنیمت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ مالِ غنیمت جو کس قدر مشکل سے ملتا تھا۔ رات گئے مدافعت کرنے والے، اپنے مردوں کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر، قلعے کو واپس ہوتے ہیں۔ صبح تک کے لئے لڑائی موقوف ہو جاتی ہے۔

اس طرح کئی دن گذر جاتے ہیں۔ محصور لوگ اپنے محاصرین کے خلاف بڑی دلیری سے لڑتے تھے۔ لیکن بھوک کی سختی دشمن کی تلوار اور تیر سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوتی ہے۔ جب مٹکیوں میں اناج کی بجائے صرف نیچے کی ریت رہ جاتی ہے، کپّوں سے تیل دھار کی بجائے بوند بوند ٹپکنے لگتا ہے، تو قلعہ کے اندر نوحہ و داویلا کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں، بھوکے بچے روتے ہیں مگر عورتیں چھپا کر چپکے سے اُن کے آنسو پونچھ دیتی ہیں کہ مردوں کو اُن پر غصہ نہ آ جائے۔ ہر حملہ کے بعد قلعہ میں بچاؤ کرنے والوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے، اور وہ دن آ جاتا ہے کہ محاصرین، واپس لوٹتے ہوئے مدافعین کا پیچھا کرتے ہوئے قلعہ میں در آتے ہیں وہ دیواروں کو توڑ ڈالتے ہیں پورے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔ جہاں کبھی

لوگ زندہ صحیح سلامت رہتے تھے، کام کرتے تھے، جشن کرتے تھے وہاں اب صرف کھنڈر اور لاشیں باقی رہ جاتی ہیں۔ فتحمند لوگ، مردوں، عورتوں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں کہ انہیں غلام بنا ڈالیں کیونکہ اب وہ پہلے کی طرح آزاد لوگ نہیں رہے۔

زندوں کی کہانی، مُردوں کی زبانی

بہت سے ملکوں میں، میدانوں میں یا کھلے ہوئے ہموار مقامات پر بہت سے نیچے نیچے ڈھیروں کی قطاریں پائی جاتی ہیں بعض وقت صرف ایک ہی بڑا سا ڈھیر ملتا ہے، اور بعض وقت ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ چھوٹے پہاڑوں کی ایک قطار سی معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے ملکوں میں وہاں کے باشندوں کو یہ یقین کے ساتھ معلوم نہیں رہتا کہ یہ ڈھیر جنہیں ماہرین آثار قدیمہ "ٹیلے" کہتے ہیں، دراصل کیا شے ہیں! ان کے متعلق بہت سی کہانیاں، قصے اور روایتیں مشہور ہیں کیونکہ جو چیز بھی ذرا غیر معمولی ہو اور جس کے متعلق وہاں کے سب سے بوڑھے آدمی کو بھی کچھ علم نہ ہو، اس چیز کے متعلق ہمیشہ قصے اور روایتیں گڑھ لی جاتی ہیں۔ آیئے ہم ذرا ان ماہرین آثار قدیمہ سے تو پوچھیں جو ان ڈھیروں میں کھدائی کراتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی پیدائش سے سینکڑوں سال پہلے کی چیزیں ان میں دریافت کی ہوں گی۔

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ "ٹیلے" دراصل اُن لوگوں کی قبریں ہیں جو پرانے بہت ہی پرانے زمانے میں یہاں میدانوں میں رہا کرتے تھے۔ جب کھدائی کرنے والے اِن ٹیلوں میں کھودتے ہیں تو انہیں کافی گہرائی تک جاکر پھر انسانوں کے ڈھانچے ملنے لگتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مٹی کے برتن، پتھر یا کانسے کے اوزار

اور کچھ گھوڑے کی ہڈیاں بھی ملتی ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جو مُردے کے رشتہ داروں نے سفرِ آخرت پر روانہ ہوتے وقت، اس کے ساتھ کر دی تھیں۔ اس وقت لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ موت کے بعد بھی انسان کو کھانا پینا اور کام کرتے رہنا ہوتا ہے۔ عورت کی روح کو اپنے چرخے اور تکلے کی ضرورت ہوتی ہے، مرد کی روح کو اپنے نیزہ وغیرہ کی۔

بہت ہی قدیم زمانے کے ان "ٹیلوں" میں مرنے والے کا تھوڑا سا سامان ساتھ ہوتا تھا اور اُس زمانہ میں لوگوں کے پاس سامان ہی ایسا کونسا ہوتا تھا! کسی شخص کی "اپنی" چیزوں کی حقیقت ہی کیا تھی! بہت سے بہت کوئی طلسماتی تعویذ جسے وہ اپنے گلے میں پہنے رہتا تھا یا اس کا نیزہ جو وہ اپنے دشمنوں کے سینے کے پار کیا کرتا تھا گھر میں تقریباً ہر چیز مشترک تھی کیونکہ پورا خاندان ہی مشترک ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ بہت ہی قدیم زمانے کے ٹیلوں سے نہ کوئی امیر قبریں ملتی ہیں نہ غریب۔ مرنے والے سب برابر ہوا کرتے تھے۔

لیکن کافی عرصہ گذرنے کے بعد پھر مُردوں میں بھی امیر اور غریب کا فرق پایا جاتا ہے۔ دریائے ڈان پر لوگوں کو ایک ایسا ہی ڈھیر ملا ہے جس میں تین قسم کی قبریں ہیں۔ پہلی میں امیر تھے، دوسری میں متوسط الحال لوگ اور تیسری میں غریب اور مفلس۔

ان میں سب سے بڑے ڈھیر کے بیچوں بیچ لوگوں کو ایک بڑا سا گڑھا ملا جو قبر تھا اور اس میں نقشین یونانی برتن، طلائی کناروں والے زرہ بکتر اور خوبصورتی سے بنے ہوئے خنجر وغیرہ پائے گئے۔ متوسط الحال ڈھیروں کے اندر شاذ و نادر کبھی سونے کی کوئی چیز مل جاتی تھی لیکن رنگین اور نقشین برتن کبھی نہیں۔ اور غریبوں کی قبریں تو ذکر کے قابل ہی نہیں کیونکہ مفلس کی قبر میں نقشین برتن یا خوبصورت اور شاندار زرہ بکتر کہاں؟ اس قبرستان میں غریبوں کی قبروں کی

تعداد دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ اِن چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں مُردے کے داہنے ہاتھ پر ایک نیزہ ہوتا تھا اور بائیں ہاتھ پر ایک کٹورا کہ پیاس لگے تو پانی پی سکے اور بس! غریب لوگوں پر مرنے کے بعد، قبر میں بھی غربت چھائی تھی

مثل مشہور ہے کہ "قبر کی سی خاموشی" لیکن یہ قبریں خاموش نہیں رہیں۔ وہ ہمیں صاف صاف، اُس وقت اور اُس دور کا پتہ دیتی ہیں، جب دُنیا میں پہلے پہل غریب اور امیر کی تفریق پیدا ہوئی رمُردے ہمیں زندوں کے متعلق بتاتے ہیں۔

اگر ہم ان قبروں کو چھوڑ کر ان بستیوں تک جائیں جو اِن ڈھیروں سے بہت دُور نہیں ہیں تو ہمیں اس گذشتہ امارت اور گذشتہ غربت کا پتہ چلیگا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے یہ دریافت کیا ہے کہ دریا کے کنارے جو بستی ہوتی تھی اس میں دو بڑی دیواریں ہُوا کرتی تھیں۔ ایک دیوار تو پوری بستی کو چاروں طرف سے گھیرتی تھی اور دوسری دیوار، بستی سے بیچوں بیچ ایک گول گھیرے کی طرح ہوتی تھی۔ اس مرکزی حصے میں لوگوں کو بہت سے قیمتی برتن اور مرتبان وغیرہ ملے جو دور دراز یونان سے وہاں لائے گئے تھے لیکن باہری حصے میں، یعنی اس باہری اور اندرونی دیوار کے درمیان، شاذ و نادر ہی ایسی چیزیں مل سکیں۔ وہاں تو معمولی قسم کے مقامی بنے ہوئے برتن اور گھڑے پڑے لڑھک رہے تھے۔ وہاں جو لوگ رہتے تھے وہ لاکھ کے روغنی پیالے، یا باہر کی بنی ہوئی نقشین پلیٹیں اور رکابیاں خریدنے کی بھلا کب سکت رکھتے تھے اور خریدتے بھی کہاں سے؟ کچھ عرصہ بعد اِن ہی لوگوں کی قبروں پر وہ مٹی کے تودے بنائے گئے جواب بھی ہموار میدان کے اُفق سے سر نکالے جھانکتے رہتے ہیں۔

تو اس طرح قبریں ہمیں اُن لوگوں کا حال بتاتی ہیں جو اُن کے اندر دفن ہیں۔ بعض وقت وہ ہمیں بڑی بھیانک اور وحشیانہ باتیں بھی بتاتی ہیں۔ اُن غلاموں کے متعلق جو اپنے آقا کے ساتھ دفن کئے جانے کے لئے موت کے گھاٹ اتارے

گئے۔ اُن عورتوں کے متعلق جو زبردستی اپنے مردہ شوہروں کے ساتھ قبر میں دھکیل دی گئیں۔ یہ قبریں کتابوں سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ اُن ظلموں کو جو باپ۔ یعنی مشترکہ خاندان کا سردار، روا رکھتا تھا۔ جب وہ مرتا تھا تو اپنے ساتھ اپنی بیویوں اور غلاموں کو بھی لے مرتا تھا کیونکہ سونا اور کانسی کی چیزوں کی طرح یہ لوگ بھی اس کی ذاتی جائداد میں شمار کئے جاتے تھے۔

انسان نے ایک نیا دھات پیدا کرلیا

یہ قیمتی چیزیں جو ہزاروں سال تک تیر کے اندھیرے اور محصور بستیوں کے کھنڈروں میں دفن تھیں، اب عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ قدیم ماضی کی ان چیزوں کی جو اتنے سال تک انسان کی نظروں سے پوشیدہ تھیں، اب ہر شخص کے دیکھنے کے لئے نمائش کی جارہی ہے اور ہم انہیں بچشم خود دیکھ سکتے ہیں۔ عجائب خانوں کے جانے والے دیر دیر تک عجائب خانوں کے ان شیشے کے خانوں کے سامنے کھڑے رہتے ہیں اور سونے کے دستے والی تلواروں، نازک کاریگری سے بنی ہوئی خم کھائی ہوئی زنجیروں، پیتل کے سُر اور سینگوں کے بنے ہوئے موتیوں اور چاندی کے برتنوں کو جو بیلوں یا بارہ سنگھوں کی شکل کے ہوتے ہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو بنانے کے لئے کتنی محنت اور کتنی فنکاری کی ضرورت ہوئی ہوگی! معمولی کانسے کا خنجر بنانے کے لئے بھی کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ پہلے تو انہیں کچی دھات نکالنی ہوتی تھی کیونکہ وہ دن ختم ہوچکے تھے جب سچے تانبے کے ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے مل جایا کرتے تھے۔ اب انہیں کچا تانبہ نکالنے کے لئے زمین کے اندر گہرا گھسنا پڑتا تھا جیسے وہ کسی زمانے میں چقماق کے لئے کیا کرتے تھے۔ کانوں کی گہرائی کے اندر پہنچ کر وہ اُسے کدالوں سے توڑتے تھے اور چمڑے کے تھیلوں میں بھر بھر کر اوپر لاتے

تھے۔ کچا سامان نکالنے کے لئے وہ لوگ کانوں میں آگ جلاکر، لاؤ بھی لگادیا کرتے تھے، اور جب پتھریلی دیواریں خوب تپ جاتیں تو ان پر پانی ڈالتے۔ پانی، شائیں شائیں کرتا ہوا بھاپ بن جاتا، پتھریلی دیواریں دراڑیں پڑ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتیں اور اس طرح آگ کے ذریعہ کان کنوں کی کُدال کو مدد پہنچتی۔

اُس زمانے کی کانیں ایسی لگتی تھیں جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ ہو۔ جوالا مکھی کی طرح، کان کے دہانے سے کبھی بھاپ کے بادل اٹھا کرتے تھے، جو نیچے آگ جلانے سے پیدا ہوتے تھے۔ انگریزی زبان میں جوالا مکھی کے لئے جو لفظ ہے "والکینو" وہ قدیم لوہاروں کے خدا "والکن" کے نام پر رکھا گیا ہے۔ جب اس طرح سے کچا تانبہ نکل چکتا تھا تو پھر وہ اس دھات کو گلاتے تھے۔ اس میں بھی بڑی کاریگری کی ضرورت تھی۔ دھات کو سخت کرنے اور اپنی مرضی کے مطابق مختلف چیزوں میں ڈھالنے کے قابل بنانے کے لئے، وہ کچے تانبے میں، گلاتے وقت ٹین کی آمیزش کرتے تھے۔ اب یہ خالص تانبہ نہیں رہ جاتا تھا بلکہ کانسہ بن جاتا تھا، جو ایک نیا دھات تھا، جس کی خاصیتیں بھی بالکل نئی تھیں اور جو انسان کے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا تھا۔

پُرانے زمانے میں، پتھر کے اوزاروں کے وقت میں، ایک کاریگر دوسرے کاریگر کا کام بخوبی کر سکتا تھا، اور کسی صنعت میں مہارت حاصل کرنا کوئی بات نہ تھی۔ شکاری قبیلوں میں ہر شخص شکاری ہوا کرتا تھا اور ہر شکاری کو اپنے تیر اور کمانیں خود ہی بنانے ہوتے تھے۔

لیکن کسی ہری شاخ کو دونوں طرف سے جھکا کر اور رسی یا چمڑا باندھ کر کمان بنالینا اور بات ہے اور کچے تانبے کے ایک ٹکڑے کو چمکتا ہوا کانسہ بنا دینا بالکل الگ بات ہے۔ اب لوگوں کو زرہ بکتر بنانا سیکھنے میں برسوں لگ جاتے تھے بیٹے

اپنے باپوں سے یہ ہنر سیکھتے تھے۔ کاریگری قبیلوں کی ذاتی جائداد اور موروثی دولت سمجھی جاتی تھی بعض وقت پورے کے پورے کنبے یا برادری زیور بنانے والوں یا لوہے کے کاریگروں یا مٹی کے برتن بنانے والوں کی ہُوا کرتی تھی اور اُن کی شہرت دُور دُور پھیل جاتی تھی!۔

یہ تیرا یہ میرا

شروع میں ہر کاریگر صرف اپنی ہی برادری یا قبیلے یا گاؤں کے لئے کام کرتا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تو زرہ بنانے والوں یا برتن والوں نے اپنی چیز کا تبادلہ اناج یا کپڑے یا دوسرے کاریگروں کی بنائی ہوئی دوسری قسم کی چیزوں سے کرنا شروع کر دیا اور اس وجہ سے قبیلوں اور برادری کا نظام ٹوٹنے لگا۔ پہلے تو گاؤں میں ہر شخص برابر سمجھا جاتا تھا لیکن اب امیروں اور غریبوں صنعت سازوں اور کھیتی کرنے والوں کے درمیان ایک خطِ فاصل کھنچ گیا۔

جب تک کوئی کاریگر اپنی پوری برادری کے لئے کام کرتا تھا تو برادری بھی اس کے پیٹ بھرنے کا سامان کرتی تھی۔ لوگ ایک ساتھ کام کرتے تھے اور جو کچھ ملتا برابر سے آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے لیکن جب صنعت ساز اپنی تلواریں اور برتن وغیرہ دوسری جگہ پہنچانے لگے تو پھر وہاں سے انہیں جو اناج یا کپڑا یا جو کچھ بھی ملتا اسے وہ اپنی برادری والوں میں تقسیم کرنے سے کترانے لگے۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ یہ اناج یا کپڑا وغیرہ جو ان کو ملا ہے اس میں کسی کی مدد شامل نہیں ہے

اب لوگ الگ الگ گھروں میں رہنے لگے۔ یونان میں جو دیہات کے کھنڈر پائے جاتے ہیں اُن سے صاف یہی پتہ چلتا ہے سب سے امیر خاندان ایک اونچے سے پہاڑ پر مضبوط دیواروں کے گھیرے میں رہتا تھا۔ اپنی دولت کو اِن

موٹی موٹی پتھریلی دیواروں میں چھپانے کا سبب بھی تھا۔ وہاں پورے قبیلے کا فوجی سردار اپنی بیوی، بیٹوں، بہوؤں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ نیچے وادی میں سب سے زیادہ غریب لوگ یعنی کسان اپنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ پہاڑوں کے دامن میں صنعت سازوں اور کاریگروں کا گھر تھا۔ مثلاً زرہ بنانے والے کمہار، تانبے کا کام کرنے والے

اب ایسے شہروں میں لوگ برابری کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔ عام غریب لوگ اُس مضبوط اور امیر سردار کی دولت کو بڑی حسرت سے دیکھتے تھے اور نتیجہ یہ کہ اُس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خود خدا بھی ان امیروں ہی کا طرفدار ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے انہیں یہی بتایا تھا اور بالکل بچپن سے وہ برابر لوگوں کے دماغ میں یہی بات ٹھونستے رہتے تھے۔

کھیتی کرنے والے بھی اپنی جگہ صنعت سازوں یا کان کنوں کو اپنا بھائی بند نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کان کن بھی ایک قسم کا جادوگر ہوگا جو سر سے پاؤں تک دھوئیں سے سیاہ، زمین کے نیچے ایک سرنگ میں بیٹھا کام کرتا ہے اور سرنگ بھی کیسی جس کے منہ سے بھاپ کے دل کے دل نکل رہے ہوں۔ اب کسی کو کیا معلوم نیچے کیا ہو رہا ہے؟ کچا تانبہ کیسے نکالا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ کسی طلسماتی طاقت نے اُسے بتایا ہوگا کہ یہاں کھودو اور پھر اسے کچا تانبہ نکال کر دیا ہوگا اور کسی جادو کے ذریعہ تانبہ اور کانسہ بنا دیا ہوگا۔ نہیں بھئی! جو بھلے آدمی خیر منانا چاہتے ہوں وہ ان لوگوں سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔ اور صرف یونان ہی نہیں بلکہ ہر جگہ لوگوں کا یہی خیال تھا۔ لوہار، جادوگروں کی کہانیاں بہت ہی قدیم زمانے سے اب تک، ہم تک چلی آتی ہیں۔ ہماری زبان میں ایسے الفاظ بھی باقی رہ گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت اور غربت کے متعلق لوگوں کے خیالات کیا تھے۔ ان کی

سمجھ میں یہ نوآتا نہیں تھا کہ امیر اور غریب کی تفریق کا اصل سبب کیا ہے۔ وہ بس یہی سمجھتے تھے کہ خدا نے قسمتوں کا فیصلہ کر دیا ہے۔ خدا امیروں کا طرفدار اور اُن پر مہربان ہے لیکن غریبوں کے لئے اُس کے پاس سوائے بدبختی اور پھٹکار کے کچھ نہیں ہے۔

ساتواں باب

دنیا پھیلنے لگی

سائنس کی شروعات

انسان پہلے یہ سمجھتا تھا کہ پوری دنیا ایک طلسمی کارخانہ ہے۔ اس کی سمجھ میں کوئی چیز نہیں آتی تھی اور نہ ہی وہ کسی بات کا سبب جانتا تھا یا کسی بات کی تشریح اور وضاحت کر سکتا تھا۔ ہر قدم، ہاتھ کا ہر اشارہ ممکن تھا کہ ایسی اَن دیکھی طاقتوں کو ہشیار کر دے جو اُن کی قسمت کو اچھائی یا برائی کی طرف مائل کر دے۔

ابھی تک لوگوں کو تجربہ اتنا کم ہوا تھا کہ انہیں اس کا یقین بھی نہیں تھا کہ آج سورج ڈوبے گا تو کل نکلے گا یا نہیں۔ سورج کو پھر سے نکلوانے کے لئے وہ عجیب عجیب قسم کے جادو ٹونے وغیرہ کیا کرتے تھے۔

مصر میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ فرعون کو سورج پر اقتدار حاصل ہے۔ ہر صبح وہ مندر کا ایک چکر لگایا کرتا تھا تاکہ اس بات کا یقین ہو کہ اُس دن سورج اپنے مقررہ پھیرے پر نکل آئے گا اور چلے گا۔ اس کے علاوہ مصریوں کے یہاں موسم خزاں میں ایک خاص جشن ہوا کرتا تھا جسے "سورج کی لاٹھی" کہتے تھے کیونکہ ان کو خیال تھا کہ

خزاں کے کمزور سورج کو اپنا سفر طے کرنے کے لئے ایک عصا کی ضرورت ہے لیکن انسان کام میں برابر مصروف رہا اور برابر دُنیا کے متعلق اور قوانین قدرت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرتا رہا۔

قدیم کاریگر پتھر کو تیز کرتے اور چمکاتے وقت اپنے ہاتھوں سے چھوکر اور آنکھوں سے دیکھکر اس کی خاصیت سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پتھر ایک سخت چیز ہے اور اگر وہ اُس پر ایک زور کی چوٹ ماریگا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا اور یہ بھی کہ اگر اُس پر چوٹیں لگائی جائیں گی تو وہ روئے گا اور چلائے گا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ پتھر بھی بہت سی قسم کے ہوتے تھے۔ اگر یہ پتھر نہ بولا تو ممکن ہے کسی دن کوئی ایسا پتھر ہاتھ لگے جو بولتا بھی ہو۔ آج ہم ایسے خیال پر ہنستے ہیں لیکن قدیم انسان ہماری طرح کب سوچتا تھا ابھی تک قدیم انسان نے کُلّیہ قائم کرنا نہ سیکھا تھا۔ لہٰذا زندگی اُس کے لئے مستثنیات سے بھری تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ کوئی بھی دو پتھر آپس میں ایک دوسرے سے ہو بہو مشابہ نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ یہ سوچتا تھا کہ ممکن ہے ان کے برتاؤ میں بھی فرق ہو۔ جب وہ ایک پھاوڑا بنا لیتا تھا تو دوسرا پھاوڑا بالکل ویسا ہی بناتا تھا کہ اُسی عمدگی کے ساتھ زمین کھود سکے۔

لیکن سال گذرتے گئے، سالہا سال، ہزارہا سال گذر گئے۔ تھوڑا تھوڑا کرکے انسان عام طور پر پتھر کی خاصیت کو سمجھ گیا کیونکہ وہ کتنی ہی قسم کے پتھروں کو آزما چکا تھا تمام پتھر سخت تھے، یعنی پتھر ایک سخت مادہ تھا۔ کوئی پتھر نہیں بولا۔ یعنی پتھر بولتے نہیں ہیں۔

اور اس طرح علم الاشیا اور سائنس کے پہلے پہلو بیان کی بنیاد پڑی۔

اب جو کوئی صنعت ساز کہتا تھا کہ "چقماق سخت چیز ہے" تو اُس سے اُس کا مطلب اُس خاص چقماق کے ٹکڑے سے نہیں ہوتا تھا جو اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا

بلکہ ہر حقیقی سے ہوتا تھا۔ اب وہ ایک خاص قانون قدرت کو سمجھ گیا تھا۔ ایسا قانون اور ایسا اصول جو دنیا میں موجود تھا اور برتا جا سکتا تھا۔ جاڑے کے موسم کے بعد بہار کا موسم آتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی ایسی بڑی بات نظر نہیں آتی یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے کہ جاڑے کے بعد خزاں نہیں آتی بہار آتی ہے۔ لیکن موسم کا تسلسل ہمارے آبا و اجداد کی ایک سب سے قدیم سائنٹیفک دریافت تھی۔ ایک ایسی دریافت جو انہوں نے مسلسل کافی عرصہ تک غور سے دیکھنے کے بعد متعین کی تھی۔ لوگوں نے سال کا حساب صرف اس وقت لگانا شروع کیا جب انہیں معلوم ہو گیا کہ سردی اور گرمی کا بدلنا کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے اور سردی کے بعد ہمیشہ بہار کا موسم آتا ہے، بہار کے بعد گرمی اور خزاں کا موسم آتا ہے۔

مصر میں لوگوں نے یہ دریافت دریائے نیل میں سیلاب آنے کے ذریعہ کی وہ اپنے سال کا حساب ایک سیلاب سے دوسرے سیلاب تک کیا کرتے تھے۔ یعنی ایک سال پورا ہو گیا۔ دریا کا یہ معائنہ وغیرہ مذہبی پیشوا کیا کرتے تھے کیونکہ لوگوں کے خیال میں دریا تو ایک خدا تھا۔ اب بھی مصر کے بعض مندروں پر ان مذہبی پیشواؤں کے لگائے ہوئے نشانات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پانی کتنا اونچا آیا کرتا تھا۔

جولائی کے مہینے میں جب کھیت دھوپ سے تپنے لگتے تھے تو لوگ بے صبری سے منتظر رہتے تھے کہ نیل کا مٹیالہ گدلا پانی کب بڑھتا ہے! کیا وہ بڑھے گا یا نہیں؟ اگر دیوتا اُن لوگوں سے خفا ہو جائیں اور ان کے کھیتوں کے لئے پانی نہ بھیجیں تو؟ مندروں میں چہار طرف سے نذریں اور چڑھاوے آنے لگتے تھے۔ کسان اپنے اناج کی آخری مٹھی بھی مذہبی پیشواؤں کو دے ڈالتے تھے اور ان سے منت سماجت کرتے تھے کہ ہمارے لئے خدا سے دعا کیجئے! روز علی الصباح یہ مذہبی پیشوا دریا پر جاتے اور دیکھتے کہ پانی بڑھ رہا ہے یا نہیں، روز شام کو وہ مندر کی سپاٹ

چھت پر چڑھ جاتے اور گھٹنے ٹیک کر، دو زانو ہوکر، ستاروں کو تکتے رہتے۔ ستاروں ہی کے ذریعہ وہ اپنا حساب لگایا کرتے تھے۔ آخرکار وہ بڑی سنجیدگی اور شان سے مندر میں اعلان کرتے "خدا نے مہربانی کر کے ہماری دعائیں سُن لی ہیں۔ تین راتوں کے اندر اندر پانی تمہارے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے آ جائیگا"

دھیرے، دھیرے، ایک ایک قدم کر کے، لوگوں نے اس دنیا پر قابو پایا جو اُن کے لئے بالکل نئی تھی۔ اب وہ ایک ایسی دُنیا میں تھے جو طلسماتی نہیں تھی بلکہ سمجھی جا سکتی تھی۔ مندر کی چھت وہ پہلی جگہ تھی جہاں سے علم النجوم شروع ہوا کمہاروں اور لوہاروں کی دکانیں وہ پہلی تجربہ گاہیں تھیں جہاں سائنس کے اولین تجربات عمل میں لائے گئے۔

لوگوں نے مطالعہ کرنا، غور کرنا، شمار کرنا اور کلیے قائم کرنا سیکھا۔

یہ قدیم زمانہ کی سائنس آج کل کی سائنس سے بہت مختلف تھی اب بھی وہ بہت کچھ طلسم اور جادو کی مانند تھی کیونکہ سائنس اور جادو کے درمیان حدِّ فاصل کھینچنا اس وقت بہت دشوار تھا۔ لوگ ستاروں کا نہ صرف مطالعہ کرتے تھے بلکہ اُن کے ذریعہ پیشینگوئی بھی کیا کرتے تھے اور زمین و آسمان کے مطالعہ کے ساتھ زمین و آسمان کی پرستش بھی کرتے جاتے تھے۔ پھر بھی اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن ضرور نظر آ رہی تھی۔

خدا دُور ہٹتے گئے

پہلے قدیم انسان کا عقیدہ تھا کہ چاروں طرف روحیں ہی روحیں ہیں۔ ہر پتھر میں، ہر درخت میں، ہر جانور میں۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ عقیدہ ختم ہو گیا۔ انسان نے یہ سوچنا بند کر دیا کہ ہر چیز میں روح ہے۔ مختلف جانوروں کی روحیں اکٹھی کر کے جنگل کے ایک دیوتا میں ضم کر دی گئیں۔ کسانوں نے یہ عقیدہ چھوڑ دیا کہ اناج

کی ہر بال میں ایک روح ہے ۔ اب انہوں نے ان تمام روحوں کو ایک جگہ کر کے زرخیزی کی ایک دیوی بنا دی جو اناج کے تمام بالوں کو اگانے پر قادر تھی ۔

یہ خدا اور یہ دیوتا جو پہلی روحوں کی جگہ قائم ہوئے تھے، فانی انسانوں کے درمیان نہیں رہتے تھے ۔ علم نے انہیں آہستہ آہستہ کر کے انسان کی بستیوں سے پرے ڈھکیلنا شروع کیا ۔ اب خدا ایسی جگہ رہنے لگے جہاں کبھی کوئی انسان پہنچا بھی نہ ہو، کبھی متبرک جنگلات کی اندھیری گہرائیوں میں تو کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر گھنے جنگلوں میں ۔ لیکن انسان وہاں بھی پہنچ گیا ۔ علم نے ان اندھیرے جنگلوں کو بھی منور کر دیا اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو بادل چھائے تھے ۔ ان کو بھی چھانٹ دیا ۔ اب یہ خدا اپنی اس پناہ گاہ سے نکالے جانے کے بعد، آسمان پر پہنچے، سمندر کی تہہ میں اترے یا انہوں نے زمین کے نیچے، زمین دوز سلطنت میں پناہ لی ۔

قصے کہانیوں میں، جو سینہ بسینہ چلی آتی تھیں، یہ بیان ہوا کرتا تھا کہ کس طرح یہ خدا اور یہ دیوتا لڑائیوں اور محاصروں میں شرکت کرنے کے لئے زمین پر اتر آیا کرتے تھے، تلواریں سجائے، تیر سنبھالے ۔ وہی تو تھے جو آخری وقت پر لڑائی کے ہیرو کو ایک سیاہ بادل میں چھپا لیتے تھے اور اس کے دشمنوں پر اپنے غضب کی بجلی گرایا کرتے تھے لیکن داستان گو آخر میں یہ ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ یہ باتیں بہت پرانے زمانے کی ہیں! اب وہ زمانہ کہاں!

تو اس طرح انسان کے تجربات آگے ہی آگے بڑھتے گئے، علم کی روشنی کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا گیا اور یہ دائرہ برابر خداؤں کو مجبور کرتا رہا کہ وہ آس پاس سے دور ہٹ جائیں، حال سے ماضی کو چلے جائیں، "اس دنیا سے پار دوسری دنیا میں" "اس دنیا" کو ہجرت کر جائیں ۔

اب خداؤں سے مراسمت کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا تھا ۔ پہلے تو جس کا جی

چاہے رسوم ادا کر دے، طلسماتی رنہیں پوری کرتا ہے۔ کیونکہ یہ رسمیں اور ریتیں آسان بھی تو تھیں۔ مثلاً پانی برسوانے کے لئے بس صرف اتنا کرنا پڑتا تھا کہ تھوڑا سا پانی اپنے منہ میں لے لیا اور ناچتے گئے اور کلیاں کرتے گئے۔

بادلوں کو بھگانے کے لئے چھت پر چڑھ گئے اور ہوا کی نقل کر کے پھونک مار دی۔ لیکن اب لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا وہ ان طریقوں سے نہ تو پانی برسوا سکتے تھے اور نہ ہی بادلوں کو بھگا سکتے تھے لہٰذا انھوں نے یہ کلیہ قائم کیا کہ خداؤں سے اپنی خواہش کو پورا کروانا کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے چنانچہ یہ ہُوا کہ مذہبی پیشوا، خداؤں اور معمولی انسان کے درمیان مراسلت کرانے لگے کیونکہ وہ مذہبی پیشوا ہی تو تھے جو تمام پیچیدہ رسوم اور خداؤں کے متعلق پُر اسرار باتیں اور روائتیں جانتے تھے معمولی لوگ بھلا کیا جانیں!

پہلے تو جادوگروں کا کام صرف یہ تھا کہ رسوم ہوتے وقت ان کی رہنمائی کر دیا کریں۔ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی بہ نسبت، روحوں سے کچھ زیادہ قریب نہ ہُوا کرتا تھا۔

مذہبی پیشوا اور ہی چیز تھا۔ وہ تو وہیں، اس متبرک مقام میں رہتا تھا، خداؤں کے بالکل پڑوس میں۔ وہی تو مندر کی چھت پہ چڑھ کر، ستاروں کی بیاض دیکھتا تھا اور پھر اُن کے ذریعہ لوگوں کو خداؤں کی مرضی سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ کیونکہ ستاروں کی بیاض صرف وہی پڑھ سکتا تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے وہ کسی جانور کی اوجھڑی دیکھ کر بتا دیا کرتا تھا کہ فتح ہو گی یا شکست!

اب خدا معمولی انسانوں، فانی انسانوں، سے اور دور ہوتے گئے۔ اب وہ دن ختم ہو چکے تھے جب خداؤں کے نزدیک ہر شخص برابر تھا۔ لوگ اپنی روزانہ کی زندگیوں کو دیکھ کر بخوبی سمجھ سکتے تھے کہ اب وہ مساوات باقی نہیں رہ گئی تھی اور

مذہبی پیشوا! وہ تو کہتے تھے "ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ وہ جسے چاہے ذلت دے جسے چاہے عزت۔ انسان کو سب کچھ اپنے خداؤں پر چھوڑ دینا چاہیئے، اس کا پورا بھروسہ کرنا چاہیئے۔ دیوتا اِس دُنیا کے ایسے ہی حاکم اور مالک ہیں جیسے سردار اپنی قوم کا"

لیکن سب لوگوں نے مذہبی پیشواؤں کا یہ سبق، چپکے سے نہیں سنا! کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اندھا دھند خداؤں کی مرضی کو ماننے اور اپنا سر تسلیم خم کرنے پر تیار نہیں تھے! ایسا بھی وقت آنے والا تھا جب یونان کے ایک شاعر نے کھلم کھلا پوچھا "نیک لوگ تکلیف میں ہیں، بُرے لوگ مزے اڑا رہے ہیں۔ انصاف کہاں ہے؟ بچوں کو اپنے والدین کے کئے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے! اب انسانوں کے درمیان صرف ایک ہی دیوی رہ گئی ہے۔ اُمید۔ اور اُسی کے آگے دعا مانگنی چاہیئے۔ باقی سب خدا اور دیوتا اولمپس کو چلے گئے ہیں"

دُنیا اور وسیع ہوتی ہے

قدیم زمانے کا انسان، سچائی اور افسانے، علم اور وہم میں کوئی تفریق نہیں کرتا تھا۔ علم کو وہم سے نجات پاتے پاتے ہزاروں برس کا عرصہ لگا اور پھر علم وہم سے ایسا الگ ہوگیا جیسے دودھ سے مکھن! جو قصے اور گیت ہم تک نسلاً بعد نسلاً پہنچے ہیں، اُن میں سے قبیلوں کی تاریخ، اور خداؤں اور بہادروں کے قصوں کو الگ الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ داستانی جغرافیہ کو اصل جغرافیہ سے علیحدہ کرنا دشوار ہے، پرانے افسانوں میں سے اولین علم النجوم کو چھانٹنا محال ہے۔ یونانیوں نے ہمارے لئے اپنے پرانے گیتوں اور روایتوں میں "الیڈ" اور "اوڈیسی" چھوڑا ہے۔ اُن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح یونانیوں نے شمشیر طرازی کو محسوس

کر کے برباد کیا، اور پھر بعد میں کس طرح یونانی قبیلوں کا ایک سردار یولیسس عرصہ تک سمندروں کا سفر کرنے کے بعد آخر اپنے وطن اِتھاکا پہنچا۔ ٹرائے کی فصیلوں کے نیچے آدمیوں کے پہلو بہ پہلو خدا بھی مصروفِ پیکار تھے، بعض محاصرین کے ساتھ اور بعض محصورین کے ساتھ جب کسی ایسے شخص کو جو خداؤں کو عزیز ہوتا تھا، موت کا خطرہ ہوتا تھا تو وہ اس کو چپکے سے وہاں سے اڑا دیتے تھے، پھر وہ اولمپس کی چوٹیوں پر بیٹھ کر ضیافت کرتے تھے اور بحث ہوتی تھی کہ لڑائی کو جاری رکھا جائے یا لڑنے والی قوموں میں صلح کرادی جائے۔

اس قصے میں سچ اور جھوٹ کا میل ہے اب اس میں سے کتنا حصہ تاریخی طور پر صحیح ہے اور کتنا محض افسانہ ہے؟ کیا یونانی سچ مچ ٹرائے کی فصیلوں کے نیچے لڑے تھے؟ اور ٹرائے خود ۔ کیا کبھی، یا کوئی شہر تھا بھی یا نہیں؟

اس مسئلہ پر عالموں میں بڑا اختلاف تھا لیکن آخرکار ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ نے پہنچکر تمام شکوک رفع کئے۔ ایلیڈ میں جو راستہ بیان کیا گیا ہے، اُسے تھامے تھامے وہ ایشیائے کوچک میں پہنچا اور وہاں اُس نے ٹرائے کے کھنڈروں کو کھودنا شروع کیا۔ ٹھیک اُسی جگہ جہاں ٹرائے کا شہر بیان کیا گیا تھا۔

اب یہ حال کھلا کہ اوڈیسی میں جتنی باتیں بیان کی گئی تھیں وہ نرا افسانہ نہیں تھیں۔ ماہرین جغرافیہ نے اسے ثابت کر دیا۔ انہوں نے اس راستہ کا بھی پتہ لگایا جس پر یولیسس گذرا تھا۔ اگر آپ نقشہ کو بخوبی غور سے دیکھیں تو اُس پر آپ کو Lotislaters کا ملک یولیسس اور سکائیلا اور چربدس کے مقامات بھی ملیں گے جن کے درمیان سے گذرتے وقت یولیسس کا جہاز ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

Lotislaters کا ملک افریقہ کا وہ کنارہ ہے جہاں ترپولیا

اس سے پتا ہے یولیس ایک جزیرہ ہے جو اب لپاسکی کہلاتا ہے، اسکائیلا ایک چٹان ہے اور چیربدس ایک بھنور ہے جو اٹلی اور سسلی کے درمیان پڑتا ہے

اس طرح اودیسی میں ہر بات نرا افسانہ نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ کہیں قدیم جغرافیہ کا مطالعہ اس قصے کے ذریعہ کرنے بیٹھ گئے تو یہ سخت غلطی ہوگی۔ اس کتاب میں جو سیاحت کی پہلی کتاب تھی، جغرافیہ سر سے پاؤں تک افسانے کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ پہاڑوں کو دیو بنایا گیا ہے، وحشی لوگوں کو ایک آنکھ والے، دیو پیکر، آدم خور بتایا گیا ہے۔

اُس زمانے کے لوگ صرف اُن ہی مقامات سے واقفیت رکھتے تھے جہاں وہ پیدا ہوتے اور پلتے بڑھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اُس زمانہ میں سوداگر ہوا کرتے تھے جو کھلے سمندروں کا سفر کرتے تھے مگر وہ بھی کنارے سے بہت دُور جانے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں وسیع سمندروں کا سفر کرنا موت کے مُنہ میں جانے کے برابر تھا کیونکہ لوگوں کے پاس نہ نقشے تھے نہ قطب نما تھا وہ لوگ تو بس صرف ٹٹول ٹٹول کر، سورج اور ستاروں کے ذریعہ اپنا راستہ قائم کرتے ہوئے، سفر کیا کرتے تھے۔ کوئی اونچی چٹان یا کوئی اونچا درخت روشنی کے مینار کا کام دیا کرتا تھا۔ سمندر اپنے گہرے پانی میں ہزاروں خطرات اور آفات کو چھپائے رہتا تھا۔ چوڑے چوڑے، پیالہ نما جہاز، پانی میں ذرا سی ہلچل پیدا ہونے سے اِدھر اُدھر بھٹک جاتے اور ڈگمگانے لگتے تھے۔ بھدے بھدے بادبان کس مصیبت سے قابو میں آتے تھے، ہوا انسان کا حکم مانتی ہی نہ تھی اور جہاز کو ایسا اڑایا کرتی تھی جیسے وہ کوئی ہلکا پھلکا پَر ہو۔

اور جب جہاز ہزار دقت و خرابی کنارے پر پہنچ جاتا تھا تو تھکے ماندے ملاح اُسے کھینچ کھینچ کر ریتیلے کنارے پر چڑھاتے تھے۔ یہاں خشکی پر آخرکار وہ

آرام کا سانس لے سکتے تھے لیکن پھر بھی اُن کے لئے اطمینان کہاں ؟ اجنبی مقام ان کے لئے سمندر سے بھی زیادہ خطرناک اور بھیانک تھا۔ ملاحوں کو ایسا لگتا جیسے وہ کہانیوں میں سُنے ہوئے آدم خوروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جب کسی نئے جانور کو دیکھتے تو سوچتے یہ ضرور کوئی خطرناک عفریت ہوگا۔ خشکی پر زیادہ اندر کی طرف اور دُور جاتے ہوئے اُن کی روح خشک ہوتی تھی۔

پھر بھی ہر سفر، ہر سیاحت کے ساتھ دنیا کی وسعت بڑھتی ہی گئی۔ اَن دیکھے مقامات اور انسانوں کے ملکوں کی حدیں دور ہٹتی گئیں۔ بہادر ترین ملاح دریاؤں اور سمندروں کو پار کر کے بحرِ ذخار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اب یہ بحرِ ذخار اُنہیں لامتناہی لگتا تھا۔ جب وہ گھر واپس آتے تو بیان کرتے کہ کس طرح وہ دُنیا کے آخری کنارے تک پہنچ گئے تھے اور یہ بھی کہ دنیا چاروں طرف سے ایک بہت ہی بڑے سمندر سے گھِری ہوتی ہے۔

ہزاروں سال بعد لوگ یورپ سے ہندوستان گئے، چین سے یورپ گئے۔ سیاحوں اور ملاحوں نے اُس بحرِ ذخار کو بھی پار کیا اور اُس کے اُس پار ایک آباد دنیا پائی۔ لیکن پھر بھی دنیا کا سائنس ابھی نہ معلوم کب تک قصّے کہانیوں سے سجا یا جاتا رہے گا۔ خود کولمبس، جس نے یہ 'نئی دنیا' دریافت کی تھی یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ اِس دُنیا میں ایک بہت ہی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر دُوسری دُنیا یا عقبےٰ یا جنت ہے اس نے اسپین کی ملکہ کو لکھا کہ وہ امید کرتا ہے کہ جنت کی سیاحت کرے گا اور آس پاس کے ملک کو بھی دیکھے گا۔

پندرھویں صدی میں روس میں لوگوں کا اکثر یہ عقیدہ تھا کہ یورال کے پہاڑوں میں لوگ رہتے تھے جو ریچھوں کی طرح جاڑے بھر سویا کرتے تھے۔ ہمیں ایک پُرانا مسودہ مِلا ہے جس کا نام ہے "مشرقی حصے کے عجیب لوگوں کے متعلق"

اس مسودہ میں بہت تفصیل کے ساتھ ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے دہانے نہیں ہیں، ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کے سر غائب ہیں، ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کی آنکھیں سینے پر ہیں۔

ہمیں یہ باتیں کیسی مضحکہ خیز لگتی ہیں ہا ہے نا، لیکن ہم یہ بھی تو سوچتے ہیں کہ ممکن ہے جن دنیاؤں میں ہمارا گذر نہیں ہو سکتا وہاں بھوت اور عفریت بستے ہوں۔ اس دنیا کو تو ہم اب اچھی طرح جان گئے ہیں اسی لئے تو ہم نے اپنی خیالی ہستیوں کو سورج اور چاند میں بسا دیا ہے۔

پہلے شُعرا

ہر پشت گذرنے کے ساتھ لوگ جادو پُر اسرار باتوں، اور عجائبات کو ختم کرتے جاتے تھے۔ اب کاریگر کو اپنے ہاتھوں اور اپنی آنکھوں پر زیادہ بھروسہ ہو چلا تھا۔ اب وہ جادو ٹونے اور پُر اسرار دعاؤں اور تعویذوں پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا کرکے جادو انسان کی زندگی سے ہٹ رہا تھا جیسے پو پھٹتے وقت، سورج کی روشنی سے وادی کا اندھیرا رفتہ رفتہ ختم ہونے لگتا ہے! مذہبی رسوم اور متبرک ناچوں گانوں وغیرہ میں یہ سب سے زیادہ چپکا ہوا تھا لیکن بڑھتی ہوئی اور جاگتی ہوئی عقل نے اسے وہاں سے بھی بڑی بے رحمی کے ساتھ بھگا یا۔ اب رقص اور گانوں سے طلسم نکل گیا، صرف ناچ اور گانے باقی رہ گئے۔

جب قدیم یونان کے کسان، ڈایونی سس کے اعزاز میں جسے وہ ثمر لانے اور بخشنے والا دیوتا سمجھتے تھے، کھیل کھیلتے تھے، جشن کرتے تھے تو شروع میں یہ جشن بالکل پُر اسرار اور طلسماتی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ کورس جو گایا جاتا تھا اس میں ڈایونی سس کی موت کا بیان ہوتا تھا اور یہ کہ کس طرح وہ جاڑوں کی برفباری گزرنے کے بعد، پھر سے زندہ ہو کر آتا تھا قدرت کی مدد کو پہنچتا تھا، انسان کو ناج، پھل اور شراب بخشتا تھا۔ تمام گاؤں کے کسان طرح طرح کے جانوروں کے بھیس بدل بدل کر گاؤں

کے مندر اور عبادت خانے کے اطراف ناچتے تھے رگانے والوں کا سردار ڈایونی سسس کی تکالیف کے متعلق گیت اٹھاتا تھا اور سب لوگ اُس کا کورس گاتے تھے۔

یہ قدیم طلسماتی ناچ ایک ناٹک کی طرح ہوتا تھا اور مستقبل کے ایکٹروں کی جھلک ان بھیس بدلے ہوئے لوگوں اور گانے والوں کے سردار میں دکھائی دیتی تھی۔ یہ سردار یا گانے والوں کا ہدایت کار ڈایونی سسس کی تکلیف کے متعلق نہ صرف گاتا تھا بلکہ اُس کو ایکٹ کرکے بھی دکھاتا تھا۔ وہ اپنی چھاتی پیٹتا تھا، گریہ و بکا کرتا تھا اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتا تھا۔

اور جب وہ خُدا پھر سے زندہ ہوتا تو یہ نقاب پوش جو مختلف جانوروں کی صورتوں کی سی نقاب پہنے ہوتے خوشی سے پاگل ہو جاتے، ایک دوسرے کی نقلیں اتارتے اور آپس میں خوب ہنسی مذاق اور چُہل ہوتا۔

چند صدیوں کے عرصہ میں اس کھیل کا طلسماتی رنگ ختم ہوگیا اور صرف کھیل باقی رہ گیا۔ پہلے کی طرح اب بھی لوگ کھیلتے ہیں، گاتے ہیں اور ناچتے ہیں لیکن اب خداؤں کی نہیں بلکہ عام لوگوں کی تکلیفوں کا ذکر کرتے ہیں تماشائی جو دیکھتے رہتے ہیں، اب بھی ہنستے ہیں اور روتے ہیں بہادرانہ ایکٹنگ پر اُن میں سنسنی پیدا ہوتی ہے، اس کی داد دیتے ہیں، شرارت اور حماقت پر ہنستے ہیں۔ قدیم زمانہ کے کورس کا ہدایت کار اب ڈرامہ کا ہیرو ایکٹر ہوتا ہے اور رنگیلے نقاب پوشوں کے بجائے اب مسخرے اور بھانڈ ہوتے ہیں لیکن یہ ہدایت کار صرف پہلا ایکٹر ہی نہیں وہ پہلا شاعر بھی ہے۔ پہلے وہ صرف کورس کے ساتھ مل کر گاتا تھا لیکن بعد میں اُس نے تنہا بھی گانا شروع کر دیا۔

اب گیت رسوم سے الگ ہو گئے۔ تنہا گانے والا اب تک متبرک کھیلوں اور رسموں میں تو گاتا ہی تھا اب اُس نے بڑی بڑی دعوتوں میں بھی گانا شروع کیا جہاں امیر لوگ اپنے دوستوں کے ہمراہ ضیافت اڑایا کرتے تھے۔ گاتے وقت وہ اکثر اپنے

رباب کے تاروں کو بھی چھیڑا کرتا ہے، حرکت، الفاظ اور موسیقی کا وہی ارتباط جو پرانی رسم تھی۔ یہاں وہ ہدایت کار بھی ہے اور کورس گانے والا بھی پہلا سُر بھی وہی اٹھاتا ہے اور آخری بھی۔ وہ کن چیزوں کے متعلق گاتا ہے؟ وہ گاتا ہے خداؤں اور بہادروں سے متعلق، قبیلوں کے اُن سرداروں کے متعلق جنہوں نے بڑے بڑے بہادروں کے دانت کھٹے کرکے انہیں میدان سے مار بھگایا، ان جنگجویوں کے متعلق جنہوں نے لڑائی کے میدان میں اپنی جانیں دے دیں، اس بھائی کے متعلق جس نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لیا۔ یہ گانا کوئی طلسماتی یا پُر اسرار رسم نہ تھی، یہ بہادری کی ایک داستان تھی جو لوگوں میں ایسی ہی بہادری دکھانے کی تحریک پیدا کرتی تھی۔

لیکن عشق کے گیت؟ بہار کے گیت؟ رنج وغم کے گیت؟ یہ کہاں سے آئے؟ یہ بھی رسوم سے نکلے، شادیوں سے نکلے، جنازوں سے نکلے، فصل کٹنے یا انگور سے شراب بنائے جانے کی رسم سے نکلے! ان رسوم اور تقریبوں کے موقعوں پر کورس گانے والے لوگ چھوٹے چھوٹے گیت گایا کرتے تھے اور پھر کوئی لڑکی جب چرخہ کاتنے بیٹھتی یا ماں اپنے لال کا ہنگورا ہلاتی تو ان کے لبوں سے یہ گیت پھوٹا ہوتے

اچھا تو بہادروں کے متعلق پہلا گیت کس نے کہا، عشق کا پہلا گانا کس نے گایا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم یہ نہیں جانتے کہ پہلا چرخا اور پہلی تلوار کس نے بنائی؟ کسی ایک آدمی نے نہیں بلکہ نسلِ انسانی کی پشتہا پشت نے اوزار ایجاد کیے، الفاظ ایجاد کیے، گانے ایجاد کیے! گویئے عموماً اپنے بنائے ہوئے گیت نہیں گاتے تھے بلکہ سُنے سُنائے گانے تھے۔ لیکن گانا جب ایک سے دوسرے گویئے کو منتقل ہوتا تھا تو ترقی کرتا تھا اور بدلتا تھا۔ جیسے کوئی بڑا سا دریا وہ تمام چشمے ملا کر بنتا ہے جو راستہ میں آ آ کر اس سے ملتے جاتے ہیں، اسی طرح گیتوں میں سے نظم پیدا ہوئی۔

ہم کہتے ہیں کہ ہومر نے ''دا ایلیڈ'' لکھی تھی مگر ہومر کون تھا؟
ہم نے تو اس کے صرف قصے ہی سُنے ہیں۔ اپنی مثنوی کے ہیرو کی طرح خود
ہومر کا نام بھی ایک داستان ہے، ایک روایت ہے۔

جب بہادروں کے متعلق پہلے گیت لکھے گئے تو گانے والا ہنوز اپنے کنبہ برادری اور اپنے قبیلے کے ساتھ پا بہ زنجیر تھا۔ لوگ سب کام مل جل کر کرتے تھے، اور ان کے گیت بھی پشتہا پشت سے مجموعی طور پر بنائے جاتے تھے۔ کوئی گویا اور کوئی شاعر اپنے آپ کو مصنف اور موجد نہیں سمجھتا تھا چاہے وہ اپنے آبائی گیتوں کو ذاتی طور پر کتنا ہی بدل کیوں نہ دے لیکن وہ وقت بھی آیا جب انسان ''تیرے'' ''میرے'' کی تفریق کرنے لگا، قبیلہ ٹوٹ رہا تھا، اب وہ پہلا سا ایکا باقی نہیں رہ گیا تھا، ہر کاریگر اپنے لئے کام کرتا تھا اب وہ اپنے آپ کو قبیلے کا آلۂ کار نہیں سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ چند سو سال بعد یونان کے غزل گو شاعر تھیوگنس نے کہا۔

''اِن اشعار پر میں نے اپنی مُہر لگادی ہے۔
یہ میری فنکاری کا نتیجہ ہیں۔
اِن کو کوئی شخص سرقہ کر کے اپنا نہیں بنا سکتا
ہر شخص یہی کہے گا یہ اشعار میگارا والے تھیوگنس کے ہیں''

قبیلے کے نظام میں کوئی شخص ایسی بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

اِنسان اب لفظ ''میں'' کا زیادہ تر استعمال کرنا جا رہا تھا۔ وہ دن گذر چکے تھے جب انسان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ اپنا کام خود نہیں کرتا بلکہ کوئی پُر اسرار طاقت اُس سے کرواتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اب بھی شاعر خدا کا ذکر ضرور کرتا ہے جس نے اُسے شعر کہنے

کی توفیق دی لیکن اب وہ خود کو قطعی علیحدہ نہیں رکھتا۔ جیسے

"غواص طبیعت کو عطا کر وہ عالی
ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی"

یونان کی شاعرہ صافو ایک شعر میں کہتی ہے

"خدا کی توفیق سے میں نے یہ شعر کہے ہیں۔
اب میں نے ابدی مقام حاصل کر لیا ہے
مجھے کوئی مٹا نہیں سکتا"

اس شعر میں شاعرہ پرانے اور نئے زمانے کو ایک جا کر دیتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا خدا کی دی ہوئی توفیق کے بدولت کہا۔ یہ نہیں کہ اس نے خود ان الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کیا لیکن ان اشعار میں موجد کی خودداری اور فخر بھی پایا جاتا ہے، اس شاعر کا فخر جو جانتا ہے کہ اس کا نام لوگ بھلا نہ سکیں گے

تو اس طرح انسان بڑھ رہا ہے۔ بڑھتا جا رہا ہے اور جتنا ہی اس کا قد بلند و بالا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے چاروں طرف افق بڑھتی جا رہی ہے۔

Library Sri Pratap College,
Srinagar.

کلیم اللہ پرنٹر پبلشر نے کو اپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں طبع کر کے قومی دار الاشاعت
راج بھون، سینڈھرسٹ روڈ، بمبئی ۴ سے شائع کیا۔

صبح سمرقند

یہ کتاب انگریزی کی مشہور تصنیف DAWN OVER SAMARKAND کا ترجمہ ہے جسے اُردو کے مشہور ادیب احتشام حسین صاحب نے کیا ہے۔ کتاب کو موجودہ زمانہ تک مکمل کرنے کے لئے انہوں نے آخر میں ایک باب کا خود بھی اضافہ کیا ہے۔

اس میں وسطی سویت ایشیا کی جمہوریتوں کی زندگی بہت ہی دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ ایک بار کتاب شروع کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کے سارے گوشے خود بہ خود روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سویت زندگی کے سلسلہ میں آپ کے ذہن میں جتنے سوالات، جتنے شبہات بھی گذرے ہیں مصنف نے گویا خود ہی انہیں سمجھ لیا ہے اور ان کا جواب نہیں دیا ہے بلکہ زندگی کی ایسی جھلکیاں پیش کر دی ہیں کہ سوال اور جواب کی بحث سے گذر کر آپ اس نئی تہذیب کی عظمت اور اُس کے حُسن کو سمجھنے میں گم ہو جاتے ہیں۔

(زیر طبع)

چٹ گاؤں کے انقلابی

- از - کلپنا دت

اپریل سن ۳۰ء میں جب شہر چٹ گاؤں کے اسلحہ گھر پر ہندوستان کے انقلابی نوجوانوں نے حملہ کیا اور حکومت کے تمام اہم وسائل پر قبضہ کر لیا تو گویا آئینی جنگ کی بھول بھلیاں میں کھویا ہوا ہندوستان چونک اُٹھا۔ انگریز آقاؤں کی تو خیر یہ حالت تھی کہ وہ ان انقلابیوں کے نام ہی سے، چاہے وہ کسی نوجوان دہشت پسند لڑکی کا ذکر ہو یا کسی نوعمر نوجوان کا، کانپ اُٹھتے تھے۔

اور پھر یہ داستانیں، ان شہیدوں اور بہادروں کے کارنامے، ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے۔ ہر شخص ان سپاہیوں کا معترف تھا اور ان کی قربانیوں کا قدردان۔ آج جبکہ ان میں سے بہت سے پھانسی کے تختوں پر لٹکائے جا چکے ہیں، گولیوں سے شہید ہو چکے ہیں یا بیس بیس سال کی قید کاٹ کر پھر وہی آزادی کا سودا سر میں لئے انگریز کے خلاف میدان جنگ میں اتر آئے ہیں، آج ہمیں ان کی داستان کو از سر نو سننے کی ضرورت ہے، خاص طور سے اس کتاب کی داستان کیونکہ وہ انہیں کی ایک فرد کلپنا دت صاحبہ نے سنائی ہے۔

اپنی قوم پر فخر اور ہندوستان پر بھروسہ کی یہ ایک شاندار محضر ہے جسے ہر ہندوستانی گھر میں پہنچ جانا چاہئے

قیمت عہ

ملنے کا پتہ

قومی دار الاشاعت، وائی ایم سی اے بلڈنگ، مال، لاہور

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. ______________ Book No. ______________

Acc. No. ______________

This book may be kept for **14 days**. An over - due charge will be levied at the rate of **10 Paise** for each day the book is kept over - time.

৪৯১·৭৪৪ R27N

"This book was taken from the Library on the date last stamped. A fine of ½ anna will be charged for each day the book is kept over due."

12916

ADG 8 46

SRI PRATAP COLLEGE LIBRARY
SRINAGAR (Kashmir)

DATE LOANED

Class No. ________ Book No. ________

Acc. No. ________

This book may be kept for **14 days.** An over - due charge will be levied at the rate of **10 Paise** for each day the book is kept over - time.

891.488 DATE LOANED R 272n

A fine of **one anna** will be charged for each day the book is kept overtime.

124116

100c69
190c69
80c68
14J170
2.68
5 S970

891.488 R27Om

Razia! Ism Ka Arooj.

12916

3DNo53 1107
14Je52 6043
28e54 6045
ADe54 7048
10Oc59 3125
19Oc59 5328
8Oc68 7121
14Jl79 525/II…

5 Se70

SRI PRATAP COLLEGE LIBRA
SRINAGAR.

Members of College Teaching Staff can borrow ten book at a time and can retain these for one month

Any intermediate student of the college can borrow one book at a time, any Degree or Honours or Post Graduate student of the college, two book at a time, and these can retain books for 14 days.

Books in any way injured or lost shall be paid for or replaced by the borrower.